یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

یه کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم هیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے هیں.

منجانب .

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پا کستان

زیرِ نظر

اُستادِ محقّق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمُونہ جلد ۶

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رح

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلّہ

فہرست مضامین

کرے۔ اللہ کبھی بھی ستم کرنے والوں کو ہدایت نہیں کرے گا۔

تفسیر

یہ آیت جیسا کہ پہلے بھی اشارتاً ذکر ہوا زراعت اور چوپایوں کے بارے میں ہے مشرکوں کے خرافاتی احکام کی نفی کے لیے ہے۔ اس سے قبل کی آیت میں طرح طرح کی زراعت اور خدا داد میووں کی بابت گفتگو کی گئی تھی، اور اب اس آیت میں حلال گوشت حیوانات اور ان کی خدمات کا تذکرہ ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اللہ وہ ہستی ہے جس نے چوپایوں میں سے تمہارے لیے بڑے حیوانات اور بوجھ اٹھانے والے اور چھوٹے حیوانات پیدا کیے (ومن الانعام حمولة وفرشاً[1])۔

جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے۔ حمولة۔ جمع کے لیے ہے۔ اس لفظ کا مفرد اس کی جنس سے نہیں ہے۔ یہ لفظ بوجھ اٹھانے والے بڑے حیوانات جیسے اونٹ، گھوڑا وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۔ فرش۔ کے وہی معنی ہیں جو معروف و مشہور ہیں لیکن اس مقام پر بھیڑ اور اسی طرح کے چھوٹے جانوروں سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور بظاہر اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس طرح کے جانور زمین سے زیادہ نزدیک ہیں اور بڑے جانوروں کے مقابلے میں فرش کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ کسی جنگل میں بھیڑ بکریاں چر رہی ہوں اگر ہم دُور سے دیکھیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر فرش بچھا ہوا ہو، جبکہ اونٹوں کا گلہ دُور سے کبھی ایسا نہیں معلوم ہوتا۔

۔ حمولة ۔ کے مقابلہ میں ۔ فرش ۔ کا ذکر کرنا اس مطلب کا مؤید ہے۔

نیز ایک اور احتمال بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اس کلمہ (فرش) سے مراد بچھانے کی ایسی چیزیں ہیں جو جانوروں کی اُون وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں، یعنی بہت سے حیوانات سے بار برداری کا بھی کام لیا جاتا ہے اور ان کے بالوں سے فرشی چیزیں بھی تیار کی جاتی ہیں لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی سے زیادہ نزدیک ہے۔

بعد ازاں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے — اب جبکہ یہ سب چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور ان کا حکم اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے تو وہ تم کو یہ فرمان دیتا ہے کہ جو روزی اس نے تم کو دی ہے اس میں سے کھاؤ (کلوا مما رزقکم الله)۔

وہ یہ نہیں فرماتا کہ ان حیوانات ہی میں سے کھاؤ، بلکہ فرماتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔ یہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ حلال گوشت صرف چوپایوں ہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ دوسرے حیوانات بھی حلال گوشت ہیں جن کا آیہ مذکورہ بالا میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

اس امر کی مزید تاکید کے لیے اور مشرکوں کے خرافاتی احکام کی ردّ کے لیے ارشاد ہوتا ہے: شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (ایسا دشمن جس نے آدمی کی خلقت اوّل ہی کے وقت سے اعلان جنگ کر دیا ہے (ولا تتبعوا خطوات الشیطان انه لکم عدو مبین)۔

---

[1] اس آیت کے شروع میں ۔ واؤ۔ عطف کے لیے ہے۔ اس کے بعد کا لفظ ۔ جنات ۔ گزشتہ آیت میں جس کا ذکر ہے پر عطف کیا گیا ہے۔

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے بلا دلیل احکام و رسوم جو صرف خام خیالی، ہوا و ہوس اور جہل و نادانی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی حیثیت شیطانی وسوسوں کے سوا کچھ نہیں ہے جو تم کو قدم بقدم حق سے دُور کر کے گمراہی کے راستے میں سرگرداں کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں بھی اس امر کی ایک دلچسپ توضیح کی گئی ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں توضیح کے طور پر بعض حلال گوشت حیوانات اور بعض وہ حیوانات کہ جو باربردار بھی ہیں اور انسان کے لیے غذا کے طور پر بھی قابل استفادہ ہیں کی شرح کرتے ہوئے فرماتا ہے: خداوند کریم نے چوپایوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لیے پیدا کیے۔ بھیڑ اور مینڈھے کا ایک جوڑا (نر اور مادہ) اور بکری کا ایک جوڑا (نر اور مادہ) (ثمانية ازواج[1] من الضأن اثنين ومن المعز اثنين)۔

ان چار جوڑوں کے تذکرے کے بعد بلا فاصلہ پیغمبر اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کافروں سے صاف صاف پوچھو کہ: آیا خدا نے ان کے نروں کو حرام کیا ہے یا ماداؤں کو (قل ءالذكرين حرم ام الانثيين)۔

یا وہ حیوان جو بھیڑوں یا بکریوں کے پیٹ میں ہیں (اما اشتملت عليه ارحام الانثيين)۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اگر تم سچ کہتے ہو، اور ان حیوانات کی تحریم پر ازروئے علم و دانش کوئی دلیل رکھتے ہو تو مجھے بتلادو (نبئونی بعلم ان كنتم صادقين)۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک اور جوڑے کا ذکر فرماتا ہے: اُونٹ کا جوڑا (نر اور مادہ) اور گائے کا بھی جوڑا (نر اور مادہ) ہم نے پیدا کیے ہیں، بتاؤ اس میں سے کسے حرام قرار دیا ہے، نروں کو یا ماداؤں کو، یا ان حیوانوں کو جو اونٹوں اور گایوں کے شکم میں ہیں؟ (ومن الابل اثنين ومن البقر اثنين قل ءالذكرين حرم ام الانثيين اما اشتملت عليه ارحام الانثيين)۔

چونکہ ان حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کا حکم صرف اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو ان کا اور انسانوں کا بلکہ تمام نظام ہستی کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا جو شخص بھی ان کے حلال یا حرام ہونے کا دعوٰی کرے تو یہ عقلی گواہی کے ذریعے ہو یا شخصاً اس پر وحی نازل ہوئی ہو یا جس وقت یہ فرمان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا اس وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود ہو۔

اس سے قبل کی آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ مشرکین کے پاس ان حیوانات کے حرام ہونے

---

[1] - ازواج - زوج کی جمع ہے اور لغت میں جوڑے کے معنی میں ہے لیکن یہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ کبھی دو حیوانوں کے مجموعے نر اور مادہ کیلئے بولا جاتا ہے اور کبھی دو زوجوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے (زوج کا لفظ حیوانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: فيهما من كل فاكهة زوجان سورہ رحمٰن۔ مترجم) لہٰذا ان کے مجموعے کو زوجین کہتے ہیں، لہٰذا یہ کہ آیہ مذکورہ بالا میں جن آٹھ جوڑوں کی طرف اشارہ ہوا ہے ان سے چار قسم کے نر حیوان اور چار قسم کے مادہ حیوان مراد ہیں۔ اس آیت میں یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ شاید اس سے مراد گھریلو اور وحشی حیوانوں کے جوڑے ہوں، یعنی نر اور مادہ گھریلو بھیڑیں اور جنگلی بھیڑیں اسی طرح سے باقی کے بارے میں قیاس کرنا چاہیئے۔

کی کوئی علمی یا عقلی دلیل نہیں ہے اور چونکہ وہ دعوائے نبوت و وحی بھی نہیں کرتے تھے بنابریں صرف یہ احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ جب پیغمبرؐ نے یہ فرمان دیا تھا اس وقت حاضر و گواہ ہوں اس لیے ارشاد ہوتا ہے: آیا جب اللہ نے اس بات کا حکم دیا تھا اس وقت کے تم گواہ ہو (ام کنتم شہداء اذ وصاکم اللہ بھذا)۔

چونکہ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پاس سوائے تہمت اور افتراء کے کوئی سرمایہ نہ تھا۔

اس لیے آیت کے آخر میں اضافہ فرماتا ہے: اس شخص سے بڑھ کر کون ستمگار ہے جو خدا کی طرف جھوٹی بات کی نسبت دے تاکہ لوگوں کو از روئے جہل گمراہ کرے اور یہ بات مسلّم ہے کہ خدا ستم گاروں کو ہدایت نہیں کرے گا (فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا لیضل الناس بغیر علم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین)[1]۔

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنا بزرگ ترین ظلموں میں سے ایک ہے، مقام مقدس الٰہی پر ظلم، بندگان خدا پر ظلم، اپنی ذات پر ظلم، جیسا کہ ہم نے سابقاً بیان کیا کہ "ظالم ترین" کا جملہ نسبی پہلو کا حامل ہے، بنابریں کوئی حرج نہیں اگر بالکل یہی تعبیر بعض گناہان کبیرہ کے لیے بھی استعمال کی گئی ہو۔

نیز اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ ہدایت و گمراہ کرنا ایک اجباری چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب و مقدمات کو خود انسان اختیار کرتا ہے، جس وقت کوئی ظلم کرنا شروع کرتا ہے خدا اس سے اپنی حمایت و ہدایت روک دیتا ہے نتیجہ میں وہ غلط راستہ پر بھٹکتا رہتا ہے۔

(۱۴۵) قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

ترجمہ

(۱۴۵) کہیے: مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی غذا کھانے والے کے لیے کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ چیز مُردار ہو یا خُون ہو جو (حیوان یا انسان کے بدن سے) باہر نکلے، یا سُور

---

[1] "بغیر علم" یا اصطلاحاً یوں کہا جائے کہ "جار و مجرور" کس چیز سے متعلق ہے؟ اس بارے میں متعدد احتمال پیش کیے گئے ہیں لیکن یہ بعید نہیں کہ "یضل" سے متعلق ہو یعنی وہ لوگ اپنی نادانی اور جہل کی وجہ سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔

کا گوشت ہو کہ یہ سب چیزیں گندی ہیں، یا وہ حیوان جن پر بطور گناہ سر جدا کرتے وقت غیر خدا (بتوں) کا نام لیا گیا ہو، لیکن وہ لوگ جن کا مقصود لذت نہ ہو اور نہ وہ حد سے تجاوز چاہتے ہوں مجبور ہو کر کچھ کھا لیں تو (اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے) تیرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

بعض حرام جانوروں کا ذکر

بعد ازیں خداوند کریم، محرماتِ الٰہی کو ان بدعتوں سے الگ کرنے کے لیے جنہیں مشرکوں نے حقیقی قانون میں داخل کر دیا تھا اس آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں سے صاف طور سے کہہ دیجئے، مجھ پر جو وحی ہوئی ہے اس میں کسی شخص (وہ عورت ہو یا مرد، چھوٹا ہو یا بڑا) کے لیے مجھے تو کوئی غذا حرام قرار دی ہوئی نہیں ملی (قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه)۔

سوائے چند چیزوں کے، پہلی یہ کہ وہ مُردار ہو (الا ان یکون میتة) یا وہ خون ہو جو کسی جاندار کے بدن سے نکلے (او دما مسفوحا) اس سے وہ خون خارج ہے جو حیوان کی رگوں کو کاٹنے کے بعد، اور خون کی بڑی تعداد بہہ جانے کے بعد گوشت کے اندر کی باریک رگوں میں رہ جاتا ہے۔

"یا سُور کا گوشت" (او لحم خنزیر)۔

کیونکہ "یہ سب نجاست اور گندگی ہے: اور انسان کی صحیح سالم طبیعت کو ناپسند ہے۔ طرح طرح کی آلائشوں کا سرچشمہ ہے اور مختلف طرح کے نقصانات کا سبب ہے (فانه رجس)۔

"انه" کی ضمیر اگرچہ مفرد ہے لیکن بہت سے مفسرین کے خیال کے مطابق یہ تینوں قسم کی نجاستوں (مُردار کا گوشت، خون، سُور کا گوشت) کی طرف پلٹتی ہے، اور اس جملہ کے معنی اس طرح ہیں "یہ سب جو بیان کیا گیا گندگی ہے"[1] اور آیت کے ظاہر سے جو معنی مناسبت رکھتے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ ضمیر تینوں کی طرف پلٹے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مُردار اور خون بھی سُور کے گوشت کی طرح پلید ہیں۔

اس کے بعد نجاست کی چوتھی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "یا وہ حیوان جن پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام لیا گیا ہو" (او فسقا اهل لغیر الله به)[2]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بجائے لفظ "حیوان" کے لفظ "فسق" استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سابقاً بھی اشارہ ہوا ہے

---

[1] درحقیقت کلمہ "انه" بہ معنی "انما ذکر" ہے۔

[2] "اہل" کی اصل "اہلال" ہے اور یہ ہلال سے لیا گیا ہے جس کے معنی رویت ہلال کے وقت صدا بلند کرنے کے ہیں اس کے بعد ہر صدائے بلند کو "ہلال" کہا جانے لگا، نیز نومولود کے رونے کی سب سے پہلی آواز کو بھی ہلال کہتے ہیں۔ کفار جانور کو ذبح کرتے وقت چونکہ بہ آواز بلند بتوں کے نام لیتے تھے اس لیے اسے بھی "اہل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کہ "فسق" کے معنی ہیں "راہ و رسم بندگی اور طاعت فرمان الٰہی سے خارج ہو جانا" لہٰذا ہر قسم کے گناہ کو فسق کہتے ہیں لیکن "رجس" جس کا تذکرہ تین قسم کے حراموں کے سلسلہ میں ہوا، اس کے مقابلہ میں "فسق" کا ذکر ممکن ہے اس امر کا طرف اشارہ ہو کہ حرام گوشت اصولی حیثیت سے دو قسم کے ہیں: ایک تو اس قسم کے گوشت جن کی تحریم ان کی پلیدگی، تنفرِ طبع و جسمانی نقصانات کی وجہ سے عمل میں آئی ہے اور ان پر "رجس" کا اطلاق ہوا ہے، دوسرے وہ گوشت جو نہ تو پلید ہیں، نہ حفظانِ صحت کی رُو سے زیاں بخش، لیکن اخلاقی و معنوی حیثیت سے خدا سے بیگانگی اور مکتبِ توحید سے دُوری کا باعث ہیں اور اسی وجہ سے حرام قرار پائے ہیں۔

بنا بریں یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ تمام حرام گوشت ہمیشہ زیاں بخش ہی ہوں گے بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معنوی یا اخلاقی قدر کی وجہ سے بھی چیز حرام ہوتی ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح اسلامی کے شرائط دو طرح کے ہیں۔ بعض میں مثلاً کہا گیا ہے کہ چاروں رگیں کاٹی جائیں اور حیوان کا خون بہالیا جائے۔ ایسے احکام میں حفظانِ صحت کا پہلو مضمر ہے اور بعض احکام مثلاً قبلہ رُو کرنا، بسم اللہ کہنا اور ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا یہ سب معنوی حیثیت کے حامل ہیں۔

آخر آیت میں بھی اُن لوگوں کے لیے حرمت سے استثناء ہوا ہے جو ناچار و مجبور ہو جائیں اور کوئی ایسی غذا ان کو نہ مل سکے جس سے اُن کی جان بچے تو ایسی صورت میں وہ ان گوشتوں کو (بقدرِ ضرورت) اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو بالکل مجبور ہو جائیں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ صرف حفظِ جان کے لیے ہو، لذت کے لیے نہ ہو، اسے حلال سمجھتے ہوئے نہ ہو اور نہ ضرورت سے زائد کھائیں۔ ان حالات میں خدائے غفور و رحیم ایسے افراد کو معاف کر دے گا (فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربك غفور رحیم)[1]۔

درحقیقت یہ دو شرطیں (حالتِ اضطرار کا ہونا اور حد سے تجاوز نہ کرنا) اس لیے ہیں کہ بعض افراد اضطرار کو قوانین الٰہی کے توڑنے کی سند نہ سمجھ بیٹھیں اور ضرورت کو بہانہ بنا کر حکم خدا کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن اہل بیت طاہرین علیہم السلام سے بہ قول بعض روایات میں کچھ اور مفاہیم بھی ہیں جیسے تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

الباغی الظالم والعادی الغاصب۔

باغی سے مراد ظالم اور عادی سے مراد غاصب ہے۔

نیز ایک دوسری روایت میں امام علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الباغی الخارج علی الامام والعادی اللص۔

باغی سے وہ شخص مراد ہے جو امام عادل اور حکومت اسلامی کے خلاف خروج کرے اور عادی سے مراد چور ہے۔

اس طرح کی روایات سے اس امر کی طرف اشارہ منظور ہے کہ گوشت حرام کھانے کی مجبوری بالعموم سفر میں درپیش ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ظلم و ستم یا غصب و چوری کے مقصد سے سفر کرے اور حلال غذا کمیاب ہو جائے

[1] "باغ" یا "باغی" کا مادہ "بغی" ہے۔ اس کا معنی "طلب" ہے اور "عاد" یا "عادی" کا مادہ "عدو" ہے اس کا معنی "تجاوز" ہے۔

تو ایسی صورتوں میں حرام گوشتوں کا کھانا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا، اگرچہ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ان گوشتوں کو کام میں لائے لیکن اس گناہ کی سزا بھی اسے بھگتنا پڑے گی کیونکہ اس حرام سفر کے مقدمات کو اُس نے خود فراہم کیا ہے بہرحال یہ روایات مذکورہ آیت کے عمومی مفہوم سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں پر ایک سوال یہ درپیش ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ غذاؤں کے بارے میں تمام محرمات الٰہی چار اقسام میں منحصر ہو گئے ہیں جبکہ ہمیں علم ہے کہ حرام غذائیں انہی چار چیزوں میں منحصر نہیں ہیں۔ درندوں کا گوشت، دریائی حیوانات (چھلکے دار مچھلی کے علاوہ) کا گوشت اور اسی طرح کے دوسرے حرام جانوروں کا گوشت، یہ سب حرام ہیں لیکن آیہ مذکورہ میں ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا گیا اور محرمات کو صرف چار چیزوں میں منحصر کر دیا گیا ہے؟

بعض حضرات نے اس سوال کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ آیت مکہ میں اتری اور اس وقت تک دوسری چیزیں حرام نہیں ہوئی تھیں۔

یہ جواب صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بعینہٖ یہی عبارت یا اس جیسی عبارتیں بعض مدنی سورتوں میں بھی ملتی ہیں جیسے بقرہ کی آیت ۱۷۳۔ بظاہر اس کا جواب اس طرح سے دیا جا سکتا ہے کہ اس آیت کی نظر صرف مشرکوں کے خرافاتی احکام پر ہے اور اصطلاحاً یوں کہنا چاہیئے کہ یہاں پر "حصر اضافی" ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ۔ محرمات الٰہی یہ چیزیں ہیں نہ کہ وہ جنہیں تم نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔

اس بات کی مزید توضیح کے لیے بے جا نہ ہوگا اگر ہم ایک مثال پیش کریں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ آیا حسن اور حسین دونوں آئے تھے؟ ہم جواب میں یہ کہیں گے: نہیں، صرف حسن آئے تھے، یہاں پر ہماری غرض صرف یہ ہے کہ دوسرے شخص (حسین) کے آنے کی نفی ہو جائے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ دوسرے افراد جو سوال کے دائرے سے خارج تھے وہ آئے کہ نہیں۔ وہ چاہے آئے بھی ہوں تب بھی ہمارا مذکورہ جواب صحیح ہوگا۔ اس طرح کے حصر کو حصر اضافی (یا نسبی) کہتے ہیں۔

لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ہر حصر عام طور سے حقیقی ہی ہوتا ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود ہو جیسے زیر بحث آیت۔

(۱۴۶) وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

(۱۴۷) فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۴۶) اور ہم نے یہودیوں پر ہر ناخن دار (حیوان جس کے کھر بغیر شگاف کے ہوتے ہیں) کو حرام کیا، اور گائے بھیڑ میں سے ان کی چکنی اور چربی کو حرام کیا، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھ پر، یا آنتوں کے تہوں میں اور دونوں پہلوؤں میں ہو یا وہ چربی جو ہڈیوں میں ملی ہوئی ہو، یہ حکم بطور سزا کے اس ظلم وستم کی وجہ سے تھا جو وہ کیا کرتے تھے اور ہم سچ کہتے ہیں۔

(۱۴۷) اگر یہ تیری تکذیب کریں (اور ان حقائق کو نہ مانیں)، تو ان سے کہہ دو کہ تمہارا پروردگار بڑی رحمت والا ہے لیکن اس کے باوجود مجرموں سے اس کی سزا دُور ہونے والی نہیں (پلٹنے کا راستہ تمہارے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ تمہیں فوراً سزا نہیں دیتا لیکن اگر اسی طرح سے اس کے احکام کی خلاف ورزیاں کرتے رہے تو تمہاری سزا حتمی ہے)۔

تفسیر

وہ چیزیں جو یہودیوں پر حرام ہوئیں

قبل کی آیات میں حرام حیوانات کی چار قسمیں ہی بیان کی گئی تھیں لیکن ان آیتوں میں یہودیوں پر جو چیزیں حرام تھیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ بُت پرستوں کے مہمل وخرافاتی احکام نہ تو آئین اسلام سے ہم آہنگ ہیں، نہ آئین یہود سے (اور نہ ہی آئین مسیح سے جس میں عموماً آئین یہود کی پیروی کی گئی ہے)۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس قسم کے محرمات بھی یہودیوں کے لیے سزا و عذاب کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ اگر انہوں نے احکام الٰہی کی خلاف ورزیاں نہ کی ہوتیں تو یہ چیزیں بھی ان پر حرام نہ کی جاتیں۔ بنا بریں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ بُت پرستوں سے سوال کیا جائے کہ اس طرح کے احکام

تم کہاں سے لے آئے ؟

لہٰذا پہلے ارشاد ہوتا ہے : یہودیوں پر ہم نے ناخن دار ہر جانور کو حرام کیا ۔ (وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر) ۔

"ظفر" (بروزن شتر) دراصل ناخن کے معنی میں ہے لیکن اس لفظ کا استعمال سُمدار حیوانات (یعنی وہ حیوانات جن کا سُم گھوڑے کی طرح پھٹا ہوا نہیں ہے ، نہ کہ بھیڑ گائے وغیرہ کی طرح جن کا کُھر بیچ سے پھٹا ہوا ہوتا ہے) کے سُم پر بھی ہوا ہے کیونکہ ان کے سُم ناخن کی طرح کے ہوتے ہیں ، اسی طرح اونٹ کا پاؤں جس کی نوک یکپارچہ ہوتی ہے اور اس میں شگاف نہیں ہوتا اس کے لیے بھی یہ لفظ "ظفر" بولا جاتا ہے ۔

اس بنا پر آیہ فوق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حیوانات جن کے سُم بیچ سے شگافتہ نہیں ہیں یا وہ ناخن والے ہیں چاہے وہ چوپائے ہوں یا پرندے ، یہودیوں پر حرام کر دیے گئے تھے ۔

موجودہ توریت کے "سفر لاویان" فصل ۱۱ سے بھی اجمالاً یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے جیسا کہ اس میں تحریر ہے ۔

"بہائم میں سے شگافتہ کُھر رکھنے والا جس میں پورا شگاف ہو اور جگالی کرتا ہو کھاؤ ، لیکن وہ جگالی کرنے والا جس کا کُھر پھٹا ہوا نہیں ہے ، مت کھاؤ ، اونٹ باوجودیکہ وہ جگالی کرتاہے چونکہ اس کا پورا کُھر چاک نہیں اس لیے وہ تمہارے لیے ناپاک ہے ":

آیہ مذکورہ میں بعد کے جملے سے (جس میں صرف گائے بھیڑ کا ذکر کیا گیا ہے) بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اونٹ یہودیوں پر بالکل حرام تھا ، (ذرا غور کیجئے) ۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے : گائے بھیڑ کے جسم پر موجود چربی کو ہم نے ان پر حرام کر دیا تھا ۔ (ومن البقر والغنم حرمنا علیھم شحومھما) ۔

اسی کے ذیل میں تین چیزوں کا استثناء فرماتا ہے : پہلے وہ چربی جو اُن کی پشت پر ہوتی ہے (الا ما حملت ظھورھما) ۔

دوسرے وہ چربی جو پہلوؤں میں اور آنتوں کی تہوں میں پائی جاتی ہے (او الحوایا)[1]

تیسرے وہ چربی جو ہڈیوں میں لتھڑی ہوتی ہے (او ما اختلط بعظم) ۔

لیکن آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ چیزیں یہودیوں پر درحقیقت حرام نہ تھیں لیکن چونکہ وہ ظلم وستم کرتے تھے اس لیے بحکم خدا وہ اس طرح کے گوشت اور چربی سے محروم کر دیے گئے جسے وہ پسند کرتے تھے (ذالک جزینا ھم ببغیھم) ۔

---

[1] "حوایا" جمع ہے "حاویہ" (بروزن زاویہ) کی ، یہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں شکم کی تمام چیزیں شامل ہیں یہ گرہ کی شکل کی ہوتی ہے اور آنتیں بھی اسی کے اندر ہوتی ہیں ۔

تاکید کے لیے اضافہ فرماتا ہے: یہ ایک حقیقت ہے اور ہم سچ کہتے ہیں (وانا لصادقون)۔

چند اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل نے وہ کیا ظلم وستم کیے تھے جس کی سزا میں اللہ نے اپنی بعض ایسی نعمتیں جو انہیں پسند تھیں ان پر حرام کر دی تھیں۔ مفسرین کے درمیان اس بارے میں ایک بحث ہے لیکن سورہ نساء کی آیت ۱۶۰ اور ۱۶۱ سے جو ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس تحریم کا باعث چند امور تھے۔
کمزور طبقہ پر ظلم وستم اور انہیں انبیائے الٰہی کی ہدایت سے روکنا، سود خوری اور لوگوں کے اموال کو ناحق کھانا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء۔ ۱۶۰)

۲۔ جملہ۔ وانا لصادقون۔ جو آیت کے آخر میں آیا ہے، ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ ان غذاؤں کی تحریم کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے وہی حقیقت ہے نہ وہ کہ جو یہودی کہتے ہیں اور اپنے ان کھانوں کو حضرت یعقوبؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس بات کا تذکرہ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۳ میں گزر چکا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے انہیں ان چیزوں کے حرام ہونے کا حکم ہرگز نہیں دیا تھا بلکہ یہ ایک تہمت ہے جو یہودی ان پر لگاتے ہیں۔[1]

چونکہ یہودیوں اور مشرکوں کی ہٹ دھرمی نمایاں تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور پیغمبرؐ کی تکذیب کریں گے لہٰذا بعد کی آیت میں اللہ تعالےٰ اپنے نبیؐ کو حکم دیتا ہے: اگر یہ تم کو جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت رکھتا ہے اور تم کو جلدی سزا نہیں دیتا بلکہ مہلت دیتا ہے کہ شاید تم اپنی غلطیوں سے پلٹ جاؤ اور اپنے کیے پر پشیمان ہو جاؤ اور خدا کی طرف پلٹ آؤ (فان کذبوك فقل ربکم ذو رحمة واسعة)۔
لیکن اگر خدا کی دی گئی مہلت سے پھر بھی ناجائز فائدہ اٹھاؤ اور اپنی ناروا تہمتوں پر باقی رہو تو جان لو کہ خدا تمہیں کیفر کردار تک ضرور پہنچائے گا کیونکہ اس کی سزائیں اور مجازات مجرموں کے گروہ سے دور ہونے والی نہیں (ولا یرد بأسه عن القوم المجرمین)۔
یہ آیت بخوبی تعلیمات قرآنی کی عظمت کو واضح کرتی ہے کہ یہودیوں اور مشرکوں کی اتنی نافرمانیوں کی وضاحت کرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ انہیں فوراً اپنے عذاب کی تہدید نہیں کرتا بلکہ پہلے اپنی پُر محبت

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳، سورہ آل عمران آیت ۹۳ کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

تعبیروں سے ، جیسے ربکم (تمہارا پروردگار)، ذو رحمۃ واسعۃ (وسیع رحمت والا) ان کے لیے لوٹ آنے کے راستے کھولتا ہے تاکہ اگر ذرا بھی ان میں پشیمان ہونے کی گنجائش ہے تو ان کی تشویق ہو جائے اور وہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔ ساتھ ہی انہیں اپنے قطعی عذاب سے ڈراتا بھی ہے تاکہ اللہ کی ناپیدا کنار رحمت ان کی جسارت و سرکشی کا باعث نہ بن جائے۔

(۱۴۸) سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

(۱۴۹) قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

(۱۵۰) قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ۝

ترجمہ

(۱۴۸) عنقریب مشرک لوگ (اپنی برأت کے لیے) یہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم مشرک ہوتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ ان سے قبل جو لوگ تھے وہ بھی اسی طرح کے جھوٹ بولتے تھے اور بالآخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ ان سے کہیے اس بارے میں تم کوئی یقینی دلیل رکھتے ہو؟ اگر ہو تو ہمیں بھی دکھلاؤ۔ تم فقط بے بنیاد خیالات کی پیروی کرتے ہو اور بے جا اندازے قائم کرتے ہو۔

(١٤٩) کہیے، کہ خدا کے لیے (دعوے کو ثابت کرنے والی یقینی) دلیل ہے (ایسی کہ جس کے بعد کسی کو بہانہ تراشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی) اگر وہ چاہے تم سب کو (اجباری طور پر) ہدایت کردے (لیکن جبراً ہدایت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لیے وہ یہ کام نہیں کرتا)۔

(١٥٠) کہہ دو کہ تم اپنے گواہوں کو جو اس بات کی گواہی دے سکیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، لے آؤ، اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو تم ان کے ساتھ (ہم آواز نہ ہونا)۔ گواہی نہ دینا، اور ان لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور خدا کا شریک ٹھراتے ہیں۔

تفسیر

"جبر" کا بہانہ کر کے ذمہ داری سے فرار

گزشتہ آیات میں مشرکوں کی جو باتیں ذکر ہوئیں ان کے ذیل میں ان کے کمزور استدلالوں اور ان کے جوابات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ابتدا میں فرماتا ہے: شرک اور رزقِ حلال کی حرمت کے بارے میں تم نے جو مشرکوں پر اعتراضات کیے ان کے جواب میں عنقریب وہ تم سے کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بت پرست ہوتے نہ ہمارے آباؤ اجداد اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ پس جو کچھ ہم کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ سب خدا کی مرضی سے ہے اور وہ یہی چاہتا ہے (سیقول الذین اشرکوا لوشآء اللہ مآ اشرکنا ولآ اباؤنا ولا حرمنا من شیء)۔

اسی طرح کی تعبیر قرآن کی ایک اور آیت میں بھی نظر آتی ہے جیسا کہ سورہ نحل آیت ٣٥ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ

اور سورہ زخرف آیت ٢٠ میں ہے:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک افراد بہت سے دیگر گناہگاروں کی طرح مسئلہ جبر کے سہارے اپنی ذمہ داریوں سے فرار چاہتے ہیں اور اپنی نافرمانیوں کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

یہ بھی در اصل جبر کے معتقد تھے ، اور کہتے تھے : ہم جو بھی کام کرتے ہیں وہ اللہ کی مرضی سے اور اسی کے ارادہ کے مطابق ہے ۔ وہ اگر نہ چاہتا تو یہ اعمال ہم سے سرزد نہ ہوتے ۔ وہ در اصل یہ کہہ کر چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو ان تمام گناہوں سے بری کر دیں ، ورنہ ہر انسان کا ضمیر خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے مجبور نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے حق میں ظلم کرے تو وہ ناراحت ہوتا ہے اور اس سے مواخذہ کرتا ہے اور صاحب اقتدار ہونے کی صورت میں اس سے انتقام بھی لے لیتا ہے ۔ یہ تمام چیزیں اس بات کی مظہر ہیں کہ وہ مجرم کو اس کے عمل میں آزاد اور باختیار سمجھتا ہے نہ کہ مجبور ۔ اس بنا پر کہ اس کا عمل خدا کے چاہنے کے مطابق ہے اور اللہ نے یہ کام اس سے کروایا ہے اس جرم کی سزا دینے سے چشم پوشی نہیں کرتا (اس بات پر خوب غور کرنا چاہیئے) ۔

لیکن یہ احتمال بھی اس آیت کے معنی میں ہے کہ وہ (مشرک) اس بات کے مدعی تھے کہ بت پرستی اور تحریم حیوانات کے مقابلہ میں خدا کا سکوت اس کی رضا مندی کی دلیل ہے کیونکہ اگر وہ راضی نہ ہوتا تو وہ کسی بھی طریقہ سے ہمیں اس کار زشت سے روک سکتا تھا ۔

" ولا آباؤنا " کہہ کر انہوں نے یہ چاہا ہے کہ اپنے ان غلط عقائد کو قدامت و دوام کا رنگ دیں اور کہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ۔

لیکن قرآن کریم نے ان کے جواب میں قاطعانہ بحث کی ہے ۔ پہلے وہ کہتا ہے کہ اکیلے یہ نہیں ہیں جو اس طرح کی جھوٹی باتیں خدا پر باندھتے ہیں بلکہ گزشتہ قوموں میں سے اور لوگ بھی ایسی ہی جھوٹی باتوں کے قائل تھے ۔ لیکن ان کا نتیجہ کیا ہوا ؟ وہ بھی آخر کار اپنی بدکرداریوں کے نتائج میں گرفتار ہوئے اور انہوں نے ہماری سزا کا مزہ چکھا ۔

کذالک کذّب الذین من قبلھم حتّٰی ذاقوا بأسنا[1]

وہ درحقیقت اپنے ان اقوال سے جھوٹ بھی بولتے تھے اور انبیاء کی تکذیب بھی کرتے تھے کیونکہ پیغمبران الٰہی نے صریحی طور پر ہر دور کے بشر کو بت پرستی ، شرک اور حلال خدا کو حرام قرار دینے سے روکا ہے لیکن ان کے بزرگوں نے اس پر کان دھرا نہ انہوں نے ۔ جب صورت حال یہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ خدا ان کے کرتوتوں پر راضی ہو ۔ اگر خدا ان پر راضی ہوتا تو کس لیے اپنے پیغمبروں کو توحید کی دعوت کے لیے بھیجتا ۔ در اصل دعوت انبیاء ، خود اس بات کی ایک اہم ترین دلیل ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد و خود مختار ہے ۔

اس کے بعد فرماتا ہے " ان سے کہو : آیا واقعی کوئی قطعی اور مسلم دلیل تمہارے پاس اس دعوے کی ہے ؟ اگر ہے تو اسے پیش کیوں نہیں کرتے (قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا) ۔

آخر میں مزید فرماتا ہے : تم یقینی طور پر کوئی دلیل اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے نہیں رکھتے

---

[1] کذب - لغت عرب میں دوسرے کو جھٹلانے اور جھوٹ بولنے دونوں معنوں میں آیا ہے ۔

صرف اپنے خام خیالات کی پیروی کرتے ہو (ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون)۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں مشرکوں کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے ایک اور دلیل کا ذکر فرماتا ہے؛ کہو: خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھی اور عقل بشری کے ذریعے بھی توحید اور اپنی یکتائی پر اسی طرح حلال حرام کے احکام کے بارے میں صحیح اور روشن دلیلیں بیان کی ہیں اور یہ دلیلیں اس طرح کی ہیں کہ ان کے بعد کسی کو عذر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی (قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ)۔

بنا بریں وہ لوگ یہ دعوےٰ ہرگز نہیں کرسکتے کہ خدا نے اپنے سکوت سے ان کے ناروا عقائد و اعمال پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے نہ ہی وہ یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں مجبور ہیں کیونکہ اگر مجبور ہوتے تو دلیل قائم کرنا، پیغمبروں کا بھیجنا اور ان کی دعوتیں اور تبلیغیں یہ سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ دلیل کا قائم کرنا خود آزادیٔ ارادہ کی دلیل ہے۔

ضمناً اس امر کی جانب بھی توجہ مبذول کرنا چاہیئے کہ "حجت" دراصل "حج" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی قصد کے ہیں۔ وہ جادہ و راستہ جس پر انسان کو چلنا مقصود ہو اسے "محجۃ" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر دلیل و برہان کو بھی "حجت" کہا جاتا ہے کیونکہ اس دلیل کے پیش کرنے والے کا یہ قصد ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنے مطلب کو دوسروں پر ثابت کرے۔

اگر لفظ "بالغہ" (آخر تک پہنچنے والی) پر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ نے تمام انسانوں کے لیے عقل و نقل کے ذریعے، علم و ذہن کے ذریعے اور اسی طرح رسولوں کے ذریعے ہر حیثیت سے روشن اور ہر ذہن میں اتر جانے والے دلائل پیش کیے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے کسی تردید کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اسی بنا پر خدا نے اپنے پیغمبروں کو ہر طرح کے گناہ و اشتباہ سے معصوم قرار دیا ہے تاکہ ان کے لائے ہوئے پیغاموں سے ہر طرح کے شک و شبہ کو دور کر دے۔

آخر آیت میں فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو تم سب کو زبردستی ہدایت کر سکتا ہے (فلو شآء لھدٰکم اجمعین)۔

در اصل یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے لیے یہ بات بالکل ممکن ہے کہ تمام انسانوں کی بالجبر ایسی ہدایت کر دے کہ کسی بندے میں اس کی مخالفت کرنے کی طاقت نہ ہو لیکن ظاہر ہے اس صورت میں ایسے ایمان کی کوئی قیمت باقی رہ جاتی نہ ان اعمال کی جو جبریہ ایمان کے زیر سایہ پروان چڑھیں بلکہ فضیلت اور انسانی ترقی کا راز یہ ہے کہ انسان ہدایت اور پرہیزگاری کے جادہ پر اپنے قدموں سے چلے اور یہ سفر اپنے ارادہ و اختیار سے طے کرے۔

اس بنا پر اس جملے میں اور قبل کی آیت میں جس میں جبر کی نفی ہوئی ہے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ جملہ

کہتا ہے : بندوں کو ان کے اعمال میں مجبور کرنا جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو خدا کے امکان میں ہے۔ لیکن خدا ہرگز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا کرنا خدا کی حکمت اور انسانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔

بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قدرت و مشیتِ الٰہی کو "مذہب جبر" اختیار کرنے کا ایک بہانہ بنا لیا تھا حالانکہ اللہ کی مشیت و قدرت دونوں برحق ہیں لیکن ان کا لازمہ جبر نہیں ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد رہیں اور حق کا راستہ اپنے اختیار سے طے کریں۔

کتاب کافی میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

ان لله على الناس حجتين حجة ظاهرة و حجة باطنة فاما الظاهرة فالرسل والانبياء والائمة واما الباطنة فالعقول۔

خداوند کریم نے لوگوں کے لیے اپنی دو حجتیں قرار دی ہیں، ایک حجت ظاہری دوسری باطنی ظاہری حجت انبیاء و رسل و آئمہ ہیں اور باطنی حجت انسان کی عقل ہے [1]

امالی شیخ طوسی علیہ الرحمۃ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ سے کسی نے آیہ مذکورہ (فلله الحجة البالغة) کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا :

ان الله تعالى يقول للعبد يوم القيامة عبدی اكنت عالما فان قال نعم قال له أفلا عملت بما عَلِمْتَ ؟ وان قال كنت جاهلا قال له أفلا تعلمت حتى تعمل؛ فيخصمه فتلك الحجة البالغة۔

خدائے تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے کہے گا کہ اے میرے بندے! آیا تجھے علم تھا اور تُو نے گناہ کیا؟) اگر اس نے کہا ہاں، تو فرمائے گا کہ تُو نے اپنے علم پر عمل کیوں نہ کیا؟ اور اگر وہ کہے گا کہ مجھے علم نہ تھا تو ارشاد ہو گا کہ تُو نے علم کیوں نہ حاصل کیا تاکہ اس پر عمل کرتا۔ یہ سن کر بندہ لاجواب ہو جائے گا اور یہ معنی ہیں حجۃ بالغۃ کے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ مذکورہ بالا روایت کا یہ مقصد نہیں کہ حجت بالغہ سے صرف یہی گفتگو مراد ہے جو قیامت میں خدا اپنے بندوں سے کرے گا، خدائے متعال کی بہت سی حجتہائے بالغہ ہیں جن میں سے ایک کا مصداق وہی ہے جس کا ذکر حدیث فوق میں آیا ہے کیونکہ اللہ کی حجت بالغہ کا دامن بہت وسیع ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکوں کی باتوں کے بطلان کو واضح تر کرنے اور فیصلہ کرنے کے لیے صحیح اصول کا لحاظ رکھنے کے لیے انہیں دعوت دیتا ہے کہ اگر ان کے پاس اس بات کے معتبر گواہ ہیں کہ خدا نے ان

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل ص ۷۷۷۔

حیوانات اور زراعتوں کو جن کی تحریم کے وہ مدعی ہیں واقعاً حرام کیا ہے تو ان کو پیش کریں، لہذا فرماتا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اپنے گواہوں کو جو ان چیزوں کی تحریم کی گواہی دیں لے آؤ (قل ھلم شھدآءکم الذین یشھدون ان اللہ حرم ھذا)۔

پھر اس پر اضافہ ہوتا ہے: اگر انہیں ایسے گواہ نہ مل سکیں اور وہ انہیں نہ پا سکیں (جیسا کہ ہرگز نہ پا سکیں گے) اور صرف اپنی ہی گواہی اور دعوے پر اکتفا کریں تو ہرگز ان کے ہم صدا نہ ہونا اور ان کی گواہی اور دعوے کے مطابق گواہی نہ دینا (فان شھدوا فلا تشھد معھم)۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ پوری آیت میں کسی قسم کا اختلاف یا تضاد موجود نہیں ہے اور یہ بات کہ ابتداء میں ان سے گواہ طلب کیے، اس کے بعد فرمایا کہ "ان کے گواہوں کی گواہی کو قبول نہ کرنا" اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ قطعی اور معتبر گواہوں کو لانے سے قاصر ہیں کیونکہ انبیائے الٰہی سے اور کتب آسمانی سے یہ امور ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت موجود نہیں ہے، بنا بریں یہ خود ہی جو مدعی ہیں گواہی دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔

ان تمام امور کے علاوہ دیگر قرائن اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یہ تمام خود ساختہ احکام ان لوگوں نے محض اپنی ہوا و ہوس کے ماتحت اور کورانہ تقلید کی بنا پر گھڑ لیے تھے لہذا ان کا کوئی اعتبار نہ تھا۔

اس بنا پر اس کے بعد کے جملے میں ارشاد فرمایا: جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جن کا آخرت پر ایمان نہیں ہے اور جنہوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرنا (ولا تتبع اھوآء الذین کذبوا بایٰتنا والذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ وھم بربھم یعدلون[1])۔

یعنی ان لوگوں کی بت پرستی، قیامت کا انکار، خرافاتی رسوم و رواج اور ان کی ہوس پرستیاں اس بات کی زندہ گواہ ہیں کہ ان کے یہ احکام بھی خود ساختہ ہیں اور ان چیزوں کی تحریم جس کی نسبت یہ خدا کی طرف دیتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے اہمیت ہے۔

(۱۵۱) قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ

[1] "یعدلون" مادہ "عدل" (بروزن کذب) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ہم رتبہ، شریک اور شبیہ، بنا بریں یہ جملہ "وھم بربھم یعدلون" اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں۔

وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(۱۵۲) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

(۱۵۳) وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۵۱) کہو کہ آؤ جس چیز کو تمہارے پروردگار نے تمہارے اوپر حرام قرار دیا ہے میں تمہیں پڑھ کر سناؤں اور وہ یہ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اور اپنی اولاد کو تنگدستی (کے خوف) سے ہلاک نہ کرنا، ہم تمہیں اور انہیں دونوں کو روزی دیتے ہیں اور بُرے کاموں کے پاس بھی نہ جانا، چاہے وہ نمایاں ہوں یا چھپے ہوئے، جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اسے نہ مارنا، الا یہ کہ حق (استحقاق کی بنا پر) ہو، یہ وہ (حکم) ہے جس کی اللہ نے تمہیں تاکید کی ہے، تاکہ تم اسے سمجھو۔

(۱۵۲) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا اِلّا یہ کہ بطریقِ احسن (اصلاح کے لیے) ہو، یہاں تک کہ وہ سن تمیز کو پہنچ جائے اور انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا کرنا، ہم کسی (بندے) پر اس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے۔ اور جس وقت کوئی بات کرنا تو

اجازت دی گئی ہو (مثلاً کوئی شخص قاتل ہو) (ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق)۔
ان پانچ قسم کی حرمتوں کو بیان کرنے کے بعد مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ امور ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے، تاکہ تم اسے خوب اچھی طرح سے سمجھ لو اور ان کے ارتکاب سے اجتناب کرو (ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم تعقلون)۔

۶۔ کبھی بھی بغیر ارادۂ اصلاح کے یتیم کے مال کے پاس نہ جانا حتیٰ کہ وہ سنِ تمیز کو پہنچ جائیں (ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتیٰ یبلغ اشدہ)۔

۷۔ کم فروشی نہ کرنا اور پیمانہ و ترازو کے حق کو عدالت کے ساتھ ادا کرنا (واوفوا الکیل والمیزان بالقسط)
چونکہ ترازو اور پیمانہ کے بارے میں یہ اندیشہ تھا کہ باوجود احتیاط کرنے کے پھر بھی کچھ فرق باقی رہ جائے جیساکہ ایسا ہوتا ہے کہ توجہ کے باوجود تھوڑا فرق پھر بھی باقی رہ جاتا ہے جس کی شناخت عام ترازوؤں اور پیمانوں سے ممکن نہیں اس لیے مذکورہ بالا جملہ کے ساتھ ہی فرمادیا: ہم کسی شخص پر اس کی قدرت واستطاعت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے (لا نکلف نفسا الا وسعھا)۔

۸۔ فیصلہ کرتے وقت یا گواہی دینے کے موقع پر یا جب بھی کوئی بات کہو تو حق و عدالت کو پیشِ نگاہ رکھواور حق کی راہ سے باہر نہ جاؤ چاہے وہ تمہارے عزیزوں کے بارے میں ہو اور حق کہنے سے انہیں نقصان پہنچ جائے (واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ)۔

۹۔ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو اور اسے مت توڑو (وبعھد اللہ اوفوا)۔
عہدِ الٰہی سے کیا مراد ہے، اس بارے میں مفسّرین نے متعدد احتمالات بیان کیے ہیں لیکن آیت کا مفہوم عام ہے جو تمام الٰہی عہدوں پر محیط ہے چاہے وہ تکوینی ہوں یا تشریعی نیز تکالیفِ الٰہی اور ہر قسم کا عہد، نذر اور قسم بھی اس میں شامل ہے۔
مزید تاکید کے لیے ان چار قسموں کے آخر میں فرماتا ہے: یہ وہ امور ہیں جن کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تمہیں یاد رہے (ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم تذکرون)۔

۱۰۔ یہ میرا سیدھا راستہ۔ توحید کا راستہ ہے، حق و عدالت کا راستہ ہے، پاکیزگی اور تقویٰ کا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور ٹیڑھے راستے اور افتراق کے راستوں پر ہرگز نہ جاؤ کیونکہ یہ تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا دیں گے اور تمہارے درمیان نفاق اور اختلافات کے بیج بو دیں گے (وان ھٰذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ)۔
اس سب کے آخر میں تیسری بار تاکید فرماتا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ (ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم تتقون)۔

حرام ہے حالانکہ یہ اس آیت میں ذکر ہونے والے دیگر محرمات سے ہم آہنگ بھی تھا، بلکہ احسان ونیکی کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے، یعنی نہ صرف یہ کہ انہیں تکلیف پہنچانا حرام ہے بلکہ اس کے علاوہ ان پر نیکی کرنا بھی لازم و ضروری ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی جاذبِ نظر ہے کہ کلمۂ "احسان" کو "ب" کے ذریعہ متعدی کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "وبالوالدین احسانا" "الی" کے ساتھ متعدی نہیں کیا کیونکہ "احسان" اگر "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی نیکی کرنے کے ہوں گے چاہے بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ، لیکن اگر "احسان" کا تعدیہ "ب" کے ذریعہ کیا جائے تو اس کے معنی بلا واسطہ اور بطورِ مستقیم نیکی کرنے کے ہیں، بنا بریں آیت اس بات کی تاکید کر رہی ہے کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کے مسئلے کو اس قدر اہمیت دینا چاہیئے کہ شخصاً اور بغیر کسی واسطے کے اسے انجام دینا چاہیئے۔[1]

۵۔ **گرسنگی کی وجہ سے اولاد کا قتل**:۔ اس آیت سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں بے جا تعصب و غیرت کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، بلکہ لڑکوں کو (جو اس دور میں بزرگی و شرف کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے) بھی فقر و تنگدستی کے خوف سے قتل کر دیتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے وسیع خوانِ نعمت، کہ جس سے ضعیف ترین موجودات بھی بہرہ ور ہوتے ہیں، کی طرف توجہ دلا کر اس بُرے کام سے روکا ہے۔

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ "زمانۂ جاہلیت کا عمل" ہمارے زمانہ میں بھی پایا جاتا ہے اور ایک دوسرے انداز سے اس کی تکرار کی جاتی ہے کیونکہ بعض افراد غذا کی کمی کے خوف سے بے گناہ بچوں کو حالتِ جنین میں "ضائع" کر کے رحمِ مادر ہی میں قتل کر دیتے ہیں۔

اگرچہ آج کل اسقاطِ حمل کے جواز پر کچھ دیگر بے اساس دلیلیں بھی بیان کی جاتی ہیں لیکن فقر اور خوراک کی کمی ان دلیلوں میں نمایاں تر ہے۔

یہ بات اور دیگر امور جو اس سے مشابہت رکھتے ہیں اس بات کے مظہر ہیں کہ عصرِ جاہلیت کی ہمارے زمانہ میں بھی تکرار ہوتی رہتی ہے بلکہ "بیسویں صدی کی جاہلیت" قبل از اسلام کی جاہلیت سے بھی زیادہ وحشتناک اور وسیع تر ہے۔

۶۔ **فواحش سے کیا مراد ہے؟**:۔ "فواحش" جمع ہے "فاحشۃ" کی اس کے معنی اس گناہ کے ہیں جو غیر معمولی اور نفرت آمیز ہو۔ بنا بریں عہد شکنی، کم فروشی، شرک اور اسی طرح کے دوسرے گناہ اگرچہ گناہ کبیرہ میں سے ہیں لیکن فواحش کے

---

[1] تفسیر المنار ج ۸ ص ۱۸۵۔

مقابلہ میں ان کا ذکر مفہوم کے اسی فرق کے لحاظ سے ہے۔

۷۔ **ان گناہوں کے پاس نہ جانا:۔** مذکورہ بالاآیات میں دو جگہ لا تقربوا (نزدیک نہ جانا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس بات کی قرآن کریم میں بعض دیگر گناہوں کے لیے بھی تکرار ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعبیر ان گناہوں کے لیے ہے جو جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اور عام افراد کو اپنی طرف لبھانے والے ہیں۔ جیسے "زنا و فحشاء" اور کمزور یتیموں کا مال کھانا۔ اسی طرح دیگر گناہ ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ ان گناہوں کے پاس نہ جانا کہ ان کی دل لبھانے والی تاثیروں کی زد میں نہ آسکو۔

۸۔ **نمایاں و پنہاں گناہ:۔** اس میں شک نہیں کہ جملہ "نمایاں و پنہاں" کے الفاظ میں ہر قسم کے گناہ شامل ہیں لیکن بعض احادیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:۔

ما ظہر ھو الزنا و ما بطن ھو المخالة۔

نمایاں گناہ سے مراد زنا ہے، اور پنہاں گناہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص خفیہ طور پر داشتہ رکھ لے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کے موارد کا ذکر ایک مصداق کے طور پر ہے نہ یہ کہ مذکورہ عنوان اسی میں منحصر ہے۔

۹۔ **یہودیوں کے دس گناہ:۔** توریت فصل ۲۰ "سفر خروج" میں یہودیوں کے احکام دہگانہ پر نظر پڑتی ہے جو یہودیوں میں "دس فرمان" کے نام سے مشہور ہیں وہ اس فصل کے دوسرے جملہ سے شروع ہوتے ہیں اور ساتویں پر ختم ہوتے ہیں۔

اگر ان دس فرمانوں اور قرآن کے مذکورہ بالا دس فرمانوں کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان کافی فرق ہے، البتہ یہ اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا کہ توریت کا یہ حصّہ تحریف سے محفوظ رہ گیا ہے اور اس میں تغیّر و تبدّل نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ اس کے بعض دوسرے حصّوں میں کیا گیا ہے، لیکن جو بات مُسلّم ہے وہ یہ ہے کہ یہ دس فرمان جو اس وقت توریت میں موجود ہیں اگرچہ ضروری مسائل پر مشتمل ہیں لیکن وسعت کے لحاظ سے اور اخلاقی و اجتماعی طور پر اور عقیدہ کی رُو سے آیاتِ مذکورہ بالا کی سطح سے بہت پست ہیں۔

۱۰۔ **ان چند آیتوں نے کِس طرح مدینہ کی حالت بدل دی:۔** کتاب بحار الانوار اور اسی طرح کتاب اعلام الوری میں ایک دلچسپ داستان اس سلسلہ میں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ بالا لوگوں کے دلوں میں کس قدر اثر انداز ہوئی تھیں! ہم بھی اس واقعہ کو خلاصہ کے طور پر علی بن ابراہیم کی روایت سے جو بحار الانوار میں موجود ہے، نقل کرتے ہیں:۔

قبیلہ خزرج کے دو آدمی اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس ایک دفعہ مکّہ میں آئے جبکہ اوس اور خزرج کے درمیان ایسی طولانی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ شب و روز میں کسی وقت بھی وہ لوگ اپنے ہتھیار کمر سے نہیں کھولتے تھے، ان کا آخری معرکہ "یوم بعاث" کے نام سے ہوا تھا۔ اس میں قبیلہ اوس نے قبیلہ خزرج پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اسی بنا پر اسعد اور ذکوان مکّہ آئے تھے تاکہ مکہ والوں سے قبیلہ اوس کے خلاف ایک معاہدہ کریں۔ جس وقت یہ دونوں عتبہ بن ربیعہ کے گھر پہنچے اور اس سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو عتبہ نے ان کے جواب میں کہا :۔

ہمارا شہر تمہارے شہر (مدینہ) سے کافی دُور واقع ہے اس لیے تمہاری مدد کرنا ہمارے لیے مشکل ہے، خصوصاً ہمارے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمیں بُری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے ۔

اسعد نے پوچھا : وہ کونسا مسئلہ ؟ تم تو حرم کعبہ میں زندگی بسر کرتے ہو جو ایک جائے امن و امان ہے!

عتبہ نے جواب دیا : ایک انسان ہم میں ظاہر ہوا ہے جو کہتا ہے : مَیں خدا کا فرستادہ ہوں، وہ ہماری عقلوں کو ناچیز سمجھتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے اس نے ہمارے جوانوں کو بگاڑ دیا ہے اور ہمارے اتحاد کو پراگندہ کر دیا ہے ۔

اسعد نے دریافت کیا : اس شخص کی تم سے کیا نسبت ہے ؟

اس نے کہا : یہ عبداللہ بن عبد المطلب کا فرزند ہے اور ہمارے شریف خاندانوں کا ایک ممتاز فرد ہے ۔

یہ سُن کر اسعد اور ذکوان کچھ سوچ میں پڑ گئے اور انہیں یاد آیا کہ وہ مدینہ کے یہودیوں سے سنتے آئے ہیں کہ عنقریب ایک نبی مکہ سے ظہور کرنے والا ہے اور وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرے گا ۔

اسعد نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی نبی ہو جس کی پیشین گوئی یہودیوں نے کی تھی ۔

اس کے بعد اس نے پوچھا : وہ ہے کہاں ؟

عتبہ نے کہا : وہ اس وقت خانہ خدا کے پاس حجرِ اسماعیل میں بیٹھا ہے ۔ آج کل اس کی جماعت کے لوگ پہاڑ کے ایک درّہ میں محصور ہیں ۔ انہیں صرف ماہِ رجب میں جو حج و عمرہ کا زمانہ ہے آزادی دی گئی ہے تاکہ عمرہ بجا لا سکیں اور لوگوں کے درمیان آ سکیں لیکن مَیں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں اس کی باتوں میں نہ آ جانا اور اس سے بالکل بات نہ کرنا کیونکہ وہ ایک عجیب جادوگر بھی ہے ۔

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ مشرکین مکّہ نے مسلمانوں کو شعب ابو طالب میں بند کر کے گھیراؤ ڈال دیا تھا اور انہیں باہر نہیں نکلنے دیتے تھے ۔

اسعد نے عتبہ سے کہا: اب میں کیا کروں کیونکہ میں نے تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لیے احرام باندھ لیا ہے لہذا طواف کرنا ضروری ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا؟

عتبہ نے جواب دیا: تھوڑی سی روئی لے کر اس سے اپنے کان بند کر لو تاکہ اس شخص کی کوئی بات نہ سُن سکو۔

اسعد مسجد الحرام میں پہنچا۔ اس نے روئی سے اپنے کانوں کو بند کر رکھا تھا۔ اس حالت میں اس نے طواف خانہ کعبہ کرنا شروع کیا۔ اس وقت پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنی ہاشم کے لوگوں کے درمیان حجرِ اسماعیل میں خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

اسعد نے ایک نگاہِ غلط انداز پیغمبرؐ پر ڈالی اور ان کے پاس سے جلدی سے گذر گیا۔

جب طواف کے دوسرے دَور میں پہنچا تو اس نے اپنے آپ سے کہا: مجھ سے بھی زیادہ کوئی احمق نہ ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ مکہ میں اتنا بڑا واقعہ رونما ہو جائے جو اہلِ مکہ کے زبان زد ہو اور میں اس سے بے خبر رہوں اور جب مدینہ واپس جاؤں تو اپنی قوم کو اس کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکوں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے روئی اپنے کان سے نکال کر دور پھینک دی اور جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوگیا، پھر اس نے پوچھا: آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: میں اس بات کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں نیز میں تم لوگوں کو ان باتوں کی طرف دعوت دیتا ہوں .... اس کے بعد آپ نے مذکورہ تین آیتوں کی تلاوت فرمائی جو دس حکموں پر مشتمل ہیں۔

جب اسعد نے یہ پُرمعنی اور روح پرور کلام سُنا جو اس کے جان و دل سے ہم آہنگ تھا تو اس کا عالم دگرگوں ہوگیا۔ اس کی زبان پر بے ساختہ جاری ہوا:- اشھد ان لاۤ الٰہ الا اللہ و انک رسول اللہ۔

یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میں یثرب کا رہنے والا ہوں، قبیلہ "خزرج" سے میرا تعلق ہے، ہمارا تعلق ہمارے بھائیوں "قبیلہ اوس" سے طولانی جنگوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے، شاید خداوند کریم آپ کی برکت سے اس ٹوٹے ہوئے بندھن کو دوبارہ جوڑ دے۔

اے نبیؐ خدا! ہم نے آپ کے اوصاف قوم یہود سے سُنے تھے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہمارا شہر - مدینہ - آپ کی ہجرت گاہ بنے کیونکہ یہودیوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھ کر ہمیں یہی بتایا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آنے کا موقع دیا۔ خدا کی قسم! میں تو یہ قصد لے کر آیا تھا کہ اہلِ مکہ سے اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کر سکوں لیکن خدائے کریم نے مجھے اس سے بڑی کامیابی عطا کی۔

اس کے بعد اس کا ساتھی ذکوان بھی مسلمان ہوگیا اور دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی شخص کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ کریں تاکہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دے شاید اس طرح یہ جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ خاموش ہوجائے چنانچہ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو ان کے ہمراہ مدینہ بھیجا اور اس وقت سے مدینہ میں اسلام کی داغ بیل پڑی جس سے مدینہ کی صورت بدل گئی، یہ سب واقعہ مذکورہ بالا تین آیتوں کی برکت سے ہوا۔[1]

---

(۱۵۴) ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

(۱۵۵) وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(۱۵۶) اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝

(۱۵۷) اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۵۴) اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو (آسمانی) کتاب دی، جو نیک تھے ان پر (اپنی نعمت کو) تمام کیا اور تمام چیزیں (جن کی ان کو ضرورت تھی) ان پر واضح کر دیں۔ یہ کتاب ہدایت و

---

[1] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۵ - ص ۸ - ۹ - ۱۰ -

رحمت کا سرمایہ تھی، تاکہ وہ (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔

(۱۵۵) اور یہ ایک پر برکت کتاب ہے جو ہم نے (تجھ پر) نازل کی ہے۔ اس کی پیروی کرنا، اور پرہیزگاری کو اپنانا تاکہ اللہ کی رحمت کے مستحق ہو۔

(۱۵۶) (ہم نے ان خصوصیات کی کتاب نازل کی) تاکہ یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے جو دو قومیں (یہود و نصاریٰ) تھیں ان پر کتاب آسمانی نازل ہوئی تھی اور ہم اس کے مطالعہ سے بے بہرہ تھے۔

(۱۵۷) یا یہ نہ کہو کہ اگر ہم پر بھی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہوتی تو ہم ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ (لو) اب یہ آیتیں اور روشن دلیلیں تمہارے پروردگار کی جانب سے آگئی ہیں۔ اسی طرح اس کی ہدایت و رحمت بھی (آگئی ہے)۔ اس صورت میں ان لوگوں سے بڑھ کر کون ستمگار ہوگا جو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے لگیں، اور ان سے روگردانی کریں۔ لیکن عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روگردانی کرتے ہیں، ان کی اس بلا وجہ کی روگردانی کے سبب سخت سزا دیں گے۔

تفسیر

بہانہ سازوں کو ایک قطعی جواب

اس سے قبل کی آیات میں اسلام کے دس بنیادی احکام سے بحث کی گئی تھی، جو در اصل بہت سے احکام اسلامی کی اصل اصول ہیں، اور اس طرح کی تعبیر جیسے: ان ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ (یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرتے رہنا) سے برآمد ہوتا ہے کہ یہ احکام کسی خاص مذہب سے مخصوص نہ تھے۔ خاص کر اس لیے کہ یہ سب کے سب اصولی احکام ہیں جن کی تائید عقلِ انسانی سے اچھی طرح ہوتی ہے۔ بنا بریں آیاتِ گذشتہ کا مقصد ان احکام کو بیان کرنا ہے جو نہ صرف اسلام میں بلکہ ادیانِ ماسبق میں بھی رائج و شامل تھے۔

انہی کے ذیل میں ان آیتوں میں اللہ فرماتا ہے کہ۔ اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی" اور جو لوگ نیکوکار تھے، ہمارے فرمان کو ماننے والے تھے، اور حق کے پیروکار تھے ان کے لیے ہم نے اپنی نعمت کو کامل کر دیا (ثم اٰتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن)۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے کلمۂ "ثم" (جو لغت عرب میں عام طور سے عطف یا تاخیر کے لیے آتا ہے) کے

معنی واضح ہوگئے ہوں گے۔ اب آیت کے معنی یوں ہوں گے : پہلے ہم نے انبیائے ماسبق کو یہ ہمہ گیر احکام پہنچائے اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی اور اس میں دستور العمل اور دیگر ضروری قوانین کی توضیح کردی۔

اس طرح ان مختلف اور ضعیف توجیہوں کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جنہیں بعض مفسرین نے ۔ ثم ۔ کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

ضمناً یہ نکتہ بھی واضح ہوگیا کہ ۔ الذی احسن ۔ سے ان تمام افراد کی طرف اشارہ مقصود ہے جو نیکوکار ہیں اور کلمۂ حق اور فرمانِ الٰہی کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

اور اس (توریت) میں ہر اس چیز کو بیان کردیا گیا تھا جس کی انہیں ضرورت تھی اور جو انسانی ترقی کی راہ میں کارآمد ہوسکتی تھی (و تفصیلاً لکل شیٔ)۔

نیز یہ کتاب جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی سرمایہ ہدایت و رحمت تھی (و ھدی و رحمۃ)۔

یہ تمام امور اس لیے تھے کہ یہ لوگ روزِ قیامت اور ملاقات پروردگار کے دن پر ایمان لے آئیں اور روزِ معاد پر ایمان لانے کی وجہ سے ان کی گفتار و کردار پاک ہوجائے (لعلھم بلقآء ربھم یؤمنون)۔

ممکن ہے یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ اگر آئین حضرت موسیٰ ہر طرح سے کامل تھا (جیسا کہ کلمہ ۔ تماماً ۔ اس پر دلالت کرتا ہے)، تو پھر اس کے بعد آئین حضرت عیسیٰ اور پھر اس کے بعد آئین اسلام کی کیا ضرورت تھی ؟

لیکن اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ ہر آئین اپنے زمانے کی حدود کے اندر جامع اور کامل ہوتا ہے اور یہ امر محال ہے کہ خداوندکریم کی جانب سے کوئی ناقص آئین نازل ہو لیکن یہی آئین جو اپنے زمانہ کی رُو سے کامل تھا ممکن ہے کہ بعد میں آنے والے زمانوں کے لیے ناتمام و ناقص ہو۔ جیسا کہ وہ نصاب جو پرائمری اسکول کے لیے تو ہر طرح سے مکمل ہوتا ہے لیکن سیکنڈری اسکول کے لیے ناقص ہوتا ہے۔ یہی راز ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبروں کو ان کی کتابوں کے ساتھ تدریجاً بھیجا یہاں تک کہ یہ سلسلہ آخری پیغمبرؐ اور آخری کتاب پر ختم ہوا۔ بیشک جب انسانوں میں آخری آئین قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی اور وہ آئین خدا کی طرف سے نازل ہوگیا تو اب کسی دوسرے آئین کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے وہ افراد جو فارغ التحصیل ہوگئے ہوں اپنی معلومات کی بنیاد پر بذریعہ مطالعہ مزید علمی ترقیاں کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مذہب کے پیروکاروں کو کسی نئے آئین کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ وہ حرکت در عمل اور آگے بڑھنے کے کافی راستے اسی ۔ آخری آئین ۔ کے ذریعے تلاش کرلیں گے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے متعلق مسائل اصلی توریت میں کافی حد تک موجود تھے حالانکہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ توریت اور اس کی دوسری کتابوں کے اندر یہ مسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی ان دنیا پرست یہودیوں نے جو اس امر کی طرف مائل تھے کہ قیامت کے بارے میں کم بولیں اور کم سنیں، کافی تحریف کرڈالی ہے۔

ہاں موجودہ توریت کے نسخوں میں چند مختصر اشارے قیامت کی جانب موجود ہیں مگر یہ اس حد تک کم ہیں

کہ بعض افراد کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ یہودی اصولی طور پر روزِ قیامت کے معتقد ہی نہیں ہیں لیکن واقفیت کے لحاظ سے یہ نسبت مبالغے سے زیادہ نزدیک ہے۔

آخر میں ہم ایک امر کی طرف اور توجہ دلانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سابقاً بھی جلد اوّل[1] میں ہم نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ قرآن کریم میں پروردگارِ عالم کی جس ملاقات کا بار بار ذکر آیا ہے اس سے مراد حسی ملاقات نہیں ہے اور نہ ہی آنکھوں سے دیکھا جانا مراد ہے بلکہ اس سے مراد ایک قسم کا "شہودِ باطنی اور ملاقاتِ روحانی" ہے جس پر انسان روزِ قیامت تکامل و ترقی کی وجہ سے فائز ہوگا یا اس سے مراد ان پاداشوں اور سزاؤں کا سامنا کرنا ہے جو اس کے اعمال کے بدلے میں جہانِ آخرت میں اسے درپیش ہوں گی۔

اس کے بعد کی آیت میں نزولِ قرآن اور اس کی تعلیمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور گذشتہ آیت کی بحث کو مکمل کیا گیا ہے اور فرمایا ہے: یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے، ایسی کتاب جو بڑی باعظمت پُربرکت ہے اور طرح طرح کی خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے (وھٰذا کتاب انزلناہ مبارک)۔

اور جب یہ کتاب اس طرح کی ہے تو پھر اس کی پیروی کرو، پرہیزگاری کو اپنا شعار بناؤ اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، شاید[2] خدا کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے (فاتبعوہ واتقوا لعلکم ترحمون)۔

اس کے بعد والی آیت میں مشرکوں پر تمام بہانہ سازیوں اور فرار کرنے کے راستوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ پہلے ان سے یہ فرمایا: ہم نے یہ آسمانی کتاب ان خصوصیات کے ساتھ اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کتاب آسمانی صرف دو قوموں (یہود و نصاریٰ) پر نازل ہوئی تھی اور ہم اس میں غور و فکر کرنے سے غافل تھے لہٰذا اگر ہم نے تیرے حکم کی مخالفت کی تو وہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس کا مطالعہ نہ کر سکے کیونکہ تیرا فرمان دوسروں کے ہاتھ میں تھا اور وہ ہم تک نہ پہنچا (ان تقولوا انما انزل الکتاب علی طائفتین من قبلنا و ان کنا عن دراستھم لغافلین[3])۔

بعد کی آیت میں ان کافروں کی طرف سے وہی بہانہ نقل ہوا ہے مگر اس دفعہ اسے ذرا تفصیل کے ساتھ دہرایا گیا ہے جس میں خود نمائی اور زیادہ غرور کی آمیزش بھی ہے اور وہ یہ ہے: اگر ان پر قرآن نازل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے کہ ہم فرمانِ الٰہی کو بجا لانے کے لیے اس قدر تیار تھے جتنا دوسری قومیں

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد اوّل اردو ترجمہ صفحہ ۱۸۳۔

[2] قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ "لعل" جو عام طور سے "شاید" کے معنی میں ہے، اللہ نے اپنی نسبت سے فرمایا ہے وہ "تاکہ" یعنی غایت کے معنی میں ہے کیونکہ "شاید" ترجّی کے لیے آتا ہے اور ترجّی خدائے علام الغیوب کے لیے محال ہے۔ (مترجم)

[3] جملہ (ان تقولوا) (لئلا تقولوا) "تاکہ یہ نہ کہو..." کے معنی میں ہے اور اس کی نظیر قرآن یا دیگر عبارات عربی ادب میں بہت زیادہ ہے۔

تیار نہیں ہو سکتی تھیں، ہم پر آسمانی کتاب نازل ہوتی تو ہم سب سے زیادہ قبول کرنے والے اور ہدایت پانے والے ہوتے (او تقولوا لو انآ انزل علینا الکتاب لکنا اھدٰی منھم)۔

در اصل پچھلی آیت ان کے اس بہانے کو بتانا چاہتی ہے کہ اگر ہم راہِ راست پر نہیں آئے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم کتب آسمانی سے بے خبر رہے اور یہ بے خبری اس وجہ سے ہے کہ یہ کتابیں دوسروں پر نازل ہوئی تھیں لیکن یہ آیت ان (عربوں) کے احساس برتری اور اس بے بنیاد زعم کی حکایت کر رہی ہے جو اُن کے دماغوں میں سمایا ہوا تھا کہ نژادِ عرب کو دوسری قوموں پر امتیاز حاصل ہے۔

اسی مطلب کی ہم معنی سورۂ فاطر کی آیت ۴۲ بھی ہے جس میں ایک یقینی مسئلہ کے طور پر (نہ کہ قضیہ شرطیہ کے طور پر) اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے، جہاں کہا گیا ہے :-

"مشرکوں نے بڑی تاکیدی قسم کھائی ہے کہ اگر ان کی جانب کوئی پیغمبر آجائے تو وہ تمام قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے"۔

بہرحال قرآن کریم ان تمام دعووں کے جواب میں کہتا ہے : خدا نے تمام بہانہ تراشیوں کی راہوں کو تمہارے لیے بند کر دیا ہے، کیونکہ : متعدد دلیلیں اور روشن آیتیں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس آچکی ہیں، جو الٰہی ہدایت اور رحمت پروردگار کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں (فقد جآءکم بینة من ربکم وھدی و رحمة)۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ کتابِ آسمانی کے بدلے لفظ "بیّنہ" استعمال کیا گیا ہے جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتابِ آسمانی ہر حیثیت سے مدلّل اور اطمینان بخش ہے جو اپنے دامن میں یقین آور دلیلیں لیے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں بھی اگر یہ خدا کی آیتوں کی تکذیب کریں تو کیا ان سے زیادہ ظالم کوئی دوسرا ہو سکتا ہے (فمن اظلم ممن کذب بأیات اللہ وصدف عنھا)۔

"صَدَفَ" مادۂ "صَدفٌ" (بروزن حَذفٌ) سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز سے بغیر غور و فکر کے شدید روگردانی کرنا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان (کافروں) نے نہ صرف آیاتِ الٰہی سے روگردانی کی بلکہ بغیر غور و فکر کیے بڑی شدت سے ان سے دُوری اختیار کی۔ بعض اوقات یہ لفظ (صدف) دوسروں کو کسی کام سے روکنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

آخر میں خدا نے ایسے ضدی اور اپنی سمجھ سے کام نہ لینے والے افراد جو بغیر سوچے سمجھے سختی کے ساتھ حقائق کا انکار کر دیتے ہیں، اور اس سے بھاگتے ہیں یہاں تک کہ دوسروں کے لیے بھی سدِّ راہ ہوتے ہیں، کی سزا کو ایک مختصر لیکن نہایت بلیغ جملے میں بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے :- عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روگردانی کرتے ہیں، شدید سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور یہ ان کی بلا وجہ اور بغیر سوچے سمجھے روگردانی کی وجہ سے ہے (سنجزی الذین یصدفون عن اٰیاتنا سوٓء العذاب بما کانوا یصدفون)۔

کلمۂ "سوٓء العذاب" کے معنی اگرچہ "بُری سزا" ہیں لیکن چونکہ بُری سزا وہ ہوتی ہے جو نوعی حیثیت سے

سخت اور معمول سے زیادہ اور دردناک ہو اس لیے بہت سے مفسروں نے اس کا مفہوم "شدید سزا" بیان کیا ہے۔
ایسے لوگوں کی سزا بیان کرنے کے سلسلے میں کلمہ "یصدفون" کی تکرار اس مطلب کو واضح کرنے کی غرض سے ہے کہ ان کی تمام مصیبتیں اور بدبختیاں اس وجہ سے ہیں کہ انہوں نے بغیر غور و فکر کیے اور بغیر دیکھے بھالے حقائق سے روگردانی کی ہے اگر وہ کم از کم ایک ایسے شخص کی طرح جو شک کی حالت میں تلاش حق کر رہا ہو ان آیات کا مطالعہ کرتے تو اپنے اس دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

(۱۵۸) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۸) کیا انہیں صرف اس بات کا انتظار ہے کہ (موت کے) فرشتے ان کے پاس آئیں یا خدا (خود) ان کے پاس آئے (یہ توقع کیسی محال ہے!) یا خدا کی آیتوں میں سے کچھ آیتیں (جو روزِ قیامت کی نشانی ہوں) ان کے پاس آئیں، لیکن جس روز یہ آیتیں اور نشانیاں آجائیں گی اس روز ان لوگوں کا ایمان لانا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لائے ہوں گے، یا انہوں نے کوئی نیک عمل نہ کیا ہوگا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ (اے ہمارے رسول) ان سے کہہ دو کہ (اب جبکہ تم ایسا بے جا انتظار و توقع کیے بیٹھے ہو تو پھر) انتظار کرو، ہم بھی (تمہاری سزا کے وقت کا) انتظار کرتے ہیں۔

تفسیر

بے جا اور محال توقعات

پچھلی آیتوں میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے مشرکین پر اتمام حجت کر دیا ہے اور آسمانی کتاب یعنی قرآن کو سب کی ہدایت کے لیے بھیج دیا ہے تاکہ لوگوں کو اپنی مخالفت کی توجیہ کے لیے کسی بہانہ کا موقع نہ ملے۔

یہ آیت کہتی ہے: لیکن یہ ضدی لوگ اپنے طریقہ کار میں اس قدر سخت ہیں کہ یہ واضح دستور العمل (قرآن) بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ گویا انہیں اپنی نابودی یا آخری موقع کے کھو دینے یا محال باتوں کا انتظار ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "انہیں سوائے اس کے اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ موت کے فرشتے انہیں لینے آ جائیں (ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملآئکۃ)۔

یا یہ کہ تیرا پروردگار ان کے پاس آجائے تاکہ یہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ایمان لے آئیں (او یأتی ربک)۔

درحقیقت یہ لوگ امر محال کی توقع کر رہے ہیں نہ یہ کہ خدا کا آنا یا اس کا دیکھا جانا ایک ممکن امر ہے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک ہٹ دھرم قاتل جسے اس کے جرم کے ثبوت کے لیے کافی دلیلیں پیش کی جائیں لیکن پھر بھی وہ قائل نہ ہو تو اس سے ہم کہیں کہ اگر یہ تمام ثبوت بھی تم قبول کرنے پر تیار نہیں ہو تو شاید تمہیں اس بات کا انتظار ہے کہ اب خود مقتول زندہ ہو کر عدالت میں آئے اور یہ گواہی دے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: یا تمہیں اس بات کا انتظار ہے کہ بعض وہ نشانیاں آجائیں جو روزِ قیامت سے کچھ پہلے ظاہر ہوں گی اور ان کے ظاہر ہونے کے بعد توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا (او یأتی بعض اٰیات ربک)۔

یہاں پر کلمہ "آیات ربک" اگرچہ کلی طور سے اور سربستہ استعمال ہوا ہے لیکن بعد کے جملوں کے قرینہ سے جن کی تفسیر آگے آئے گی، ان آیات کو "آیاتِ روزِ محشر" کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے جیسے وحشتناک زلزلے، سورج، چاند ستاروں کا بے نور ہو جانا اور اسی طرح کی دوسری نشانیاں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی ہیں۔

یا اس سے مراد ان کے وہ نامعقول مطالبے ہیں جو وہ پیغمبر اسلامؐ سے کیا کرتے تھے۔ منجملہ ان کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ ان کے سروں پر آسمانی پتھر برسیں یا یہ کہ سرزمین عربستان کا خشک ریگستان بہتے ہوئے چشموں اور ہرے بھرے نخلستان سے بھر جائے۔

اسی کے ذیل میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ: جس روز بھی یہ نشانیاں ظاہر ہوں گی اس روز بے ایمانوں کا ایمان لانا اور ان لوگوں کا ایمان لانا جنہوں نے کوئی نیک کام نہ کیا ہوگا، قابل قبول نہ ہوگا اور توبہ کے دروازے بھی ان کے لیے بند کر دیئے جائیں گے کیونکہ توبہ اور ایمان لانا اُن حالات میں اجباری اور اضطراری کیفیت کا حامل ہوگا جو اختیاری توبہ اور

ایمان کے ہم پایہ نہیں ہے (یوم یأتی بعض اٰیات ربك لا ینفع نفسا ایمانها لم تکن اٰمنت من قبل او کسبت فی ایمانها خیرا)۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے معلوم ہوا کہ جملہ - او کسبت فی ایمانها خیرا - کے معنی یہ ہیں کہ اس روز صرف ایمان لانا فائدہ بخش نہ ہوگا بلکہ ایسے لوگ بھی جو ایمان تو لائے ہیں مگر انہوں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے، اس روز کوئی نیک کام کرنا بھی انہیں فائدہ نہیں پہنچائے گا کیونکہ اس وقت حالات ہی ایسے ہوں گے کہ ہر شخص بے اختیارانہ طور پر یہ چاہے گا کہ بُرے کاموں کو چھوڑ دے اور نیک اعمال بجا لائے۔

آیت کے آخر میں تہدید آمیز لہجہ میں ان ضدی افراد سے فرماتا ہے :- اچھا اب جبکہ تمہیں اس قسم کا انتظار ہے تو یہی انتظار کیے جاؤ، ہم بھی (تمہارے دردناک انجام) کے انتظار میں رہیں گے (قل انتظروا انا منتظرون)۔

عمل صالح کے بغیر ایمان کا کوئی فائدہ نہیں

آیت مذکورہ بالا سے چند قابل توجہ نکات معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت ایسی راہ نجات کا پتہ دے رہی ہے جو ایمان کے زیر سایہ ہے، پھر ایمان بھی وہ ایمان جس کی روشنی میں بندہ اعمال نیک بجا لائے۔

ممکن ہے کوئی پوچھے کہ کیا تنہا ایمان کافی نہیں ہے چاہے وہ تمام اعمال خیر سے خالی ہو؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے : ہم نے مانا کہ کچھ باایمان افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن سے لغزشیں ہو جائیں اور وہ گناہوں کے مرتکب بھی ہو جائیں پھر اس کے بعد اپنے گناہوں پر نادم و پشیمان بھی ہوں اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں لیکن ایسا باایمان شخص جس نے اپنی عمر میں کافی مواقع کے باوجود کوئی نیک عمل نہ کیا ہو بلکہ اس کے برعکس وہ ہر طرح کے بُرے کاموں میں مشغول رہا ہو اور ہر قسم کی سیاہ کاری اس سے سرزد ہوئی ہو، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص نجات یافتہ ہو جائے اور اس کا یہ عمل سے خالی ایمان اسے فائدہ پہنچائے کیونکہ اصولی طور پر یہ یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص کسی نظریہ پر ایمان تو رکھتا ہو اس کے باوجود اپنی تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی اس نظریہ کے قوانین پر عمل پیرا نہ ہو سکے بلکہ اس کے برعکس اس کے تمام قوانین کو ٹھکرا دے، اس کا ایسا کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہوگا کہ اسے سرے سے اس نظریے پر ایمان و اطمینان نہ تھا۔ اس طرح سے معلوم ہوا کہ ایمان وہی ہے جو عمل نیک کے ہم پہلو ہو چاہے وہ عمل نیک تھوڑا ہی کیوں نہ ہو تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں ایمان کا وجود ہے۔

(۱۵۹) اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○

(۱۶۰) مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا، وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۹) وہ لوگ جنھوں نے اپنے آئین کو پراگندہ کردیا اور وہ مختلف جتھوں (اور مختلف مذہبوں) میں بٹ گئے، تمہیں (اے رسول!) ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، لہٰذا خدا ہی انہیں ان کے کرتوتوں سے آگاہ کرے گا۔

(۱۶۰) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا اسے دس گنا صلہ ملے گا، اور جو شخص کوئی برا کام کرے گا اسے اتنی ہی سزا ملے گی (جتنا برا کام کیا تھا) اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر

نفاق پھیلانے والوں سے علیحدگی کا حکم

جو دس فرمان پچھلی آیتوں میں گذرے ہیں جن کے آخر میں یہ حکم تھا کہ خدا کی صراطِ مستقیم کی پیروی کرو اور ہر طرح کے نفاق اور اختلاف کا مقابلہ کرو، یہ آیت دراصل اسی مفہوم کی تفسیر و توضیح کے ضمن میں ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "وہ لوگ جنھوں نے اپنے آئین و مذہب کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے (اے رسول!) تمہارا ان سے کسی معاملے میں کوئی ربط نہیں، نہ ان کا تم سے کسی چیز میں ربط ہے کیونکہ تمہارا آئین توحید اور تمہارا دین صراطِ مستقیم ہے اور راہِ راست ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے (ان الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعا لست منهم فی شیء)"۔[۱]

---

[۱] لغت میں لفظ "شیَع" کے معنی فرقوں، گروہوں، پیروؤں کے ہیں، بنابریں اس کا مفرد (شیعہ) کے معنی اس گروہ کے ہیں جو کسی خاص مسلک یا شخص کی پیروی کرے؛ یہ لفظ "شیعہ" کے لغوی معنی ہیں لیکن اصطلاح میں اس کے خاص معنی ہیں اور ان لوگوں کو شیعہ کہا جاتا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلک امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پیرو ہیں، لہٰذا اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے (مؤلف) مطلب یہ ہے کہ یہاں پر لفظ "شیع" اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ اصطلاحی معنی میں، لہٰذا کوئی صاحبِ عقل اس آیت کو مذہب شیعہ کے خلاف استعمال نہیں کرسکتا (مترجم)۔

اس کے بعد اس طرح کے تفرقہ انداز لوگوں کی تہدید و مذمت کے لیے فرماتا ہے: ان کا کام خدا کے سپرد ہے، وہ انہیں کیفرِ کردار سے آگاہ کرے گا (انما امرھم الی اللہ ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون)۔

چند اہم نکات

۱- اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ :- مفسّرین میں سے کچھ افراد کا خیال ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے تھے۔

بعض دوسرے مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اسی امتِ محمدی کے ان تفرقہ انداز افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے جنہوں نے مختلف تعصبات اور جذبہ تفوق طلبی اور جاہ پسندی کی وجہ سے اس امتِ مسلمہ کے درمیان نفاق و افتراق کا بیج بویا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آیہ کریمہ میں عمومی طور سے ان تمام تفرقہ پسند افراد کا حکم بیان کیا گیا ہے جنہوں نے طرح طرح کی بدعتیں ایجاد کرکے بندگانِ خدا کے درمیان نفاق و اختلاف پھیلایا ہے، چاہے وہ پچھلی امتوں میں گزرے ہوں یا ان کا تعلق اس امت سے ہو۔

لہٰذا اگر ہمیں اہلبیت طاہرین علیہم السلام کی روایات میں اور اسی طرح اہلسنت کی روایات میں بھی یہ ملتا ہے کہ اس آیت سے اس امت کے تفرقہ انداز اور بدعت پھیلانے والے لوگ مراد ہیں[۱] تو یہ بیان مصداق کے طور پر ہے (نہ کہ اس سے انحصار مراد ہے) کیونکہ اگر اس مصداق کو بیان نہ کیا جاتا تو بعض کو یہ خیال گزرتا کہ اس آیت سے صرف پچھلی امتیں مراد ہے، اس طرح وہ خود کو اس آیت کی مذمت سے بری قرار دے لیتے۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں روایت ہے :-

فارقوا امیرالمؤمنین علیہ السلام و صاروا احزابا۔

یعنی اس آیت میں ان لوگوں کی جانب اشارہ ہے جنہوں نے امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے[۲]

نیز وہ روایات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں جن میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا ہے :-

"میرے بعد یہ امت مختلف گروہوں میں بٹ جائے گی:

۱- تفسیر نورالثقلین، جلد اوّل ص۷۸۳۔

۲-

تفرقہ اور نفاق کی برائی

یہ آیت اس امر کو بڑی تاکید کے ساتھ دُہرا رہی ہے کہ اسلام آئین وحدت و یگانگی ہے اور ہر طرح کے نفاق، تفرقہ اور انتشار سے بیزار ہے۔ اسی بنا پر بڑی تاکید کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے ارشادِ الٰہی ہے کہ تمہارے کام کو تفرقہ انداز لوگوں سے کوئی مشابہت نہیں ہے، خدائے قہار و منتقم ان سے انتقام لے لے گا اور ان کے انجام بد کو ان کے سامنے لائے گا۔

توحید نہ صرف ایک اصل اسلام ہے بلکہ اسلام کے تمام اصول و فروع اور اس کے تمام آئین و فرامین توحید کے محور پر گھومتے ہیں۔ تمام تعلیمات اسلامی کے پیکر میں توحید روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسدِ اسلام میں توحید ہی کی روح پھونکی گئی ہے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ آئین اسلام جس کے تمام اصولوں کو وحدت و یگانگی نے حیات بخشی ہے آج وہی آئین، تفرقہ اندازوں اور نفاق افگنوں کے ہاتھوں کچھ اس طرح گرفتار ہوا ہے کہ اس کے اصلی خد و خال گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر روز ایک نغمۂ شوم اس صدائے بوم کی طرح جو ویرانہ میں سنائی دے، کسی نہ کسی گوشہ سے بلند ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی شخص جسے ہیرو بننے کا شوق ہو یا کسی دماغی مرض میں گرفتار ہو یا کج رفتار ہو وہ کسی قانونِ اسلامی کے خلاف عَلَمِ مخالفت اونچا کرتا ہے جس کے گرد کچھ نادان افراد جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک نئے اختلاف کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

عام مسلمانوں کی بے خبری اور آئینِ اسلامی سے ان کا جہل اس تفرقہ اندازی میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو دشمن کی بیداری اور فنِ تفرقہ سے آگاہی ادا کرتی ہے۔ یہ دونوں امور اس افتراق و اختلاف میں بہت مؤثر ہوتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مسائل جو صدیوں سے موردِ بحث چلے آ رہے ہیں، بعض لوگ تفرقہ ڈالنے کے لیے نئے سرے سے معرضِ بحث میں لا کر جنجال برپا کرتے ہیں تاکہ عوام کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کریں لیکن جیسا کہ آیت مذکورہ بالا کہہ رہی ہے اسلام ایسے لوگوں سے اور یہ لوگ اسلام سے بیگانہ ہیں اور آخر میں ان تفرقہ اندازافراد کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی[1]

مذہبِ شیعہ پر مؤلف "المنار" کے ناروا حملے

مؤلف تفسیر "المنار" جو ملتِ شیعہ سے بُری طرح بدظن ہیں اور جتنا بدظن ہیں اتنا ہی عقائدِ شیعہ اور تاریخ شیعہ سے بے خبر بھی ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں "دعوت اتحاد و اتفاق" کی نقاب ڈال کر موصوف نے شیعوں پر خامہ

---

[1] مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۳۔

فرسائی کی ہے اور ان پر یہ اتہام لگایا ہے کہ شیعہ ہیں جنہوں نے اسلام میں تفرقہ ڈالا ہے، یہ اسلام کے مخالف ہیں اور مذہب کے نام پر خلاف اسلام اعمال میں مشغول ہیں!، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیہ مذکورہ میں جو لفظ "شیعاً" آیا ہے، اور جس کو مسئلہ "تشیع یا شیعہ" سے کوئی ربط نہیں ہے اس نے اسے اپنے پوچ دعوے کے اثبات میں عنوان قرار دیا ہے!۔

ان صاحب کی عبارتیں اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ خود ان کے اعتراضوں کا جواب ہیں اور وہ اس بات کے زبردست شاہد ہیں کہ ان کو تاریخ و عقائد شیعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ کیونکہ:

(۱) موصوف نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ملت "شیعہ" اور "عبد اللہ بن سبا" یہودی کے درمیان ربطِ خاص ہے، حالانکہ عبد اللہ بن سبا کا وجود ہی مشکوک ہے[۱] اور بہ فرضِ وجود اس نے تاریخ شیعہ یا کتبِ شیعہ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے، پھر یہ ادعاء کیا ہے کہ "شیعہ" اور فرقہ "باطنیہ" اور فرقہ "ضالّہ" کے درمیان ارتباط ہے حالانکہ یہ دونوں فرقے شیعوں کے سخت دشمن ہیں۔ اگر کسی کو تاریخ شیعہ سے مختصر آگاہی ہو تو اسے بھی پتہ چل جائے گا کہ اس قسم کے دعوے واہی خیالات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ افترا و تہمت ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف نے شیعوں کو "غُلات" سے نسبت دی ہے (غلات وہ فرقہ ہے جس نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا ہے اور وہ انہیں خدا سمجھتا ہے) حالانکہ فقہ شیعہ میں انہیں ایسے کافروں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جن کا کفر مسلّم ہے۔ اس کے باوجود موصوف لکھتے ہیں کہ شیعہ اہل بیت علیہم السلام اور دوسری چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔

یہ مسلّمہ بات ہے کہ اگر مؤلف "المنار" قبل از تحقیق فیصلہ اور بے جا تعصبات سے اجتناب کرتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ شیعہ عقائد کو خود شیعوں سے دریافت کرتے یا ان کی کتابیں پڑھتے، نہ کہ ان کے دشمنوں کی کتابوں کو اپنا مدرکِ علم و معلومات قرار دیتے، تو ان کو بخوبی معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کی باتیں ان سے منسوب کرنا نہ صرف کذب و بہتان ہے بلکہ مضحکہ خیز اور خندہ آور بھی ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے مذہب شیعہ کی پیدائش کو ایرانیوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ ایرانیوں کے شیعہ ہونے سے کئی صدیاں قبل "مذہب تشیع" عراق حجاز اور مصر میں پھیل چکا تھا۔ مدارک تاریخی اس حقیقت کے زندہ گواہ ہیں[۲]

---

[۱] مصری عالم "طٰہٰ حسین" نے اپنی کتاب "عبد اللہ بن سبا" میں اسی بات کو اپنی اس کتاب کا موضوع سخن بنایا ہے کہ یہ شخص کون تھا، چنانچہ انہوں نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ایک فرضی شخصیت ہے جسے بعض شیعوں کو بدنام کرنے کے لیے تراشا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب "عبد اللہ بن سبا" مطبوعہ مصر (مترجم)۔

[۲] علامہ ابو حاتم سہل بن عثمان سجستانی بصری نحوی (وفات ۲۰۵ھ) اپنی کتاب "الزینۃ" کی جلد سوم میں لفظ "شیعہ" کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اسلام میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی موجودگی میں سب سے پہلے جو نام ظاہر ہوا وہ نام "شیعہ" ہے پہلے یہ چار صحابیوں کا لقب تھا:

سلمان فارسی، ابو ذر غفاری، مقداد بن اسود اور عمار یاسر صفین کی جنگ ہونے تک صرف ان چاروں کو لقب "شیعہ" سے پکارا جاتا تھا۔ جب جنگ صفین برپا ہوئی

تو اس نام "شیعہ" نے تمام دوستان علی بن ابی طالب میں شہرت حاصل کر لی۔ تاسیس الشیعہ صفحہ ۲۸۲ (مترجم)

(۱) شیعوں کا ایک بڑا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قطعی فرمان پر عمل کیا ہے جو اہل سنت کے معتبر ترین مدارکوں میں بھی مذکور ہے اور وہ فرمان یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

میں تمہارے درمیان دو گراں مایہ چیزیں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے جا رہا ہوں، ان سے وابستہ رہنا کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے، خدا کی کتاب اور میری عترت [۱]

شیعوں کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے مشکلاتِ اسلامی میں اپنی پناہ گاہ ان ہستیوں کو بنایا ہے جو آئین اسلام سے سب سے زیادہ آگاہ تھیں — اور وہ اہل بیت رسول علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔ چنانچہ شیعوں نے انہی سے اپنے احکام دین اخذ کیے ہیں۔

شیعوں کی خطا یہ بھی ہے کہ وہ عقل و منطق کی پیروی کرتے ہوئے قرآن و سنت کے زیر سایہ "اجتہاد" کے دروازہ کو کھلا ہوا سمجھتے ہیں اس طرح سے انہوں نے فقہ اسلامی کو حرکت بخشی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :

اس امر کی کیا دلیل ہے کہ قرآن و سنت کو سمجھنے کی قوت کو صرف "چار افراد" میں منحصر کر دیا جائے اور ان کے علاوہ باقی تمام افراد کو ان کی پیروی کرنے پر مجبور کیا جائے ؟

کیا قرآنی خطابات کا رُخ ہر زمانے کے ایماندار افراد کی طرف نہیں ہے ؟

کیا اصحاب رسولؐ قرآن اور سنت کو سمجھنے کے لیے کچھ معین اشخاص کی پیروی کرتے تھے ؟

لہٰذا اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اسلام کو ایک پرانی اور خشک چار دیواری جس کا نام "مذاہب اربعہ" ہے، میں محصور کر دیں ؟ !

شیعوں کا گناہ یہ بھی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں :

اصحاب پیغمبرؐ کو دیگر افراد کی طرح ایمان و عمل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے، ان میں سے جن کا عمل قرآن و سنت کے مطابق ہے وہ اچھے ہیں (اور ان سے محبت کی جائے) اور وہ اصحاب جنہوں نے پیغمبرؐ کے دَور میں یا آنحضرتؐ کے وصال کے بعد کتاب و سنت کے خلاف عمل کیا ہے انہیں چھوڑ دینا چاہیئے اور محض لفظ "صحابی" کو فتنہ پروروں کے لیے ایک ڈھال نہ بنایا جائے اور معاویہ جیسے افراد کو محترم نہ سمجھا جائے وہ معاویہ جس نے تمام ضوابطِ اسلامی کو پیروں تلے روند دیا تھا اور اس نے اس امام وقت پر خروج کیا جسے تمام امتِ اسلامی کم از کم اس دَور میں امام مانتی ہے، اور اس نے بہت سے بے گناہوں کا خون بہایا تھا، یہی حال کچھ اُن اصحاب کا ہے جو دولت کی طمع میں معاویہ کے طرفدار اور اس بغاوت میں اس کے شریک کار رہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو : صحیح ترمذی ۲/ ۱۰۰ سنن بیہقی ۱/ ۱۳ و ۲/ ۱۴۸ سنن دارمی ۲/ ۴۳۱ کنزالعمال ۱/ ۱۵۴ و ۱۵۹ طبقات ابن سعد ۲/ ۲ وکتب دیگر اور صحیح مسلم ۲/ ۲۳۸ طبع لکھنؤ (مترجم)۔

ہاں شیعہ اس طرح کے گناہوں کے مرتکب بھی ہیں اور معترف بھی ہیں لیکن ذرا بتلاؤ کہ شیعوں سے زیادہ مظلوم بھی کوئی ایسی قوم ہے جس کی تاریخ اور زندگی کے درخشاں و پُر وقار پہلوؤں کو تاریک کر کے پیش کیا جائے؟ دروغ و بہتان کا ایک طومار اس کے خلاف باندھ دیا جائے؟ یہاں تک کہ اسے اتنی اجازت بھی نہ ملے کہ وہ اپنی صفائی کے طور پر عام مسلمانوں میں اپنے عقائد کی تبلیغ کر سکے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کے عقائد کو اس کے دشمنوں سے اخذ کیا جائے نہ کہ خود اس سے!

کیا وہ گروہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان (حدیث ثقلین) پر عمل پیرا ہے (جبکہ دوسروں نے اس پر عمل نہیں کیا)، تفرقہ انداز اور نفاق پرور محسوب ہوگا؟ کیا یہ مناسب ہے کہ یہ گروہ جس راہ پر جارہا ہے اس پر چلنے سے روک دیا جائے تاکہ اتحاد و اتفاق قائم ہوجائے یا ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہیے جو منزل سے بھٹک گئے ہیں؟!

(iii) علوم اسلامی کی تاریخ بتلاتی ہے کہ علوم اسلامی میں بالعموم شیعہ ہی پیشقدم تھے۔ یہاں تک کہ شیعوں کو علوم اسلامی کا موجد اور مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے[1]

علمائے شیعہ نے جو گرانقدر کتابیں علم تفسیر، تاریخ، حدیث، فقہ، اصول، رجال اور فلسفہ اسلامی میں لکھی ہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے چھپایا جاسکے۔ یہ کتابیں تمام عمومی کتاب خانوں میں موجود ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں (ہاں اس سے اہلسنت کے بعض کتب خانے مستثنیٰ ہیں جہاں عام طور پر کتبِ شیعہ کا داخلہ ممنوع ہے، حالانکہ ہم نے صدیوں سے اپنے کتب خانوں میں کتب اہل سنت کے داخلے کی عام اجازت دے رکھی ہے!) اور یہ کتابیں ہمارے دعوے کی زندہ دلیل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ تمام بیش قیمت کتابیں عظمتِ اسلامی اور تعلیماتِ اسلام کو پھیلانے کے لیے لکھی ہیں کیا یہ سب اسلام کے دشمن تھے؟

کیا کوئی ایسا دشمن تمہاری نظر میں ہے جس نے اس قدر دوستی اور محبت کی ہو؟

آیا سوائے مخلص عاشق کے کوئی ایسا شخص ہے جس نے قرآن اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اتنی اہم خدمات انجام دی ہوں؟

آخر کلام میں ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر واقعاً آپ یہ چاہتے ہیں کہ نفاق اور تفرقہ دور ہوجائے، تو آیئے بجائے تہمت تراشیوں کے، ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس طرح کی ناروا تہمتیں نہ صرف اتحاد اسلامی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی ہیں بلکہ وحدتِ اسلامی پر کاری ضرب لگاتی ہیں۔

---

[1] اس امر کے مدارک سے آگاہ ہونے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ـ تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام ـ اور کتاب ـ اصل الشیعہ و اصولہا ـ خوش قسمتی سے دونوں کتابوں کا فارسی ترجمہ ہوچکا ہے (دوسری کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ مترجم)۔

جزا بیشتر سزا کمتر!

اس کے بعد کی آیت میں اللہ کی رحمت اور اس کی وسیع جزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس کے نیکو کار بندوں کو دی جائے گی اور پچھلی آیت میں جو تہدید کی گئی ہے اس کی تکمیل اس تشویق سے کی گئی ہے۔ فرماتا ہے: جس نے بھی کوئی نیک کام کیا اسے دس گنا بدلہ ملے گا (من جآء بالحسنة فله عشر امثالها)۔

اور جس نے بھی بُرا کام کیا اسے اس سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی (ومن جآء بالسیئة فلا یجزی الا مثلها)۔

مزید تاکید کے لیے اس جملے کا بھی اضافہ کیا ہے: ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا، وہ صرف اپنے عمل بد کے برابر سزا پائیں گے (وھم لا یظلمون)۔

یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں "حسنة" اور "سیئة" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد صرف "توحید" اور "شرک" ہے یا اس سے زیادہ وسیع معنی مراد ہیں۔ اس مسئلے میں مفسرین کے مابین گفتگو ہے لیکن آیت کا ظاہر ہر قسم کے نیک عمل، نیک فکر، نیک عقیدہ یا بد عمل، بد فکر، بد عقیدہ کو اپنے دائرہ میں سموئے ہوئے ہے کیونکہ "حسنة" و "سیئة" کے معنی کو محدود کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

چند مزید نکات

۱۔ **"جآء به" سے مراد:** گزشتہ جملے کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ "جآء به" سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے نیک یا بد عمل کو اپنے ہمراہ لائے گا۔ یعنی جب بندہ عدل الٰہی کی عدالت میں آئے گا تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ خالی ہاتھ اور تنہا آئے بلکہ اپنے ساتھ صحیح عقیدہ اور نیک عمل لائے گا یا غلط عقیدہ اور عمل بد کے ساتھ آئے گا۔ یہ ہر حالت میں اس کے ساتھ ہیں، اس سے جدا نہ ہوں گے اور آخرت کی ابدی زندگی میں اس کے ساتھی اور ہمدم ہوں گے۔

قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی یہ تعبیر اسی معنی میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ سورہ ق کی آیت ۳۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

من خشی الرحمٰن بالغیب وجآء بقلب منیب۔

بہشت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کو ایمان بالغیب کے ذریعے پہچانیں اور اس سے ڈریں، اور توبہ کرنے والا دل جو احساس فرض سے بھرا ہوا ہو بروز محشر اپنے ساتھ لے کر آئیں۔

۲۔ **جزا کے مختلف درجے:** مذکورہ آیت میں ہم نے پڑھا کہ "حسنة" کی جزا دس گنا ہے حالانکہ قرآن کی بعض دوسری آیتوں میں صرف "اضعافاً کثیرة" (بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر) پر اکتفا کی گئی ہے (جیسے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۵)، نیز بعض دوسری آیتوں میں راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کا بدلہ سات سو ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بیان کیا گیا ہے جیسے (آیت ۲۶۱ سورہ بقرہ) ایک آیت میں تو اجر و جزا کو اللہ تعالےٰ نے بے حساب فرمایا

ہے ، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔

وہ لوگ جن کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی ان کو بے حساب اجر دیا جائے گا (سورۂ زمر:۱۰)

یہ بات واضح ہے کہ ان آیتوں میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے ، واقعہ یہ ہے کہ نیکو کاروں کو کم از کم جو اجر ملے گا وہ دس برابر ہوگا ، پھر اس کے بعد اہمیّتِ عمل ، درجۂ اخلاص ، اس عمل کے کرنے میں جو زحمتیں اٹھانا پڑی ہیں اور جو کوششیں اس نیک کام کے کرنے میں کی ہیں ان سب کا لحاظ کیا جائے گا اور اسی اعتبار سے اجر میں اضافہ ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بندے کا یہ اجر اتنا بڑھ جائے گا کہ حساب کتاب کی سرحد سے گزر جائے گا اور سوائے خدا کے کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کتنا ہے ۔

مثلاً انفاق (راہِ خدا میں مال خرچ کرنا) جس کی اسلام میں بہت اہمیت بیان کی گئی ہے ، اس کا اجر عمل خیر کے معمولی اجر (دس گنا) سے بڑھ گیا ہے اور "اضعافاً کثیرہ" یا "سات سو گنا" بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرار دیا گیا ہے ، اور "استقامت" (ثبات قدمی) کہ جو تمام کامیابیوں اور خوش بختیوں کی جڑ ہے اور کوئی عمل نیک اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکے گا ، اس کا اجر و ثواب بے حساب مذکور ہوا ہے ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر بعض روایات میں نیک اعمال کے لیے اجر و ثواب دس گنا سے زیادہ بیان کیا گیا ہے تو یہ مذکورہ آیت (من جآء بالحسنة فلهٗ عشر امثالها) کے مخالف نہیں ہے ۔

اسی طرح سورہ قصص کی آیت ۸۴ میں جو ہم پڑھتے ہیں :

من جآء بالحسنة فلهٗ خير منها ۔

جو عمل نیک کرے گا اسے اس سے بہتر صلہ ملے گا ۔

یہ آیت بھی مذکورہ بالا آیت سے اختلاف نہیں رکھتی کہ اس میں نسخ کا احتمال پیدا ہو ، کیونکہ لفظ "بہتر" کے ایک وسیع معنی ہیں جو (دس گنا) پر بھی صادق آتے ہیں ۔

۲۔ **ویسی ہی سزا کا مفہوم** :۔ ممکن ہے بعض افراد یہ خیال کریں کہ ماہِ رمضان کے روزہ کو عمداً ترک کرنے کا کفارہ ساٹھ روزے قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح کی دیگر سزائیں جو کئی گنا بڑھ چڑھ کر دنیا و آخرت میں مجرموں کو دی جائیں گی ، یہ مذکورہ بالا آیت (من جآء بالسيئة فلا يجزىٰ الا مثلها) کے منافی ہیں ۔

لیکن اگر ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس بات کا بھی جواب مل جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ :

مذکورہ آیت (من جآء بالسيئة ......) میں جس مساوات (برابری) کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مساوات عددی نہیں ہے بہ ایں معنی کہ اگر ایک گناہ کیا ہے تو ایک تازیانہ مارا جائے دو گناہ ہوں تو دو تازیانے ، بلکہ کیفیت عمل کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے ۔ ماہ رمضان کے ایک روزہ کو ترک کر دینا جبکہ اس کی اتنی اہمیت بیان کی

گئی ہے، اس کی سزا صرف ایک روز کا روزہ نہیں ہوگا، بلکہ روزہ چھوڑنے والا اتنے پے در پے روزے رکھے کہ وہ ماہ مبارک رمضان کے روزے کے برابر ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ ہم بعض احادیث میں پڑھتے ہیں کہ ماہ رمضان میں گناہ کرنے کا عذاب بھی عام ایام سے زیادہ ہے۔ جس طرح کہ ثواب زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ماہ رمضان میں ثواب ختم قرآن، دوسرے ایام میں ختم کرنے سے ستر گنا زیادہ ہے۔

۴۔ **نہایت لطف و کرم :۔** ایک اور جالب نظر نکتہ یہ ہے کہ آیہ بالا خداوند کریم کے نہایت لطف و کرم کو بیان کر رہی ہے جو اس نے اس بندۂ ناچیز کے حال پر کیا ہے۔

کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو کام کرنے کے تمام آلات و اوزار انسان کو دے دے، ہر طرح کی آگاہی و علم بھی اسے عطا کرے، معصوم رہبر بھی اس کی ہدایت کے لیے بھیجے، تاکہ انسان خدا داد قوت و طاقت سے اور اسی کے فرستادہ رہبروں کی رہنمائی سے کوئی نیک کام انجام دے، پھر اس کے بعد اس عمل کا دس گنا بدلہ بھی عطا کرے لیکن اس سے جو لغزشیں اور خطائیں ہوں ان پر جو سزا دے وہ برابر کی ہو، کوئی اضافہ نہ ہو، علاوہ بریں اس کے لیے راہ توبہ اور عذر خواہی بھی ہمیشہ کے لیے کھلی ہوئی ہو۔ یعنی اگر توبہ کرے تو پھر کوئی سزا نہ ملے!

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ صادق مصدق (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ؟

ان اللّٰہ تعالٰی قال الحسنة عشرا و ازید والسیئة واحدة او اغفر فالویل لمن غلبت احادہ اعشارہ۔

اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ نیک کاموں کا دس گنا بدلہ دوں گا یا اس سے زیادہ، اور بُرے کام کا ایک ہی بدلہ دوں گا یا بخش دوں گا، پس وائے ہو اس پر جس کی اکائیاں اس کی دہائیوں پر غالب آجائیں (یعنی اس کے گناہ اطاعتوں سے سوا ہو جائیں)[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۴ ص ۳۹۰

(١٦١) قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

(١٦٢) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ۙ

(١٦٣) لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○

ترجمہ

(١٦١) (اے ہمارے نبی) کہہ دیجئے: میرے رب نے مجھے راہِ راست کی ہدایت کی ہے (وہ راہِ راست جو) ایک مضبوط اور ثابت رہنے والا آئین ہے یہ اس ابراہیم کا آئین ہے جس نے اپنے ماحول کے تمام خرافاتی آئینوں سے روگردانی کی تھی اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

(١٦٢) کہہ دیجئے: میری نماز، میری تمام عبادتیں، میری زندگی، میری موت یہ سب تمام جہانوں کے پالنے والے کے لیے ہے۔

(١٦٣) اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی طرف سے مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں۔

تفسیر:

یہ میری صراطِ مستقیم ہے

یہ چند آیات، نیز دوسری آیتیں جن کا ہم اس کے بعد مطالعہ کریں گے اور جن پر سورہ «انعام» کا اختتام ہوتا ہے، ان میں فی الحقیقت ان تمام بحثوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو شرک اور بت پرستی کے بارے میں اس سورہ میں کی گئی ہیں۔ دراصل یہ سورہ توحید کی دعوت اور شرک کے مقابلے سے شروع ہوئی ہے اور اسی بحث میں اس کا اختتام بھی کیا گیا ہے۔

خدا پہلے مشرکوں اور بُت پرستوں کے عقائدِ فاسدہ اور عقل و منطق سے دور دعووں کے مقابلے میں اپنے رسولؐ کو یہ حکم دیتا ہے کہ: (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے راہِ راست، جو نزدیک ترین راہ ہے، کی ہدایت کی ہے (یہ راہ راست وہی راستہ ہے جس میں توحید و یگانہ پرستی کی دعوت اور آئینِ شرک و بُت پرستی کے مٹانے کا حکم دیا گیا ہے)، (قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ آیت اور اس سے قبل کی بہت سی آیتیں نیز بعد کی آیتیں لفظ «قُل» (یعنی کہہ دیجئے) سے شروع ہوئی ہیں۔ شاید قرآن کریم میں کوئی ایسی دوسری سورہ نہیں ہے جس میں اس لفظ کی اتنی زیادہ تکرار کی گئی ہو جتنی اس میں کی گئی ہے۔ اس سے دراصل ان شدید نزاعوں کا اندازہ ہوتا ہے جو پیغمبرِ اسلام اور مشرکوں کے درمیان وقوع پذیر ہوئے تھے۔

نیز اس تکرار لفظ «قُل» نے کافروں کے لیے ہر بہانہ تراشی کی راہ بھی بند کر دی، کیونکہ اس لفظ (قُل) کے بار بار دہرانے سے منشا یہ ہے کہ یہ تمام باتیں بحکمِ خداوندی ہیں، اس میں پیغمبرؐ کی شخصی رائے کو کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ اس آیت میں اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں اس لفظ کا ذکر اس لیے ہے کہ اصالتِ قرآن محفوظ رہے اور وہ الفاظ بعینہٖ باقی رہیں جو پیغمبرؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس کے الفاظ میں آپ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ لفظ «قل» جو آپ سے اللہ کے خطاب کو ظاہر کرتا ہے، اس تک کو باقی رکھتے تھے۔

اس کے بعد اس «صراطِ مستقیم» کی اس آیت میں اور بعد کی دو آیتوں میں توضیح کی گئی ہے۔ پہلے فرماتا ہے: یہ ایک سیدھا قانون ہے جو بہت سچا اور درست ہے، ابدی (ہمیشہ کے لیے) ہے، دین و دنیا، جسم و جان کے جملہ امور کا ذمہ دار ہے (دینا قیما)[1]

---

[1] «قیما» کے معنی سچائی اور استقامت کے ہیں، اور ممکن ہے کہ مضبوط اور ہمیشگی کے معنی میں ہو، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ امورِ دین و دنیا کے کفیل کے معنی میں ہو، اس لیے آیت کے ترجمہ میں تینوں معانی کی رعایت کی گئی ہے۔

چونکہ عرب حضرت ابراہیمؑ سے اپنا خاص ربط ظاہر کرتے تھے، بلکہ یہاں تک کہ اپنے قانون کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا قانون کہتے تھے اس لیے اللہ تعالٰی نے اس بات کا اضافہ کیا کہ: حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی قانون یہی (اسلام) ہے جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں، نہ کہ وہ قانون جس سے تم وابستہ ہو (ملة ابراهيم)۔

وہی ابراہیمؑ جس نے اپنے زمانے اور ماحول کے خرافاتی آئین سے رُوگردانی کی اور جس نے حق یعنی آئین توحید پرستی کو قبول کیا (حنیفا)۔

"حنیف" لغت میں اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جو کسی جانب میلان پیدا کرے لیکن اصطلاح قرآنی میں اسے کہتے ہیں جو باطل سے روگردانی کرکے آئینِ حق کی طرف متوجہ ہو جائے۔

یہ تعبیر گویا ان مشرکوں کا جواب ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ پیغمبرؐ نے عربوں کے آباؤ اجداد کے مذہب بُت پرستی کی مخالفت کی تھی۔ پیغمبرؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: مَیں نے جو تمہارے پرانے طریقے کو توڑا ہے اور تمہارے خرافاتی عقیدوں کو جو ٹھکرایا ہے یہ میرا ہی اقدام نہیں ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو سب کے لیے قابلِ احترام ہستی ہیں، انہوں نے بھی ایسا کیا تھا۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: وہ کسی وقت بھی مشرکوں اور بُت پرستوں کے گروہ میں سے نہ تھے (وما کان من المشرکین)۔

بلکہ وہ تو ایک بُت شکن انسان تھے اور آئینِ شرک کو توڑنے والے تھے۔

جملہ "حنیفا وما کان من المشرکین" کی آیاتِ قرآن میں تکرار، کبھی "مسلما" کے ساتھ اور کبھی اس کے بغیر اسی مسئلے کی تاکید کے لیے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ مقدس، جس پر زمانہ جاہلیت کے عرب فخر کیا کرتے تھے، ان کے غلط عقائد و اعمال سے منزّہ تھے [1]

بعد کی آیت میں خدا تعالٰی فرماتا ہے: نہ صرف عقیدہ کی رُو سے مَیں موحد اور یکتا پرست ہوں، بلکہ میرا ہر عمل بھی اسی کے لیے ہے۔ میری نماز، میری تمام عبادتیں، یہاں تک کہ میری موت و حیات سب پروردگار عالم کے لیے ہے۔ اسی کے لیے زندہ ہوں اور اسی کے لیے جان دوں گا۔ اسی کے راستے میں جو کچھ بھی میرے پاس ہے قربان کردوں گا۔ میری امیدوں کی آماجگاہ، میرے عشق کی منزل، میری ہستی کا مقصد سب کچھ وہی ہے (قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین)۔

"نسک" کے اصلی معنی عبادت کے ہیں۔ اسی بنا پر عبادت کرنے والے کو "ناسک" کہتے ہیں لیکن یہ لفظ عام طور سے اعمالِ حج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مناسکِ حج، اسی حوالے سے کہا جاتا ہے۔ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "نسک" کے معنی یہاں پر شاید قربانی کے ہوں لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں ہر قسم کی عبادت شامل ہے کیونکہ پہلے نماز (صلوٰة) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو تمام عبادتوں میں اہمیت رکھتی ہے اس

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۳۵، سورہ آلِ عمران آیت ۶۷، ۹۵۔

کے بعد تمام عبادتوں کا بطور عموم ذکر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری نماز بلکہ تمام عبادتیں، میری زندگی اور موت سب کچھ اس (اللہ) کے لیے ہے۔

بعد والی آیت میں مزید تاکید کے لیے اور ہر طرح کے شرک اور بت پرستی کے ابطال کے لیے اضافہ فرماتا ہے "وہ ایسا پروردگار ہے کہ اس کا نہ کوئی شبیہ (مثل) ہے اور نہ شریک ہے" (لا شریک لہ)۔

آخر میں فرماتا ہے: "اس بات کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور میں پہلا مسلمان ہوں" (وبذالک امرت وانا اول المسلمین)۔

پیغمبرؐ کے "اوّل مسلمین" ہونے کے کیا معنی ہیں؟

آیہ مذکورہ بالا میں پیغمبرؐ کو "اوّل المسلمین" (پہلا مسلمان) کہا گیا ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر "اسلام" کا مطلب اس کے وسیع معنی میں ہو تو یہ معنی تمام آسمانی ادیان پر محیط ہے۔ اسی وجہ سے لفظ "مسلم" انبیائے ماسبق پر بھی بولا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ کے لیے ہم پڑھتے ہیں:۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

"مجھے حکم دیا گیا کہ میں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں" (یونس - ۷۲)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں بھی ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ

خداوندا ہم کو اپنا مسلمان بنا دے (بقرہ - ۱۲۸)

اور حضرت یوسفؑ کے لیے آیا ہے:

"تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا"

"مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں موت دے" (یوسف - ۱۰۱)

اسی طرح دیگر انبیاء کے لیے بھی آیا ہے۔

یقیناً "مسلم" کے معنی اس شخص کے ہیں جو فرمانِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ یہ معنی تمام انبیاء الٰہی اور ان کی امتوں کے مومن افراد پر صادق آتے ہیں۔ اس صورت میں پیغمبرؐ کے اوّل مسلم ہونے کے معنی یا تو ان کے اسلام کی اہمیت، کیفیت کے لحاظ سے ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام و تسلیم کا درجہ سب سے بلند تھا، یا یہ معنی ہوں گے کہ آپؐ اس امت کے وہ پہلے فرد تھے جس نے آئینِ قرآن و اسلام کو قبول کیا ہے[1]

---

[1] نظر حقیر میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "اوّل مسلم" ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، کیونکہ یہ جب صحیح ہوگا جب آپؐ وقت ولادت یا اس کے بعد اسلام سے خالی ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب آپؐ پیدا ہوئے اس وقت نہ صرف مسلمان تھے بلکہ نبی بھی تھے کیونکہ ارشادِ پیغمبرؐ ہے:۔ (باقی صفحہ اگلے پر)

بعض روایات میں بھی وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ وہ پہلے شخص ہیں جس نے عالم ارواح میں، جبکہ پروردگارِ عالم نے اپنی طرف بلایا اور اپنی الوہیت کے متعلق سوال کیا تو مثبت جواب دیا۔[1]

بہرحال آیت مذکورہ بالا روح اسلام اور حقیقتِ تعلیمات اسلامی کو واضح کر رہی ہے۔ یہ آیت دعوت ہے صراطِ مستقیم کی طرف، حضرت ابراہیمؑ کے آئین بُت شکنی کی جانب اور ہر قسم کے شرک اور دوگانہ و چندگانہ کی نفی کی طرف۔ یہ عقیدہ اور ایمان کی رُو سے تھا۔

لیکن از روئے عمل، تو یہ آیت دعوت ہے اخلاص و خلوصِ نیّت کی طرف اور اس کی طرف کہ بندے کو چاہیئے کہ اپنا ہر عمل خدائے وحدہٗ لاشریک کے لیے بجا لائے، اس کا زندہ رہنا اور مرنا اس کے لیے ہو، جس چیز کو چاہے اس کے لیے چاہے، اپنے دل کو اسی کی محبت کے ساتھ باندھے اور اس کے غیر کی محبت سے الگ کر دے، اس کے ساتھ عشق کرے اور اس کے غیر سے بیزاری اختیار کرے۔

غور کرنا چاہیئے کہ کتنا فرق ہے اسلام کی اس کھلی ہوئی تعلیم میں اور ان مسلمان نما انسانوں کے اعمال میں جو بجز تظاہر وجود نمائی کے اور کوئی بات سمجھتے ہیں نہ جانتے ہیں، ہر مرحلہ میں بس ظاہر کے متعلق سوچتے ہیں، باطن و جوہر کی جانب انہیں کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی، ان کی جماعت بندیاں' ان کا فخر ان کی آزادی کے دعوے بھی سوائے ایک خول کے اور کچھ نہیں ہے۔

بقیہ: پچھلے صفحے کا حاشیہ:۔

"کنت نبیاً و آدم بین الماۤء والطین":

میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ آب و گِل کے درمیان کروٹ لے رہے تھے۔

یہ حدیث اس مطلب پر دلالت کرتی ہے، جو سنّی شیعہ دونوں کی کتب میں محفوظ ہے اس کے علاوہ عالم ذر میں بھی آپؐ ہی نے سب سے پہلے وحدانیت کی تصدیق کی تھی جیسا کہ آگے آنے والی روایت سے ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا اس معنی سے بھی آپؐ "اوّل مسلم" ہیں۔ (مترجم)

[1] تفسیر صافی آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

(۱۶۴) قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِىْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۶۴) (اے ہمارے رسولؐ!) کہہ دو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پروردگار مان لوں جبکہ وہ تمام چیزوں کا پروردگار ہے اور کوئی شخص عمل بجا نہیں لاتا ہے سوائے اس کے کہ (جو کچھ کرتا ہے اپنے لیے کرتا ہے، اور کوئی گنہگار دوسرے کے گناہ اپنے ذمہ نہیں لے گا۔ اس کے بعد تمہاری واپسی تمہارے پروردگار کی جانب ہے پس وہ تمہیں اس چیز کی خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر

اس سورہ میں توحید اور شرک سے مقابلہ کرنے کے بارے میں جو پے در پے تاکیدیں اور طرح طرح کے استدلال بیان کیے گئے ہیں وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

اس آیت میں ایک اور طریقے سے مشرکوں کے استدلال پر ضرب لگائی گئی ہے، فرماتا ہے: ان سے کہو اور ان سے دریافت کرو کہ آیا یہ مناسب ہے کہ خدائے یگانہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا پروردگار مانوں جبکہ وہ تمام چیزوں کا مالک اور پروردگار ہے اور اس کا حکم و فرمان اس جہان کے ذرہ ذرہ پر کار فرما ہے (قل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شیئ)۔

اس کے بعد ان مشرکوں کو جواب دیتا ہے جن میں سے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ کہا :

- اتبعنا وعلینا وزرك ان كان خطأ :

اے محمدؐ ! آپ ہماری پیروی کریں اگر یہ غلط بھی ہو تب بھی آپ کا گناہ ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں ۔

اللہ فرماتا ہے کہ اے نبی ان سے کہہ دو :-

کوئی شخص سوائے اپنے کسی کے لیے کوئی عمل بجا نہیں لاتا اور نہ کوئی گنہگار دوسرے کے گناہ کا بار اپنے دوش پر اٹھاتا ہے (ولا تكسب كل نفس الا عليها ولا تزر وازرة وزر اخرٰی) ۔

اور آخرکار تم سب خدا کی طرف لوٹو گے ، وہ تمہیں اس چیز کے بارے میں مطلع کرے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے (ثم الی ربكم مرجعكم فينبئكم بما كنتم فيه تختلفون) ۔

(۲) دوہم نکات

دوسروں کے گناہ اپنے کندھے لینا :- ۱ - ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ آیت مذکورہ بالا میں جو دو مسلم الثبوت اور منطقی قانون بیان کیے گئے ہیں ، جو تمام مذہبوں کے نزدیک بھی طے شدہ ہیں (یعنی کوئی شخص سوائے اپنے کسی کے لیے کارِ آخرت نہیں کرتا اور کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کاندھے پر نہیں اٹھاتا) یہ دونوں اصول قرآن کریم کی بعض دیگر آیات اور بعض روایات سے مطابقت نہیں رکھتے ۔ مثلاً سورہ نحل کی آیت ۲۵ میں ہے :-

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ

وہ لوگ بروزِ قیامت اپنے گناہوں کے بھاری بوجھ کو اپنے کاندھے پر اٹھائیں گے ، اسی طرح ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جنہیں انہوں نے اپنے جہل سے گمراہ کیا ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بارِ گناہ نہیں اٹھائے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ گمراہ کرنے والے ان لوگوں کا بارِ گناہ اٹھائیں گے جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہے ۔

اس کے علاوہ احادیث " سنت حسنہ " و " سنت سیئہ " بھی آیت زیرِ بحث سے مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ شیعہ سُنّی دونوں طریقوں سے بعض روایات وارد ہوئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا :-

اگر کسی شخص نے اچھی سنت قائم کی اسے ان تمام لوگوں کا اجر دیا جائے گا جو اس پر چلیں گے (بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے) اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی سنت جاری کی اس کے نام ان لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے (بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے گناہوں میں سے کچھ کم کیا جائے گا) ۔

روایت کا متن یہ ہے :۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم : من سن سنۃ حسنۃ کان لہ اجر من عمل بھا من غیر ان ینقص من اجورھم شئی و من سن سنۃ سیئۃ کان علیہ وزر من عمل بھا من غیر ان ینقص من اوزارھم شئی ۔

لیکن اس شبہ کا جواب واضح ہے ، کیونکہ آیہ مورد بحث کہتی ہے کہ بغیر کسی وجہ کے اور بغیر اس کے کہ دو گناہوں میں آپس میں کوئی ربط ہو ایک شخص کا گناہ دوسرے شخص کے ذمہ نہیں لگایا جائے گا لیکن وہ آیات و روایات جن کی طرف اشارہ کیا گیا ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کے عمل نیک یا عمل بد کی داغ بیل ڈالے گا ، یا یوں کہنا چاہیئے کہ دوسرے کے عمل میں سببی طور سے شریک ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس عمل کے نتائج خوب و بد میں بھی شریک ہوگا کیونکہ وہ عمل اس کا عمل متصور ہوگا ، کیونکہ اس نے اس عمل کی بنیاد رکھی ہے ۔

۲۔ **کیا دوسروں کے اعمال نیک ہمارے لیے مفید ہوسکتے ہیں ؟** :۔ دوسرا خیال آیہ مورد بحث سے یہ آسکتا ہے کہ یہ آیت کہتی ہے کہ ہر شخص کا عمل صرف اس کے لیے فائدہ بخش ہوگا ، اس بنا پر وہ کارہائے خیر جو کسی کی نیابت میں کیے جاتے ہیں یا اموات کے لیے جو ثواب ہدیہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات زندہ شخص کے لیے بھی ثواب کا ہدیہ کرتے ہیں ، یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ دوسرے شخص کے لیے مفید ہو ، حالانکہ کثیر روایات میں شیعہ اور سُنی دونوں طریقوں سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا آئمہ طاہرین علیہم السلام سے وارد ہوا ہے کہ اس طرح کے اعمال مفید و سود مند ہوتے ہیں ، نہ صرف اولاد کا عمل والدین کیلئے بلکہ دوسروں کے لیے بھی فائدہ بخش ہیں ۔

علاوہ بریں ، ہمیں معلوم ہے کہ پاداش عمل کا تعلق ان اثرات سے ہے جو کسی کار خیر کے کرنے کی وجہ سے اس شخص کی روح و جان پر مرتب ہوتے ہیں ، جو اس کی معنوی ترقی میں مؤثر ہوتے ہیں ، اس کے برخلاف وہ شخص جس نے کوئی عمل خیر انجام نہیں دیا ۔ حتیٰ کہ اس کے ابتدائی امور میں بھی شریک نہیں ہوا ، کیسے ممکن ہے کہ وہ یہ روحانی و معنوی اثرات حاصل کر سکے ؟

بعض لوگ یہ اعتراض بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں ، نہ صرف عام افراد بلکہ مؤلفین اور مفسرین بھی اس اعتراض سے متاثر نظر آتے ہیں جیسے تفسیر ، المنار ، لکھنے والے ، جس کے نتیجے میں بہت سی مسلم الثبوت احادیث انہوں نے نذر طاق نسیاں کر دی ہیں ۔ لیکن اگر دو نکتوں کی طرف توجہ کی جائے تو ایسے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے ، اور وہ یہ ہیں :۔

۱۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کا عمل نیک اس کی معنوی ترقی کا سبب بنتا ہے ، اور اس کا فلسفہ ، نتیجہ اور اثر واقعی ہوگا وہ اس کے کرنے والے کی طرف عائد ہوگا ، جیسا کہ ورزشی حرکات ، یا تعلیم و تربیت کا نتیجہ ۔ قوت اور اخلاقی نشو و نما کی صورت میں اس کے جسم اور روح پر ہوتا ہے ۔

لیکن جس وقت کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کوئی نیک کام بجا لاتا ہے، وہ یقیناً کسی ایسی خصوصیت یا نیک صفت کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس میں ہوتی ہے، یا تو وہ ایک اچھا مربی تھا یا ایک اچھا شاگرد تھا یا وہ ایک باصفا دوست تھا یا وہ ایک باوفا ہمسایہ تھا یا وہ ایک خدمت کرنے والا عالم تھا اور یا ایک مومن حقیقی۔ ہر صورت میں اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی روشنی کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی اور انہوں نے اس کے لیے اعمالِ خیر انجام دیئے۔ اس بنا پر اس شخص نے اپنی اس خصوصیت، نمایاں صفت اور اپنی زندگی کے اس درخشاں پہلو کا بدلہ پایا ہے اور اس طرح سے بالعموم دوسرے افراد کا عمل خیر اس کے لیے بھی اس کے کسی عمل خیر یا نیت نیک کے نتیجہ میں واقع ہوا ہے، جو فی الحقیقت خود اس کے عمل کا ایک پرتو ہے۔

۲۔ خداوند عالم اپنے بندوں کو جو پاداش دیتا ہے وہ دو طرح کی ہوتی ہے:

ایک وہ پاداش جو اُن کے روحانی ارتقاء اور ان کی اخلاقی شائستگی کے مطابق ہوتی ہے۔ یعنی ان کے اعمالِ نیک کی وجہ سے ان کی روح و جان اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ بہتر و بالا جہانوں میں زندگی بسر کریں اور اپنے ان پروں کے ذریعے جو انہوں نے اپنے نیک عقیدے اور نیک اعمال کے ذریعے حاصل کیے ہیں، آسمانِ سعادت کی بلندیوں میں پرواز کریں۔ یہ بات طے ہے کہ اس طرح کے آثار و نتائج اسی عمل کے بجا لانے والے کے ساتھ مخصوص و معین ہیں اور یہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں کسی دوسرے کو بخش دیا جائے۔

لیکن چونکہ ہر عمل نیک فرمانِ خدا کی اطاعت کے نتیجے میں واقع ہوتا ہے اور اطاعت کرنے والا شخص اپنی اطاعت کے مقابلے میں جزا کا مستحق ہوتا ہے لہٰذا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اس جزا اور انعام کو اپنی رضا مندی سے کسی دوسرے کو بخش دے۔

اس کی ایک مثال بالکل اس طرح سے متصور ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک استاد کسی اہم اور تعمیری شعبۂ تعلیم میں کسی یونیورسٹی میں درس دیتا ہے، بلاشبہ وہ اپنی اس تدریس کے نتیجے میں دو طرح کے فائدے حاصل کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ روزانہ تدریس کرنے کی وجہ سے اپنے فن میں کامل سے کامل تر ہوتا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ اس یونیورسٹی سے تنخواہ بھی پاتا ہے۔ پہلا فائدہ وہ یقیناً کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا کیونکہ وہ اسی کی ذات سے مخصوص ہے، لیکن دوسرا فائدہ وہ جسے چاہے بخش دے اسے یقیناً اس بات کا اختیار ہے۔

کسی عمل کا ثواب بھی کسی مردہ یا زندہ شخص کو ہدیہ کرنا اسی طرح سے ہے۔ اس طرح ہر طرح کا شک و شبہ جو اس قسم کی احادیث کے بارے میں ہے دُور ہو جاتا ہے۔

تاہم اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ اس طرح کے ثواب جو بعض افراد کو دیئے جاتے ہیں ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ یہ ان کی کامل سعادت کا سبب بن سکیں، بلکہ ان کا اثر تھوڑا ہوتا ہے، کیونکہ نجات انسانی کا اصلی سبب خود اس کا ایمان و عمل ہے۔

(۱۶۵) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

ترجمہ

(۱۶۵) وہ (خدا) وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر جانشین (اور اپنا نمائندہ) بنایا اور بعض افراد کو دوسرے افراد پر مرتبوں کی رُو سے برتری عطا کی، تاکہ تمہیں ان چیزوں سے جو تمہارے اختیار میں دی ہیں، آزمائے۔ یقیناً تمہارا پروردگار بہت تیز حساب کرنے والا، بخشنے والا اور مہربان ہے (جو لوگ اپنے امتحان میں ناکامیاب ہوں گے ان کا حساب کتاب جلد کرے گا اور جن لوگوں نے راہِ حق پر قدم اٹھایا ہے ان کے حق میں مہربان ہوگا)۔

تفسیر

اس آیہ کریمہ میں جو سورۂ انعام کی آخری آیت ہے مقامِ انسانی کی اہمیت اور جہانِ ہستی میں اس کی حیثیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان گزشتہ بحثوں کی تکمیل ہو جائے جن میں توحید کے ستونوں کو استوار کیا گیا ہے اور مسلکِ شرک و بُت پرستی سے مقابلہ کیا گیا ہے، یعنی انسان بہ حیثیت اشرف المخلوقات اپنی حقیقی قدر و قیمت پہچان لے تاکہ پتھر، لکڑی اور دیگر طرح طرح کے بتوں کے سامنے اپنی پیشانی نہ جھکائے اور ان کا بندہ نہ بنے بلکہ ان کا امیر بنے اور ان پر حکومت کرے۔

لہٰذا اس آیت کے پہلے جملے میں فرماتا ہے: وہ خدا وہ ہے جس نے تمہیں زمین پر جانشین (اور اپنا

نمائندہ) بنایا ہے (وھوالذی جعلکم خلآئف الارض)[1]

وہ انسان، جو روئے زمین پر خدا کا نمائندہ ہے[2] جس کے ہاتھ میں اس کرۂ زمین کی تمام قوتیں اور خزانے سونپ دیئے گئے ہیں اور خدا کی طرف سے تمام موجودات پر اس کی حکومت کا فرمان صادر ہوا ہے، اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے کو اتنا گرا دے کہ جمادات سے بھی پست ہو جائے اور انہیں سجدہ کرنے لگے۔

اس کے بعد خدا اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے انسانوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں اور یہ کہ اس اختلاف کی کیا مصلحت ہے، فرماتا ہے: تم میں سے بعض کو بعض پر برتری دی تاکہ ان قدرتی عنایتوں اور سہولتوں کی وجہ سے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں وہ تمہیں آزمائے (ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم)۔

اس آیت کے آخر میں یہ کہہ کر کہ ہر انسان کو خوش قسمتی اور بدبختی کے راستے کے انتخاب میں اختیار دیا گیا ہے، ان آزمائشوں کا نتیجہ اس طرح بیان فرمایا ہے: "تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لیے جو ان آزمائشوں سے

---

[1] جیسا کہ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ "خلائف" "خلیفہ" کی جمع ہے اور "خلفاء" "خلیف" کی جمع ہے اور دونوں کے معنی نمائندہ اور جانشین کے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "خلیفہ" میں جو "ۃ" ہے وہ مبالغہ کے لیے ہے۔ بعض دیگر اہل لغت نے "خلائف" کو "خلیفہ" اور "خلیف" دونوں کی جمع مانا ہے۔

[2] یہاں پر لفظ "خلائف" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول تو وہی ہے جو اوپر متن میں گزرا ہے یعنی اللہ نے عام انسانوں کو زمین پر اپنا نمائندہ (خلیفہ) بنایا ہے۔ لیکن نظر حقیر میں یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ "خلیفۃ اللہ" غیر معصوم کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت آدم کے لیے فرمایا: "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" حضرت داؤد کے لیے فرمایا گیا "یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" اسی طرح سارے انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے اور معصوم تھے۔ اگر عام بشر کو اللہ کا خلیفہ مان لیا جائے تو نبی اور غیر نبی میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ پھر اگر تمام بشر سب کے سب خلیفہ ہو جائیں تو ان کی حکومت کس پر ہوگی؟ کیا حیوانوں، درختوں اور پتھروں پر؟ حالانکہ یہ چیزیں انسان کی کاملاً مطیع نہیں ہیں۔

دوسرا قول (جو قواعد تحقیق سے مطابقت رکھتا ہے) یہ ہے کہ "خلائف الارض" سے مراد یہ ہے کہ ہر آئندہ انسان پچھلے انسان کا اور ہر آنے والی قوم گزشتہ قوم کی خلیفہ ہے، کیونکہ "خلف" کے اصلی معنی "پیچھے" کے ہیں۔ علامہ طبرسی اپنی مشہور تفسیر "مجمع البیان" میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"معناہ ان اھل کل عصر یخلف اھل العصر الذی قبلہ کلما مضیٰ قرن خلفھم قرن یجری ذلک علی النظام والاتساق حتیٰ تقوم الساعۃ وھذا لا یکون الا من عالم مدبر"

یعنی ہر عصر کے لوگ گذشتہ اہل عصر کے پیچھے آتے ہیں۔ جب ایک صدی گزر جاتی ہے دوسری صدی آجاتی ہے۔ یہ عمل بڑی خوش اسلوبی سے منظم طریقہ سے جاری و ساری ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا الا یہ کہ اس نظام کے پس پردہ ایک عالم اور مدبر (انتظام کرنے والی) ہستی موجود ہو۔

نیز ایسا ہی تفسیر صافی میں بھی ہے۔ (مترجم)

سیاہ رو اور ناکام نکلیں گے سریع العقاب (جلدی سزا دینے والا) ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اپنی غلطیوں کی اصلاح میں لگے رہتے ہیں، بخشنے والا اور مہربان ہے (ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم)۔

انسانوں میں فرق — اور عدالت کے تقاضے

اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں کہ انسانوں کے درمیان کچھ ایسے درجاتی اختلاف بھی موجود ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ انسانوں نے دوسرے انسانوں پر ستم روا رکھا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ بے حساب ثروت کے مالک ہیں جبکہ کچھ لوگ خاک نشین ہیں۔ کچھ لوگ ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے جاہل اور بے علم رہ گئے ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگ ذرائع ہونے کی وجہ سے علوم کے آخری درجوں پر فائز ہیں۔ اسی طرح ایک طبقہ وہ ہے جو خوراک کی کمی کے باعث اور حفظان صحت کے لوازم نہ ہونے کی وجہ سے علیل و بیمار نظر آتا ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف ایک طبقہ وہ ہے جس کے پاس ہر طرح کے وسائل موجود ہیں اس لیے وہ تندرستی اور سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے

اس طرح کے فرق، دولت و فقر، علم و جہل، تندرستی اور بیماری زیادہ تر استعمار و استحصال، دوسروں کو غلام بنانے اور آشکار و پنہاں ظلم کی پیداوار ہیں۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اس طرح کے اختلافات کو خدا کے ذمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا، نہ اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس طرح کے اختلافات کو جائز ٹھہرا کر ان کی مخالفت نہ کی جائے۔

لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانوں کے درمیان جتنا بھی اصول عدالت کی مراعات کی جائے پھر بھی سب انسان آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ استعداد، ہوش و ذہانت اور ذوق و سلیقہ کی رُو سے فرق باقی رہے گا یہاں تک کہ کم از کم وہ اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے یکساں نہ ہوں گے۔

لہٰذا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے فکری اختلافات عدالت الٰہی کے خلاف ہیں؟ یا اس کے برخلاف حقیقی عدالت (یعنی ہر چیز کو اس کی جگہ رکھنے) کا تقاضا یہی ہے کہ تمام انسان برابر نہ ہوں؟

اگر انسانی معاشرے کے تمام افراد بالکل یکساں اور برابر ہوں، جیسے کپڑے یا برتن جو ایک کارخانے سے بن کر نکلتے ہیں اور یکساں ہوتے ہیں اسی طرح تمام انسان بھی ایک شکل کے، ایک استعداد کے بالکل مساوی ہوتے تو انسانی معاشرہ بالکل مردہ اور روح سے خالی ہو کر رہ جاتا۔ اس میں کسی طرح کی حرکت ہوتی اور نہ ترقی کی راہوں پر پیش قدمی نظر آتی۔

ایک پودے کی طرف نظر کیجئے، جس کی جڑیں تو مضبوط اور سخت ہوتی ہیں، مگر اس کا تنا لطیف ہوتا ہے لیکن ٹہنیوں کی نسبت سخت ہوتا ہے، پھر اس کے بعد پتے، پھول، شگوفے بالترتیب لطیف سے لطیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان سب نے اپنے باہمی تعاون اور اجتماع سے ایک خوبصورت پودے کو جنم دیا ہے ان میں سے ہر ایک کے خلیے اپنے فرائض کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف اور مصروف عمل ہیں۔

بالکل یہی حال دنیائے انسانیت میں نظر آتا ہے۔ افرادِ انسانی بھی باہم مل کر ایک عظیم الشان اور بار آور درخت کی مانند ہیں جس میں ہر طبقے بلکہ ہر فرد کا اس درخت کو تشکیل دینے میں ایک خاص مقام ہے جو اس کی ساخت کے مطابق ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ یہ اختلافات تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں جیسا کہ سابقاً بھی ہم نے کہا کہ خدائی منصوبوں میں جہاں بھی لفظ "آزمائش" استعمال ہوا ہے اس کے معنی "ترتیب و پرورش" کے ہیں اور اس طرح اس شخص کا جواب مل جاتا ہے جو مذکورہ آیت سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کرنا چاہے۔

زمین پر انسانی خلافت

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے کئی بار انسان کو زمین پر بطور اپنے "خلیفہ" اور "نمائندہ" کے تعارف کروایا۔ اس تعبیر کے ذریعے جہاں ضمنی طور پر مقام کو واضح کرنا مقصود ہے وہاں اس حقیقت کا بھی اظہار مقصود ہے کہ اموال و ثروتیں، استعدادیں اور وہ تمام انعامات اور عطیے جو خدا نے انسان کو دیئے ہیں ان سب کا مالکِ اصلی خدا ہے اور انسان ان سب پر اللہ کی طرف سے صرف نمائندہ، مجاز اور اجازت یافتہ ہے اور یہ بات بدیہی و بالکل واضح ہے کہ کوئی نمائندہ اپنے تصرفات میں مستقل نہیں ہوا کرتا، بلکہ اس کے تمام تصرفات مالکِ اصلی کی اجازت کے دائرے اور حدود میں ہونا چاہئیں۔

یہیں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مثلاً مسئلہ مالکیتِ اشیاء میں اسلام نے "کیپٹل ازم" (سرمایہ داری) اور "کمیونزم" دونوں راستوں سے دوری اختیار کی ہے کیونکہ اوّل الذکر نے مالکیت کو فرد کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے جبکہ دوسرے نے تمام مالکیت کو اجتماع کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ مالکیت نہ تو کسی فرد کی ہے اور نہ اجتماع کی، بلکہ فی الحقیقت ہر چیز کا مالک اصلی خدا ہے۔

تمام انسان اس کے نمائندے اور وکیل ہیں اور اسی دلیل کی بناء پر اسلام انسان کی آمدنی اور خرچ دونوں کے طریقوں اور کیفیات میں نظارت و نگہبانی کا فرض ادا کرتا ہے اور دونوں کے لیے اس نے حدود و شرائط مقرر کر دی ہیں جن کی بناء پر اقتصادِ اسلامی کو اس نے بطور ایک خاص نظام کے تمام دیگر مکاتبِ فکر سے الگ کر کے نمایاں کر دیا ہے۔

سورۃ اعراف

◎

یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے، سوائے ایک آیت کے جس کی ابتدا "**واسئلهم عن القرية**" اور انتہا "**بما كانوا يفسقون**" ہے، صرف یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی۔

اس سورہ کی آیتوں کی تعداد ۲۰۶، اور بعض کے نزدیک ۲۰۵ ہے

اس سورہ پر ایک طائرانہ نظر

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اکثر قرآنی سورتیں (۸۰ سے لے کر ۹۰ سورتوں تک) مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہیں، اگر مکہ کے اس وقت کے ماحول، ان تیرہ سالوں میں وہاں کے مسلمانوں کی حالت، اسی طرح تاریخ اسلام بعد از ہجرت پر نظر ڈالی جائے تو خوب اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ مکی سورتوں کا لہجہ اور اندازِ سخن مدنی سورتوں سے کس لیے مختلف ہے۔

مکی سورتوں میں جو چیزیں زیادہ تر بحث میں آئی ہیں وہ یہ ہیں:

مبداء و معاد (ابتدائے آفرینش اور قیامت)، اثباتِ توحید، قیامت کے روز عدالتِ الٰہی، شرک اور بُت پرستی سے مقابلے اور دنیائے آفرینش میں مقامِ انسانی کو استوار کرنا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کو عقیدہ اور تقویت مبانیٔ ایمان کی رُو سے سنوارنا منظور تھا تاکہ یہ تعلیمات ایک مستحکم اُٹھان کی جڑ بن سکیں۔

دورانِ مکہ میں پیغمبرِ اسلامؐ کے ذمہ یہ فرض تھا کہ بُت پرستوں کے خرافاتی افکار کو ان کے ذہنوں سے دھوئیں اور اس کی جگہ روحِ توحید، خدا پرستی اور احساسِ فرائض کے موتی پرو دیں۔

ان انسانوں کو جن کی دورانِ بُت پرستی میں تحقیر کی گئی ہے اور انہوں نے زندگی کی دوڑ میں شکست کھائی ہے انہیں ان کے حقیقی مقام و منزلت سے آگاہ کریں، جس کے نتیجے میں اس پست و بدکار اور خرافاتی و منفی قوم سے ایک ایسی قوم جنم دیں جو باوقار، باعزم، باایمان اور مثبت ہو۔ مدینہ میں اسلام کی تیز اور برق آسا ترقی کا بھی یہی راز تھا کہ اسلام کی وہ بنیاد بہت مستحکم تھی جو مکہ میں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں رکھی گئی تھی۔

سورہ ہائے مکی کی آیتیں بھی اسی نظریے سے میل کھاتی ہیں۔

لیکن "دوران مدینہ" ایک ایسا دور تھا جس میں حکومت اسلامی، دشمنوں کے مقابلے میں جہاد، ایک سالم و صحیح ماحول جو نوع بشر کی واقعی قدر و قیمت پر استوار ہو اور عدالتِ اجتماعی کی تشکیل کی گئی تھی۔ لہٰذا مدنی سورتوں کی اکثر آیتوں میں مسائل و حقوق، اخلاق، اقتصاد، تعزیرات کے جزئیات اور تمام فردی و اجتماعی ضروریات و لوازم کو بیان کیا گیا ہے۔

آج کل کا مسلمان یہ چاہتا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرے تو اسے چاہیئے کہ اسی لائحہ عمل کا حرف بحرف عملی طور سے اجراء کرے۔ اور ان دونوں ادوار کو بطور کامل طے کرے۔ تا وقتیکہ عقیدہ کی بنیاد مستحکم و

قوی نہ ہو اس کے اوپر ٹھہرنے والے مسائل استقامت اور مضبوطی کے حامل نہ ہوں گے۔

بہرحال، چونکہ سورۂ اعراف میں اس بنا پر مکّی سورہ ہونے کے حوالے سے جو خصوصیات ہونا چاہئیں اس میں جھلک رہی ہیں۔

لہٰذا اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ:

شروع میں ایک مختصر لیکن مضبوط اشارہ مسئلہ مبدأ و معاد کی طرف کیا گیا ہے۔ بعد ازاں شخصیت انسانی کو حیاتِ ثانیہ دینے کے لیے حضرت آدمؑ کی خلقت کے واقعہ کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اللہ نے ان عہدوں کو ایک ایک کر کے گنوایا ہے جو اس نے اولادِ آدم سے راہِ راست پر چلنے کے سلسلہ میں لیے ہیں۔

اس کے بعد ان قوموں کی ناکامی و شکست دکھلانے کے لیے جو توحید و عدالت و پرہیزگاری کے راستہ سے ہٹ گئیں، نیز ان قوموں کی کامیابی دکھلانے کے لیے جنہوں نے ایمان کا جادہ کسی حال میں نہیں چھوڑا، بہت سی گزشتہ قوموں اور انبیاء سابقین مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی سرگذشتیں بیان کی ہیں۔ پھر بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ و فرعون کے مقابلے کو تفصیلاً بیان کر کے اس بحث کا خاتمہ کیا ہے۔

اس سورہ کے آخر میں دوبارہ مسئلہ مبداء و معاد کا ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح اس سورہ کے انجام کو اس کے آغاز سے ملا دیا گیا ہے۔

اس سورہ کی اہمیت

تفسیر عیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

جو شخص سورۂ اعراف کو مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ پڑھے گا وہ بروزِ قیامت ان لوگوں میں سے ہوگا جنہیں کوئی خوف ہوگا نہ غم، (من الذین لا خوف علیهم ولا هم یحزنون) اور اگر اسے اللہ یہ توفیق دے کہ وہ سورہ اعراف کو ہر جمعہ کو پڑھے، تو وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں محشور ہوگا جو بغیر کسی حساب کتاب کے جنّت میں داخل ہو جائیں گے۔

نیز حضرتؑ نے فرمایا کہ اس سورہ میں کچھ آیات محکمہ ہیں جن کا پڑھنا، تلاوت کرنا اور ان پر عمل کرنا کبھی نہ بھولنا، کیونکہ یہ آیات بروزِ محشر خدائے ذوالجلال کی پیشی میں اپنے پڑھنے والے کی گواہی دیں گی[1]

روایت مذکورہ سے جو نکتہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جن روایات میں سورتوں کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی سورۃ کا پڑھ لینا اتنے بڑے نتائج و آثار کا سبب بنے گا بلکہ جو چیز اس قرأت کو روح بخشنے والی ہے وہ اس سورہ کے مضمون و مطالب پر ایمان کا رکھنا ہے اور اس کے بعد اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ اسی بنا پر روایات مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں:

---

[1] تفسیر برہان جلد دوم صفحہ ۲ و نور الثقلین جلد دوم صفحہ ۲۔

قرائتها وتلاوتها والقیام بها۔

نیز اسی روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ فرمایا:

جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا قیامت میں وہ ۔ الذین لا خوف علیهم ولا هم یحزنون ۔ کا مصداق بنے گا۔ اور یہ درحقیقت اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۵ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جس میں خدا نے فرمایا ہے:

فمن اتقی واصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔

جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا اور (اپنی اور انسانی معاشرے کی) اصلاح کی انہیں (قیامت کے دن) کوئی خوف ہوگا نہ غم۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مقام خاص طور سے ان لوگوں کا ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور اصلاح کے راستے پر اپنے قدم اٹھائے۔ علاوہ بریں اصولی طور سے بھی قرآن "عقیدہ" اور "عمل" کی کتاب ہے۔ اس لیے قرأت وتلاوت اس سلسلے میں ایک مقدمہ ہے نہ کہ اصل مقصد۔

راغب اپنی کتاب "مفردات" میں لفظ "تلاوت" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

آیہ ۔ یتلونه حق تلاوته[1] سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے علم وعمل کے ذریعے قرآن کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "تلاوت" کے معنی "قرأت" سے بالاتر ہوئے کیونکہ "تلاوت" کے مفہوم میں تدبر، تفکر اور عمل بھی شامل ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۲۱۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) الٓمّٓصٓ ۚ

(۲) کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۞

(۳) اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ۞

ترجمہ

: شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

(۱) المص

(۲) یہ وہ کتاب ہے جو تم پر نازل ہوئی، اس کی وجہ سے تمہارے سینے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیئے، غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (تمام لوگوں کو عقائدِ بد اور اعمالِ ناشائستہ کے بُرے انجام سے) ڈراؤ، اور یہ ایک یاد دہانی ہے مومنوں کے لیے۔

(۳) (اس بناء پر) وہ چیز جو تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف نازل ہوئی اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں اور خداؤں کی پیروی مت کرو، لیکن کم ایسا ہوتا ہے کہ تم پر یاد دہانی اثر کرے (اور تم ہوش میں آؤ)۔

تفسیر

اس سورہ کے آغاز میں ایک مرتبہ پھر ہمیں قرآن کے حروفِ مقطعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہاں چار حرف ہیں' الف۔ لام۔ میم۔ صاد۔

ان حروف کے بارے میں سورہ بقرہ اور آل عمران کے آغاز میں ہم نے مفصّل طور پر بحث کی ہے۔ اس جگہ ان حروف کی ایک اور تفسیر جو قابل توجہ ہے اس بحث کی تکمیل کی غرض سے بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے ان حروف کے اغراض و مقاصد میں سے ایک بات یہ ہو کہ تلاوتِ قرآنی سے سننے والوں کی توجہ حاصل کی جائے اور انہیں خاموش رہنے کی دعوت دی جائے کیونکہ آغازِ کلام میں ان حروف کا ذکر کرنا عربوں کی نظر میں ایک عجیب اور نئی چیز تھی جو اُن میں جستجو کا جذبہ ابھارتی تھی اور غالباً ایسا ہوتا تھا کہ ان حروف کو سننے کے بعد وہ بعد والے مطالب کو بھی دھیان کے ساتھ سنتے تھے۔ اس نظریہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر سورتیں جو حروفِ مقطعات سے شروع ہوئی ہیں وہ مکّی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت مکّہ میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اور دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو اپنی ضد کے پکّے تھے وہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے آمادہ نہ تھے کہ پیغمبرؐ کی کسی بات پر کان دھریں بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انہیں خدا کا کوئی پیغام سنانا چاہتے تھے تو وہ اتنا شور و غل مچاتے جس سے آنحضرتؐ کی آواز گم ہو کر رہ جاتی تھی، جیسا کہ قرآن کی بعض آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے (ملاحظہ ہو آیت ۲۶ سورہ فصلت)۔

نیز بعض روایاتِ اہلبیت علیہم السلام میں وارد ہوا ہے کہ یہ حروف رموز و اشارہ ہیں اللہ کے اسمارِ حسنیٰ کا، مثلاً "المّص" اس سورہ میں اشارہ ہے (انا اللہ المقتدر الصادق) کی طرف۔ یعنی میں سچا اور قوی خدا ہوں۔ اسی طرح سے ان چار حروف میں سے ہر ایک خدا کے ناموں کا اختصار و خلاصہ ہے۔

مختصر الفاظ کو مفصّل الفاظ کی جگہ استعمال کرنا پہلے سے چلا آرہا ہے، اگرچہ ہمارے عصرِ جدید میں تو اس طرح کے استعمال کا دامن بہت وسیع ہوگیا ہے۔ بہت سی طولانی عبارتوں یا اداروں یا انجمنوں کے ناموں کو ایک مختصر لفظ میں سمیٹ دیتے ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان حروفِ مقطعہ کی جو مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں ان میں آپس میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ان تمام تفسیروں کو قرآن کے مختلف بطون کے لحاظ سے مراد لیا جائے۔

اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: یہ وہ کتاب ہے جو تم پر نازل ہوئی ہے، اس کی وجہ سے کسی قسم کی فکر یا اذیّت کو اختیار نہ کرو (کتاب انزل الیک فلا یکن فی صدرک حرج منہ)۔

"حرج" کے معنی لغت میں تنگی، مصیبت اور ہر طرح کی اذیّت کے ہیں اس کے اصلی معنی ہیں۔ درختوں کا جھنڈ۔ جن کی شاخیں آپس میں گتھی ہوئی ہوں۔ بعد میں اس معنی میں وسعت پیدا ہوگئی اور یہ لفظ ہر قسم کی دلتنگی اور ناراحتی کے معنی میں بولا جانے لگا۔

مذکورہ بالا جملہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تسلّی خاطر کے لیے فرمایا ہے چونکہ یہ آیتیں خدا کی جانب سے ہیں لہٰذا کسی قسم کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ اس رسالت کے سنگین بار کو اپنے دوش پر اٹھانے

کی فکر، نہ اس کے ردِ عمل اور جوابی کارروائیوں کی فکر جو نہایت جاہل اور ضدی دشمنوں کی طرف سے پیش آسکتی ہیں، نہ اس نتیجہ کی فکر جو اس تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں برآمد ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ تمام فکروں اور اندیشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور وہی اس کو منزلِ عمل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

چونکہ یہ سورہ مکّی ہے لہٰذا اس میں مشکلات کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جو راہ تبلیغ دین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درپیش تھیں۔ اگرچہ آج ہمارے لیے ان زحمتوں اور مصائب کا اپنے ذہن میں پوری طرح سے تصور کرنا مشکل ہے جو رسول اللہؐ اور ان کے باوفا ساتھیوں کو ابتداء میں دینِ اسلام پھیلانے کے سلسلے میں پیش آئی تھیں۔ لیکن اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ رسول اللہؐ یہ چاہتے تھے کہ اس انتہائی درماندہ و پستی میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں انقلاب کی ایسی روح پھونکیں جس کی وجہ سے انسانیت کا یہ پژمردہ و نیم جان پیکر یک بیک اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور ترقی کی بروادی میں دوڑنے لگے اور یہ سب کچھ ایک تھوڑے سے عرصے میں ہو جائے۔ تو پھر ان مشکلات کا اجمالی طور سے کچھ اندازہ ہو سکے گا جو آنحضرتؐ کو اس راہ میں پیش ہوں گی۔

اس بناء پر یہ بات برمحل ہے کہ خداوند کریم آنحضرتؐ کو تسلی دے کہ پریشان نہ ہونا، دلتنگ نہ ہونا، اپنے کام کا درست نتیجہ نکلنے کے پوری طرح سے امیدوار رہنا۔

اس کے بعد کے جملے میں مزید فرماتا ہے: اس کتاب کو نازل کرنے کا مقصد لوگوں کو ان کے افکار و اعمال کے انجام سے ڈرانا ہے، اسی طرح یہ تنبیہ اور یاددہانی ہے سچے مومنین کے لیے (لتنذر بہ وذکری للمؤمنین)[1]

اس آیت میں ایک بات جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "انذار" بطورایک عمومی فرمان کے وارد ہوا ہے اور "تذکر" کو مومنین کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کی طرف دعوت اور بے راہ روی کا مقابلہ اجتماعی طور سے ہونا چاہیئے جس میں سب شریک ہیں لیکن ظاہر ہے کہ صرف ایمان لانے والوں ہی کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور وہ وہی لوگ ہیں جن کے ذہن حق بات قبول کرنے کو تیار ہیں، انہوں نے ہر قسم کی ضد اور ہٹ دھرمی اپنے سے دور کردی ہے اور حق کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ بالکل یہی تعبیر سورہ بقرہ کے آغاز میں بھی گذر چکی ہے جہاں فرمایا ہے: ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین: یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے (مزید توضیح کیلئے تفسیر نمونہ جلد اوّل ملاحظہ ہو)۔

اس کے بعد عام انسانوں کی طرف روئے سخن کرکے ارشاد ہوتا ہے: جو چیز تمہارے پروردگار کی طرف

---

[1] جو بات اوپر کہی گئی ہے اس کی بناء پر "لتنذر" "انزل" سے متعلق ہے نہ کہ "فلایکن" سے شاید اس (لتنذر) کا جملہ (فلایکن فی صدرک حرج) کے بعد واقع ہونا اس بناء پر ہے کہ ابتداء میں پیغمبرؐ کو دعوت الی الحق کیلئے آمادہ کیا جانا چاہیئے بعد ازاں جو اس کا مقصد ہے (یعنی انذار) اسکو اسکے ساتھ بیان کرنا چاہیئے

سے تمہارے اوپر نازل ہوتی ہے اس کی پیروی کرو (اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم)۔ اور اس طرح پیغمبرؐ اور ان کی ماموریت و رسالت سے بات شروع ہو کر تمام لوگوں کے فرضِ منصبی پر ختم ہو جاتی ہے۔

مزید تاکید کے لیے ارشاد فرماتا ہے: غیر خدا کے فرمان کی پیروی نہ کرو، اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا والی و سرپرست نہ بناؤ (ولا تتبعوا من دونہٖ اولیآء)۔

لیکن چونکہ ایسے بندے جو پورے طور سے حق کے سامنے اپنا سر خم کرتے ہیں اور یاد دہانیوں کا اثر لیتے ہیں کم ہیں اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے: تم یاد دہانیوں کا اثر بہت کم لیتے ہو (قلیلاً ما تذکرون)۔

ضمنی طور پر یہ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے، ایک تو خدا کی سرپرستی و رہبری کا راستہ ہے اور دوسرا غیروں کی سرپرستی میں داخل ہونے کا راستہ۔ اگر پہلی راہ اختیار کرے تو اس کا سرپرست و والی صرف خدا ہے اور دوسروں کی سرپرستی قبول کرے تو اسے ہر روز کسی نہ کسی کا بار اپنے کاندھے پر اٹھانا پڑے گا اور ہر روز ایک نئے مالک و سرپرست کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ لفظ "اولیاء" جو "ولی" کی جمع ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

(۴) وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝

(۵) فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

(۴) اور کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے (ان کے گناہوں کی وجہ سے) تباہ کر دیا اور ہمارے عذاب نے جبکہ وہ رات کو سوئے ہوئے تھے یا دوپہر کو استراحت کی حالت میں تھے انہیں جا لیا۔

(۵) پس جس موقع پر ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے کہ ہم ظالم تھے (لیکن اس اعترافِ گناہ میں دیر ہو چکی تھی کیونکہ اس نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا)۔

تفسیر

وہ قومیں جو نابود ہوگئیں

ان دونوں آیتوں میں ان عبرت ناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سابقہ آیات میں مذکور فرمانوں کی مخالفت کی وجہ سے دی گئیں۔

نیز یہ فی الواقع متعدد قوموں کی سرگزشت کی ایک اجمالی فہرست ہے جیسے قوم نوح، قوم فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط جن کا ذکر بعد میں آنے والا ہے۔

اس مقام پر قرآن ان لوگوں کو جو انبیائے الٰہی کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہیں اور بجائے اپنی اور دوسرے افراد کی اصلاح کے، فساد کے بیج بوتے ہیں، انہیں شدت سے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ ذرا پچھلی قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں: ہم نے کس قدر شہر اور آبادیاں تباہ و برباد کر دیں اور ان میں رہنے والے لوگوں کو نابود کر دیا (وکم من قریة اھلکناھا)۔

اس کے بعد ان کی ہلاکت کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: ہمارا دردناک عذاب، رات (کی تاریکی) میں جبکہ وہ خواب راحت میں ڈوبے ہوئے تھے یا دن کے درمیانی حصہ میں اس وقت جبکہ وہ دن کے کاموں کے بعد استراحت کر رہے تھے انہیں آپہنچا (فجآءھا بأسنا بیاتًا او ھم قائلون)۔

اس کے بعد کی آیت میں بات کو آگے یوں بڑھاتا ہے: وہ لوگ جب گرداب بلا میں گرفتار ہوتے تھے اور پاداش عمل کا طوفان ان کی زندگی کے آشیانہ کو اجاڑ رہا ہوتا تھا تو وہ نخوت و غرور کی بلندی سے نیچے آتے تھے اور یوں کہتے تھے: ہم ستمگر تھے اور اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ظلم و ستم نے ان کا دامن تھام رکھا تھا (فما کان دعواھم اذ جآءھم بأسنا الا آن قالوآ انا کنا ظالمین)۔

چند اہم نکات

۱۔ "قریہ" در اصل مادہ "قری" (بروزن "نہی") سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں "اکٹھا ہونا" چونکہ قریہ (آبادی) لوگوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے اس لیے یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "قریہ" صرف دیہات ہی کو نہیں کہتے بلکہ یہ ہر قسم کی آبادی اور انسانوں کے اجتماع کے مرکز پر بولا جاتا ہے چاہے کوئی دیہات ہو یا شہر۔ نیز قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دیہات اور شہر دونوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

"قائلون" مادہ "قیلولہ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "خواب نیم روز" (دوپہر کی نیند) یا "دوپہر کی استراحت"۔ اس کے اصلی معنی ہیں "راحت" اسی لیے بکنے کے بعد کسی جنس کو "واپس لے لینا" بھی اس کے معنی میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے طرفین معاملہ کو راحت ہو جاتی ہے۔ "بیات" کے معنی "وقت شب" کے ہیں۔

۲۔ یہ جو ہم نے مذکورہ آیت میں پڑھا ہے کہ اللہ کا عذاب رات کے درمیانی حصے میں یا دوپہر کے آرام کے وقت ان لوگوں کے دامنگیر ہوا یہ اس لیے تھا تاکہ وہ اپنے عمل بد کی پاداش کا مزہ اچھی طرح سے چکھیں اور ان کی آسائش و آرام بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے، جس طرح ان ظالموں نے دوسرے لوگوں کے آرام و آسائش کو ملیامیٹ کر دیا تھا، اس طرح ان کا کیفرِ کردار ان کے عمل بد کے حسب حال تھا۔

۳۔ اس آیت سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تمام مجرم اور گنہگار قوموں کی یہ حالت تھی کہ جب ان کے افراد عذابِ الٰہی کے پنجے میں جکڑ جاتے اور غفلت و غرور کے پردے ان کی گناہوں سے اٹھ جاتے تو سب کے سب اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے لگ جاتے لیکن ایسا اعتراف ان کے لیے کسی طرح فائدہ بخش نہ تھا کیونکہ یہ تو ایک طرح کا "اجباری و اضطراری" اعتراف تھا۔ اس وقت حالت ہی ایسی ہو جاتی تھی کہ متکبر سے متکبر تر انسان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کی بیداری، ایک جھوٹی بیداری تھی جو زود گزر اور بے اثر ہوتی ہے، جس میں کسی روحانی انقلاب کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اور نہ اس کا ان کے اوپر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔ ہاں اگر یہی اعترافِ گناہ بحالتِ اختیار عذاب آنے سے پہلے ہوتا تو ان کے روحانی انقلاب کی دلیل بن کر ان کی نجات کا باعث بن جاتا۔

۴۔ یہاں پر مفسرین کے درمیان ایک بحث یہ بھی ہے کہ قرآن نے پہلے "اھلکنا ھا" (ہم نے انہیں ہلاک کر دیا) فرمایا، اس کے بعد "ف" کے ذریعے جسے فائے تفریع کہتے ہیں اور یہ ترتیب زمانی کے لیے آتی ہے، دوسرا جملہ فرمایا "فجاٰءھا بأسنا بیاتا" (یعنی پھر رات کے وقت ہمارے عذاب نے انہیں آلیا) حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ عذاب تو ان پر ان کی ہلاکت سے قبل آیا تھا نہ کہ بعد میں؟

اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ "ف" ہمیشہ ترتیب زمانی ہی کے لیے نہیں آتی بلکہ اس سے کبھی پہلے مختصر جملے کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں پر بھی پہلے تو "اھلکنا ھا" کہہ کر مختصراً اس کا انجام بیان کیا گیا، اس کے بعد اس کی تفصیل اس طرح سے بیان کی :- ہمارے عذاب نے رات کے وقت یا دوپہر کو جبکہ وہ محو استراحت تھے ان کا دامن تھام لیا، اور جس گھڑی انہوں نے خود کو ہلاکت کے دروازے پر دیکھا تب انہوں نے اپنے ظلم و ستم کا اعتراف کیا : اس طرح کا کلام، کلام عرب میں کم نہیں ہے۔

۵۔ اس طرح کی آیتوں کو، اقوام گذشتہ کی تاریخ ہی نہیں سمجھنا چاہیئے اور نہ اسے اقوام گذشتہ سے مخصوص کرنا چاہیئے کہ یہ بات آئی گئی ہو گئی بلکہ یہ آیتیں آج کے انسانوں کے لیے اور آئندہ آنے والوں کے لیے زبردست تنبیہیں اور خطرے کے الارم ہیں، یہ ہمارے لیے بھی ہیں اور تمام آئندہ آنے والی قوموں کے لیے بھی کیونکہ سنت الٰہیہ میں تبعیض و ترجیح کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

آج کا انسان جسے ایک صنعتی و میکانیکی انسان کہا جاتا ہے اپنی تمام قدرتوں اور قوتوں کے باوجود جو اس نے بڑی کد و کاوش کے بعد حاصل کر رکھی ہیں، زلزلے کے ایک جھٹکے، طوفان کے ایک جھونکے، بارش کے ایک

تھپیڑے اور اسی طرح کی دیگر آسمانی بلاؤں کے آگے اسی طرح کمزور و ناتواں ہے جس طرح ماقبل تاریخ کے دور میں تھا۔ بنا بریں وہ درد ناک عذاب اور انجام بد جس کا سامنا گذشتہ امتوں کے ستمگاروں اور غرور و ہوس رانی میں مست انسانوں کو کرنا پڑتا تھا آج کے انسان سے بھی بعید نہیں ہے بلکہ اس وقت انسان کو جو قدرت و طاقت حاصل ہوگئی ہے اس کی بنا پر وہ خود اپنی تباہی و عذاب کا سبب بن سکتا ہے اور یہی علم اور طاقت لے آخرکار ایک ایسی عظیم جنگ کی طرف لے جا رہی ہے جس کی وجہ سے نسل انسانی کے نابود ہونے کا اندیشہ ہے۔ آیا انسان کو ان حوادث سے عبرت نہیں لینا چاہیئے اور بیدار نہیں ہونا چاہیئے ؟

(۶) فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

(۷) فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

(۸) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ اِۨلْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(۹) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

(۶) ہم یقیناً ان لوگوں سے سوال کریں گے جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے تھے، نیز ان پیغمبروں سے بھی سوال کریں گے۔

(۷) اور یقیناً (سب کے اعمال کو حرف بہ حرف) ان کے سامنے اپنے (وسیع) علم کی رُو سے بیان کریں گے، اور ہم (اصولی طور پر) غائب نہ تھے (بلکہ ہم ہر جگہ حاضر و ناظر تھے)۔

(۸) اور اس روز (اعمال کا) وزن کرنا (اور ان کی قیمت معین کرنا) برحق ہے، وہ

لوگ جن کی میزان (عمل) بھاری ہے وہ فلاح یافتہ ہیں۔

(۹) اور وہ لوگ جن کی میزان (عمل) سبک ہے وہ ہیں جنہوں نے اپنے اس ظلم وستم کی وجہ سے جو وہ ہماری آیتوں پر روا رکھتے تھے، اپنے سرمایۂ وجود سے ہاتھ دھویا ہے۔

تفسیر

ایک عام بازپرس

گذشتہ آیات میں خداشناسی اور نزول قرآن کی طرف اشارہ کیا گیا تھا لیکن زیرِ نظر آیات جن میں معاد کی بابت گفتگو کی گئی ہے، فی الواقع یہ ان آیات کی تکمیل کنندہ ہیں۔ علاوہ ازیں گذشتہ آیات میں دنیا میں ظالموں کے ظلم کے نتائج کے بارے میں گفتگو تھی اور ان آیات میں ان لوگوں کی اُخروی سزاؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح سے ان تمام آیات کے درمیان واضح ربط موجود ہے۔

ابتداء میں ایک عام قانون کے طور سے فرماتا ہے: ان تمام لوگوں سے، جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا ہے ہم یقینی طور سے بروزِ قیامت سوال کریں گے (فلنسئلن الذین ارسل الیھم)۔

صرف ان سے ہی سوال نہیں کریں گے بلکہ ان کے رسولوں سے بھی سوال کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام ان تک کس طرح پہنچایا (ولنسئلن المرسلین)۔

بنا بریں رہبر بھی مسئول ہیں اور پیرو بھی، پیشوا بھی جوابدہ ہیں مرید بھی، اگرچہ ان دونوں گروہوں کی مسئولیت جداگانہ ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے حضرت فرماتے ہیں:

فیقام الرسل فیسئلون عن تأدیۃ الرسالات التی حملوھا الی اممھم فاخبروا انھم قد ادوا ذلک الی اممھم ...

پیغمبروں کو بروزِ قیامت روکا جائے گا اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ آیا تم نے اللہ کا پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا تھا یا نہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم نے پیغام پہنچا دیا تھا۔[۱]

ایک اور روایت جو تفسیر علی بن ابراہیم میں مذکور ہے وہ بھی اس کی مؤید ہے۔[۲]

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ خدا کے علم سے کچھ چیزیں مخفی ہیں اسی لیے وہ بروزِ قیامت اس طرح کے سوالات کرے گا، اس توہم کو دُور کرنے کے لیے بعد والی آیت میں خدا یقینی طور پر، قسمیہ تاکید کے ساتھ فرماتا ہے: ہم اپنے

---

[۱] و [۲] تفسیر نورالثقلین ج دوم ص۶

علم و آگاہی کی بنا پر ان کے تمام اعمال کی شرح ان سے بیان کریں گے، کیونکہ ہر گز ان سے غائب نہ تھے ہر جگہ ان کے ساتھ تھے اور ہر حال میں ان کے ہمراہ تھے (فلنقصن علیھم بعلم وما کنا غآئبین)۔

"فلنقصن" جو مادہ "قصہ" سے ماخوذ ہے، اس کے اصلی معنی ہیں "ایک دوسرے کے پیچھے قطار کی طرح کھڑے ہونا" اور چونکہ سرگذشت بیان کرنے میں مطالب و مضامین ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل طور پر آتے جاتے ہیں اس لیے اسے "قصہ" کہتے ہیں، اسی طرح سے وہ تعزیرات جو جرائم کے بعد مرتب ہوتی ہیں انہیں "قصاص" کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قینچی کو بھی "مقص" (بروزن "پسر") کہتے ہیں کیونکہ وہ پے در پے بالوں کو کاٹتی ہے نیز کسی چیز کی جستجو کو "قص" (بروزن مس) کہتے ہیں کیونکہ جستجو اور تفتیش کرنے والا شخص حوادث کی مسلسل تعقیب کرتا ہے۔

چونکہ آیت میں چار قسم کی تاکید ہے (لام قسم، نون تاکید، کلمہ علم جو نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے اور اس سے بیان عظمت مقام ہے اور جملۂ "ماکنا غآئبین" ہم کبھی بھی غائب نہ تھے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ ہم تمہارے اعمال کی تمام جزئیات کو "حرف بہ حرف" اور "سلسلہ وار" ان سے بیان کریں گے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ چھوٹی سے چھوٹی نیت یا عمل ہمارے علم سے پوشیدہ نہیں ہے[1]

سوال کس لیے ؟

پہلی بحث جو ہمیں درپیش ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور اصولی طور سے ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہے اس صورت میں اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ تمام انبیاء اور امتوں سے بغیر کسی استثناء کے باز پرس کرے ؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اگر سوال کرنا اطلاع حاصل کرنے کے لیے اور واقعہ معلوم کرنے کیلئے ہو تو جسے معلوم ہے اس کے لیے ایسا سوال کرنا بے فائدہ ہو گا لیکن اگر سوال کا مقصد یہ ہو کہ مخاطب کو متوجہ کیا جائے یا اس سے اتمام حجت کی جائے یا اس کے علاوہ کوئی اور غرض ہو تو اس موقع پر سوال بے جا نہیں ہے۔ اس کی ٹھیک مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص کثیر النسیان ہو اور ہم نے بہت زیادہ اس کی خدمت کی ہو پھر اس نے بجائے خدمت کے طرح طرح کی خیانتوں سے بدلہ دیا ہو، یہ تمام باتیں ہم پر روشن ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس شخص سے باز پرس کرتے ہوئے اس سے پوچھتے ہیں کہ آیا ہم نے تمہاری طرح طرح کی خدمتیں نہیں کیں ؟ کیا تم نے ان خدمتوں کا حق ادا کیا ؟

اس طرح کے سوالات تحصیل علم کے لیے نہیں ہوا کرتے بلکہ دوسرے کی تفہیم کے لیے ہوتے ہیں یا یہ کہ کسی

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" و "تبیان" میں بحث مذکورہ بالا کو "قصہ" کے عنوان کے تحت آیت کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

خدمت گزار شخص کی قدر دانی اور تشویق کے لیے ہم اس سے پوچھتے ہیں : اس سفر میں جو ڈیوٹی تمہارے سپرد کی گئی تھی اس کی بابت تم نے کیا کیا ؟ درانحالیکہ ہمیں اس کی تمام جزئیات معلوم ہوتی ہیں ۔

وہ آیات جن میں سوال کیا گیا ہے

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آیت مورد بحث میں جس صراحت کے ساتھ اور بڑی تاکید و قسم کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز سب سے سوال کیا جائے گا، یہ دوسری بعض آیات سے اختلاف رکھتا ہے۔ مثلاً سورۂ رحمان میں یہ آیت ہے :

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ... يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ...

اس روز کسی شخص سے نہ انسانوں سے نہ جنوں سے کوئی سوال کیا جائے گا بلکہ گنہگاروں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیا جائے گا۔[1]

اسی طرح کی دیگر آیات بھی ہیں جو بروزِ قیامت سوال کی نفی کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی آیات سوال کا اثبات کرنے والی آیات مثلاً زیرِ نظر آیت سے کیسے میل کھاتی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان آیات میں غور و فکر سے کام لیں تو ہر طرح کا ابہام دُور ہو جائے گا کیونکہ جن آیتوں میں بروزِ قیامت سوال و جواب کا ذکر ہے اگر ہم ان سب کو ملا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس روز لوگ چند مرحلوں کو طے کریں گے۔ ان میں سے کچھ مرحلے تو ایسے ہوں گے جہاں ان سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا جائے گا، حتیٰ کہ ان کے منہ پر مُہر لگا دی جائے گی، صرف ان کے اعضاء و جوارح، جنہوں نے ان کے اعمال کے اثرات کو اپنے میں محفوظ کر لیا ہے، ایک بولنے والے اور ناقابلِ تردید گواہ کی حیثیت سے ان کے تمام اعمال کی تفاصیل بیان کریں گے۔

اس کے بعد والے مرحلے میں ان کے منہ سے مُہر ہٹا دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ دوبارہ بول سکیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا۔ چونکہ وہ اپنے اعضاء کی گواہی دیکھ چکے ہوں گے لہٰذا انہیں اپنے اعمال کا اعتراف کرنا پڑے گا، بالکل ان مجرموں کی طرح جن کو اپنے جرائم کے چشم دید آثار کو دیکھنے کے بعد سوائے اعتراف کر لینے کے کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

بعض مفسّرین نے ان آیات میں یہ بھی احتمال دیا ہے کہ جن آیات میں سوال کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد زبانی سوال و جواب ہے، جن آیات میں سوال کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد اعضاء و جوارح سے سوال کیا جانا ہے۔ چنانچہ جیسے رنگ رخسار رازِ دل کو آشکار کر دیتا ہے انسانی اعضاء و جوارح حقائق کو ظاہر کر دیں گے۔

ان میں سے کسی صورت میں ان دو طرح کی آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ رحمان آیت ۳۹ - ۴۱

اس کے بعد والی آیت میں بحث حشر و نشر کی تکمیل کے لیے مسئلہ "اچھے بُرے اعمال کی پرکھ" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی مثال قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی موجود ہے جیسے سورہ مومنون آیات ۱۰۲ - ۱۰۳ اور سورہ قارعہ آیات ۶ - ۸ ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ : اعمال کے تولے جانے کا مسئلہ اس روز برحق ہے (والوزن یومئذ الحق)[1]

قیامت کے روز اچھے بُرے اعمال کی پرکھ کیلئے ترازو سے کیا مراد ہے

بروز محشر اعمال کے تولے جانے کی کیفیت کے بارے میں مفسرین و متکلمین کے درمیان بڑی بحث ہے ۔ چونکہ بعض افراد نے یہ خیال کیا ہے کہ وزن و ترازو اُس جہان میں بالکل اس جہان کے وزن و ترازو کی طرح ہے ، دوسری طرف یہ بھی ہے کہ انسانوں کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوتا ، اس طرح ناچار ہو کر انہوں نے تجسم اعمال کے ذریعے یا یہ کہ اس روز خود انسانوں کا وزن کیا جائے گا اس مشکل کا حل ڈھونڈا ہے ، یہاں تک کہ انہوں نے عبید بن عمیر سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں :

"یؤتی بالرجل الطویل العظیم فلا یزن جناح بعوضة"

یعنی بروز قیامت طویل القامت عظیم الجثہ افراد لائے جائیں گے جو ترازو میں مچھر کے پر جتنا وزن بھی نہ رکھتے ہوں گے[2]

اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ لوگ اگرچہ بظاہر بڑے لوگ ہوں گے لیکن فی الحقیقت ان کی کوئی قیمت نہ ہوگی ۔

اگر ہم اُس جہان کی زندگی کا اِس دنیا کی زندگی سے موازنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہاں کی ہر چیز اس دُنیا سے بالکل الگ ہے جیسے ایک جنین کی شکم مادر کے اندر کی زندگی دنیاوی زندگی سے مختلف ہے ، نیز اس بات کی طرف بھی توجہ رکھیں کہ کسی لفظ کے معنی سمجھنے کے لیے ہمیشہ مصداق موجود کے پیچھے نہیں جانا چاہیئے بلکہ نتیجہ کی رُو سے مفہوم کو پرکھنا چاہیئے ، تو قیامت کے روز جو میزان نصب کی جائے گی اس کے معنی بالکل سمجھ میں آجائیں گے ۔

اس کی توضیح اس طرح پر ہے کہ سابقہ زمانے میں جبکہ بھی "چراغ" کا نام لیا جاتا تھا ، تو ایک برتن سمجھ میں آتا تھا جس میں تھوڑا تیل پڑا ہو اور ایک فتیلہ (بتی) اس میں موجود ہو ، نیز اس بات کا بھی احتمال ہوتا تھا کہ شاید اس پر ایک چمنی بھی موجود ہو جو چراغ کی ہوا سے حفاظت کرے گی جبکہ فی زمانہ اس لفظ "چراغ" سے دوسری چیز سمجھ میں آتی ہے ، ایک ایسی شے جس میں نہ تو تیل کا کوئی برتن ہے نہ فتیلہ ہے ، نہ ہوا کو روکنے کے لیے پہلے کی طرح کا

---

[1] بنا برین "وزن" بہ معنائے مصدری ہے ، یعنی وزن کرنا ، اور یہ کلمہ مبتدا ہے ، "الحق" اس کی خبر ہے اگرچہ اس میں دیگر احتمالات بھی ہیں مگر جو ہم نے کہا ہے سب سے زیادہ قرین عقل ہے ۔

[2] اس روایت کو تفسیر "مجمع البیان" اور تفسیر "طبری" میں عبید بن عمیر سے نقل کیا گیا ہے ظاہر عبارت یہ ہے کہ یہ خود عبید کے الفاظ ہیں نہ کہ پیغمبر کے ۔

فانوس ہے ۔لیکن اس کے باوجود جو چیز آج کے چراغ کو قدیمی چراغ سے ملاتی ہے وہ اس کا نتیجہ ہے یعنی ایک ایسی شے جو تاریکی کو دُور کردے ۔

مسئلہ "میزان" بھی بالکل اسی طرح ہے ، اسی جہان میں ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے ترازو کی شکلیں کس طرح بدلتی جاتی ہیں ، یہاں تک کہ لفظ "میزان" دوسری چیزوں کے جانچنے کے آلات کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ، جیسے "میزان الحرارۃ" (گرمی جانچنے کا آلہ) "میزان الھوا" (ہوا جانچنے کا آلہ) وغیرہ وغیرہ۔

اس بناء پر جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ بروزِ قیامت لوگوں کے اعمال ایک خاص وسیلے سے جانچے جائیں گے ، یہ ضروری نہیں کہ وہ وسیلہ دنیا کے ترازو کی طرح ہو ۔ ممکن ہے کہ وہ وسیلہ انبیاء ، آئمہ اور افرادِ صالح کا وجود ہو ۔ اس مطلب کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو اہلبیت طاہرین علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں ۔

چنانچہ بحار الانوار میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب آیت "ونضع الموازین القسط"[۱] کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا :

"والموازین الانبیآء والاوصیآء ومن الخلق من یدخل الجنۃ بغیر حساب"

بروزِ قیامت میزان سے مراد پیغمبران کرام اور ان کے اوصیائے عظام ہیں اور لوگوں میں سے وہ افراد ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے (یعنی وہ لوگ جن کے نامۂ اعمال میں تاریکی کا کوئی گوشہ نہ ہوگا)[۲]

اور دوسری روایت میں اس طرح وارد ہوا ہے :

"ان امیرالمؤمنین والائمۃ من ذریتہ ھم الموازین"

"یعنی امیرالمومنینؑ اور ان کے فرزند آئمہ طاہرینؑ میزانِ اعمال ہیں"[۳]

نیز حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی زیارتِ مطلقہ میں وارد ہوا ہے :

السلام علی میزان الاعمال ۔

"سلام ہو اس پر جو اعمال کی میزان ہے"

واقعہ یہ ہے کہ اس جہان میں جو مرد اور عورت عمل کی رُو سے دوسروں کے لیے نمونہ ہیں وہ فی الحقیقت دوسروں کے اعمال کا ایک ترازو ہیں اور جو شخص جس قدر بھی ان سے مشابہت رکھتا ہے وہ اتنا ہی وزن رکھتا ہے اور وہ افراد جو ان سے کم مشابہت رکھتے ہیں یا بالکل مشابہ نہیں ہیں وہ "کم وزن" یا بالکل "بے وزن" اور ہلکے افراد ہیں ۔

یہاں تک کہ اس جہان میں بھی دوستانِ خدا دوسروں کے اعمال کی مقیاس ہیں ، لیکن چونکہ اس دنیا میں

---

[۱] سورۂ انبیاء آیت ۴۷ ۔

[۲] و [۳] بحار الانوار طبع جدید جلد ۷ ، ص ۲۵۱ - ۲۵۲ ۔

بہت سے حقائق پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں اور روزِ قیامت بمقتضائے آیہ شریفہ " وبرزوا للّٰہ الواحد القہار " (ابراہیم - ۴۸) روزِ انکشاف و ظہور ہے اس لیے اس دن یہ واقعیت ظاہر و آشکارا ہو جائے گی ۔

اور یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ " موازین " جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے ۔ کیونکہ اولیائے حق جو ترازُئے اعمال ہیں وہ متعدد ہیں ۔

نیز یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صفت میں ممتاز تھا، بنا بریں ان میں سے ہر ایک انسانوں کی کسی ایک صفت کی مقیاس ہے اور چونکہ انسانوں کے اعمال و صفات مختلف ہیں لہٰذا کسوٹی او ترازو بھی مختلف ہونا چاہیئے ۔

اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بعض روایات میں اس کا مفہوم "عدل" کیوں بیان کیا گیا ہے ۔ جیسے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت سے پوچھا :

" ما معنی المیزان قال العدل :

میزان کے معنی کیا ہیں ؟ حضرت نے فرمایا عدل [1]

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کا مفہوم اس کے منافی نہیں ہے ۔ کیونکہ دوستانِ خدا اور وہ مرد اور عورتیں جو نمونۂ عمل ہیں وہ عدل کا مظہر ہیں، یعنی عدل از روئے فکر ، عدل از روئے عقیدہ 'عدل از روئے صفات و اعمال (ذرا غور کیجئے گا) ۔

اس کے بعد کے جملے میں ارشاد ہوتا ہے : وہ لوگ جن کا پلہ میزان عمل سے بھاری ہے نجات یافتہ ہیں اور وہ لوگ جن کا پلّہ ہلکا ہے وہ ، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ظلم و ستم کی وجہ سے جو انہوں نے ہماری آیات کے بارے میں کیا ہے ، اپنے سرمایۂ وجود کو کھو دیا ہے (فمن ثقلت موازینہ فاولٓئک ھم المفلحون ' ومن خفت موازینہ فاولٓئک الذین خسروآ انفسہم بما کانوا بأیٰتنا یظلمون) ۔

یہ بات بھی بدیہی ہے کہ میزان کے بھاری اور ہلکے پلنے سے خود ترازو کے پلّہ کا بھاری اور ہلکا ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو ان ترازوؤں میں تولے جائیں گے ۔

اسی ضمن میں - خسروآ انفسہم - (انہوں نے اپنے سرمایۂ وجود کو کھو دیا) سے اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے افراد بہت بڑے خسارے اور گھاٹے میں مبتلا ہوں گے، کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان یوں گھاٹا اٹھاتا ہے کہ اس کا مال یا مقام ہاتھ سے چلا جاتا ہے ۔ لیکن کبھی ایسا گھاٹا اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے سرمایۂ ہستی کو کھو بیٹھتا ہے اس طرح کہ اس کے بدلے میں اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا ۔ یقیناً یہ سب سے بڑا اور بُرا خسارہ ہے ۔

آخر آیت میں جو یہ آیا ہے کہ " کانوا بأیٰتنا یظلمون " ہماری آیتوں کے بارے میں ظلم کرتے تھے

---

[1] تفسیر نور الثقلین - جلد ۲ - ص ۵ -

اس تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس طرح کے لوگ صرف اپنی ہی جانوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ خدا نے ہدایتِ خلق کے لیے جو نظام قائم کیے ہیں ان پر بھی ستم کرتے ہیں کیونکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اللہ کے بنائے ہوئے یہ نظام خلق کی ہدایت و نجات کا وسیلہ بنیں، لیکن جب ان سے بے اعتنائی برتی جائے گی تو ان سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا اور اس طرح ان پر ظلم ہو گا۔

بعض روایات میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس مقام پر "آیات" سے مراد دین کے عظیم رہبر اور آئمہ ھدیٰ ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ اس طرح کی تفسیروں کا یہ منشا نہیں ہے کہ آیت صرف اسی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جائے بلکہ یہ معنی آیت کے ایک روشن مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعض مفسّرین نے اس آیت میں آیت پر ظلم کے معنی یہ لیے ہیں کہ آیت کا انکار کیا جائے یا اس کے ساتھ کفر کیا جائے، یقیناً یہ معنی بھی ظلم کے مفہوم سے بعید نہیں، قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی "ظلم" اس معنی میں آیا ہے۔

(۱۰) وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۟

ع ۱
۸

ترجمہ

(۱۰) ہم نے زمین پر تسلط، مالکیت اور حکومت تمہارے لیے قرار دی ہے اور زندگی کے لیے طرح طرح کے وسائل تمہارے لیے فراہم کیے ہیں لیکن تم بہت کم شکر کرتے ہو (اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو برمحل صرف نہیں کرتے)۔

تفسیر

جہانِ ہستی میں انسان کا عظیم الشان مقام

جن آیات میں مبدأ و معاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان کے بعد اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں موضوعِ گفتگو یہ امور ہیں: "انسان" اور اس کے مقام کی عظمت و اہمیت، اس طرح کے افتخارات کی کیفیت جو اللہ نے اسے عطا کیے ہیں اور وہ عہد و پیمان جو ان نعمتوں کے بارے میں اللہ نے اس سے لیے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ تربیتِ انسانی کی بنیاد مستحکم ہو اور اس کی ترقی کی راہ ہموار ہو۔

سب سے پہلے ایک آیت میں ان تمام مطالب کو بطور خلاصہ بیان فرمایا گیا ہے ۔ پھر بعد والی آیات میں اس کی تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے ۔

شروع میں فرماتا ہے : ہم نے زمین پر تمہیں مالکیت ، حکومت اور تسلط عطا کیا ہے (ولقد مکناکم فی الارض) ۔

اور اس میں تمہارے لیے زندگی کے طرح طرح کے وسائل پیدا کیے ہیں (وجعلنا لکم فیہا معایش) ۔

لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم نعمتوں اور عطیوں کا بہت کم شکر کرتے ہو (قلیلاً ما تشکرون) ۔

"تمکین" کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی شخص کو کسی جگہ ٹھہرا دیا جائے ، بلکہ اس کے معنی میں ہے کہ اسے وہاں کام کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہو وہ بھی اس کے لیے فراہم کیے جائیں ، اسے قوت و توانائی دی جائے ، کام کرنے کے تمام آلات فراہم کیے جائیں اور رکاوٹیں دور کی جائیں ۔ ان تمام امور پر لفظ "تمکین" بولا جاتا ہے ۔ حضرت یوسفؑ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے :

" وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ "

"ہم نے اس طرح یوسفؑ کو زمین پر قبضہ عطا کیا" (اور ہر طرح کی قدرت ان کے اختیار میں دی) ۔ (یوسف ۔ ۵۶)

اس آیت میں بھی دیگر آیات کی مانند پروردگار کی نعمتوں کے ذکر کے بعد بندوں کو شکر گذاری کی دعوت دی گئی ہے اور ان کی ناسپاسی اور کفرانِ نعمت کی مذمت کی گئی ہے ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ لوگوں میں خدا کی نعمتوں کے مقابلے میں شکر گزاری اور قدر دانی کا جذبہ بیدار کرنا صرف اس لیے ہے کہ بندہ فرمانِ فطرت کے مطابق ان تمام نعمتوں کے عطا کرنے والے کے سامنے سر تسلیم خم کرے ، اسے پہچانے اور اس کے ہر فرمان کو جان و دل سے قبول کرے اور یوں اس کی ہدایت و تربیت کا سامان ہو جائے ، نہ یہ کہ شکر گزاری کا کوئی فائدہ پروردگارِ عالم کو پہنچتا ہے ، بلکہ اس کا جو کچھ بھی اثر اور فائدہ ہے وہ دیگر عبادتوں کی طرح خود انسان ہی کو پہنچتا ہے ۔

(۱۱) وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○

(۱۲) قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○

(۱۳) قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝

(۱۴) قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

(۱۵) قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝

(۱۶) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

(۱۷) ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝

(۱۸) قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

ترجمہ

(۱۱) ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری شکل و صورت بنائی، اس کے بعد ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے لیے سجدہ کرو، انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا۔

(۱۲) (خدا نے اس سے) فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدے سے روکا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا؟ اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے۔

(۱۳) کہا اس (مقام و مرتبہ سے اتر جا! تجھے اس مقام و مرتبہ) میں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تو تکبّر کرے۔ تو یہاں سے نکل جا، تو پست و حقیر افراد میں سے ہے۔

(۱۴) اس (شیطان) نے کہا مجھے روز محشر تک کے لیے مہلت دے (اور زندہ رہنے دے)۔

(۱۵) (اللہ نے) فرمایا: تُو مہلت یافتہ افراد میں سے ہے۔

(۱۶) اس نے کہا: اب جبکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے، مَیں تیرے سیدھے راستے پر ان لوگوں کی تاک میں رہوں گا۔

(۱۷) اس کے بعد ان کے آگے سے، پیچھے سے، داہنی طرف سے، بائیں طرف سے ان کی طرف آؤں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شُکر گزار نہ پائے گا۔

(۱۸) (اللہ نے) فرمایا: اس (مقام) سے ذلّت و خواری کے ساتھ باہر نکل جا، جو شخص بھی ان میں سے تیری پیروی کرے گا، مَیں ان سے اور تجھ سے جہنم کو بھر دُوں گا۔

تفسیر

ابلیس کی سرکشی اور عصیان کا ماجرا

قرآن کریم کی سات سورتوں میں انسان کی پیدائش اور اس کی خلقت کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے، اور جیسا کہ سابقاً بیان کیا گیا ہے اس موضوع کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اور موجوداتِ عالم میں اس کا مقام و مرتبہ بیان کیا جائے اور اس کے وجود میں جذبۂ شکر گزاری بیدار کیا جائے۔

اس سورہ میں مختلف تعبیروں سے خاک سے انسان کی خلقت، اس کے لیے فرشتوں کا سجدہ کرنا اور شیطان کی سرکشی نیز اس کے بعد نوعِ انسانی کو تباہ کرنے کے لیے اس کے گھات میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی موردِ بحث آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تمہیں پیدا کیا، اس کے بعد تمہیں شکل و صورت دی اس کے بعد ہم نے فرشتوں کو (اور ان کے درمیان ابلیس کو بھی جو اگرچہ فرشتوں میں سے نہ تھا لیکن ان کے درمیان تھا) حکم دیا کہ آدم (جو تمہارا جدِّ اوّل تھا) کے لیے سجدہ کریں (ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملآئکة اسجدوا لآدم)۔

سب نے جان و دل سے اس فرمان کو قبول کیا اور انہوں نے آدم کے لیے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہُوا (فسجدوا الآ ابلیس لم یکن من الساجدین)۔

آیت مذکورہ بالا میں "خلقت" کا ذکر "صورت بندی" سے پہلے کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہم نے سب سے پہلے خلقتِ انسانی کے مادۂ اوّل کو پیدا کیا اور پھر ہم نے اسے انسانی

شکل عطا کی۔ جیسا کہ ہم نے سورہ بقرہ آیت ۳۴ کے ضمن میں بیان کیا ہے، یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا "سجدۂ عبادت" نہ تھا، کیونکہ پرستش صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، بلکہ یہاں پر سجدہ برائے خضوع و احترام تھا (یعنی انہوں نے آدمؑ کے آگے اظہارِ فروتنی کیا تھا) یا یہ کہ یہ سجدہ خدا کے لیے شکرانہ کے طور پر تھا کہ اس نے ایک ایسی موزوں، مناسب اور باعظمت مخلوق پیدا کی ہے۔

نیز ہم اُسی آیت کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ "ابلیس" فرشتوں میں سے نہ تھا، بلکہ آیات قرآنی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ ایک اور قسم کی مخلوق تھا جس کا نام "جن" ہے (مزید توضیح کے لیے براہ مہربانی تفسیر نمونہ جلد اوّل صفحہ ۱۶۰ اُردو ترجمہ میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا نے "ابلیس" کی سرکشی اور طغیان کی وجہ اس کا مواخذہ کیا اور کہا، اس بات کا کیا سبب ہے کہ تو نے آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا اور میرے فرمان کو نظر انداز کر دیا ہے؟ (قال ما منعک ان لا تسجد اذ امرتک)۔

اس نے جواب میں ایک نادرست بہانے کا سہارا لیا اور کہا: میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو آب و گل سے (قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین)۔

گویا اسے خیال تھا کہ آگ، خاک سے بہتر و افضل ہے۔ یہ ابلیس کی ایک بڑی غلط فہمی تھی۔ شاید اسے غلط فہمی بھی نہ تھی بلکہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خاک طرح طرح کی برکتوں کا سرچشمہ، تمام مواد حیاتی کا منبع اور زندہ موجودات کی بقائے حیات کا ایک اہم ترین وسیلہ ہے، جبکہ آگ میں یہ خصوصیات موجود نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آگ موجودات جہان کے تجزیہ و ترکیب کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے لیکن زندہ موجودات کی ہستی میں بنیادی حیثیت ان مواد کو حاصل ہے جو خاک کے اندر موجود ہیں۔ آگ تو صرف ان کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ کرۂ زمین اپنی آفرینش میں سورج سے جُدا ہوا تھا، وہ آگ کے ایک گولے کی طرح تھا جو بعد میں تدریجاً ٹھنڈا ہوتا گیا لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ زمین جب تک گرم اور شعلہ ور تھی اس میں کوئی زندہ مخلوق نہیں پائی جاتی تھی اس میں زندگی اس وقت پیدا ہوئی جب آگ کی جگہ خاک و گل نے لے لی۔

علاوہ بریں ہر آگ جو زمین میں پیدا ہوتی ہے انہی مواد سے ظاہر ہوتی ہے جو خاک سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ خاک سے درخت اُگتے ہیں اور درخت سے آگ نکلتی ہے، حتیٰ کہ تیل کے اجزاء یا جلنے والی چربیاں ان سب کی بازگشت خاک کی طرف ہے یا ان حیوانات کی طرف جو نباتات سے خوراک حاصل کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ امتیاز و خصوصیت صرف یہ نہ تھی کہ ان کی خلقت

خاک سے ہوئی ہے بلکہ آدم کا امتیاز اس بات میں تھا کہ ان میں روح انسانیت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ مقام خلافت الٰہی اور خدا کی نمائندگی کے مرتبے پر فائز تھے۔ اس بناء پر یہ مان بھی لیا جائے کہ شیطان کی خلقت کا مادۂ اوّل افضل تھا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حضرت آدم جنہیں اللہ نے روح وعظمت عطا کی اور اپنی نمائندگی کے مرتبے پر فائز کیا، کے سامنے سجدہ و فروتنی نہ کرے۔ ظاہر یہ ہے کہ شیطان ان تمام باتوں کو جانتا تھا، صرف اس کی نخوت و تکبّر نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ باقی یہ سب باتیں بہانہ تراشیاں تھیں۔

سب سے پہلا قیاس کرنے والا شیطان تھا

اہل بیت طاہرین علیہم السلام کی متعدد حدیثوں میں اس بات کی شدت سے مذمت کی گئی ہے کہ احکام دین میں "قیاس" سے کام لیا جائے۔ اب ان روایات میں ہم پڑھیں گے کہ جس شخص نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔[1]

مدارک وکتب اہل سنت میں بھی جیسے تفسیر المنار اور تفسیر طبری میں یہی بات ابن عباس اور حسن بصری سے نقل کی گئی ہے۔[2]

"قیاس" سے مراد یہ ہے کہ دو موضوع جو بعض جہات میں ایک دوسرے سے مشابہ ہوں ان میں سے ایک کا دوسرے پر قیاس کیا جائے اور وہی حکم جو پہلے موضوع کا ہے دوسرے موضوع میں بھی اسے جاری کیا جائے، بغیر اس کے کہ پہلے حکم کے اسرار اور فلسفے کا ہمیں علم ہو مثلاً یہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا پیشاب نجس و ناپاک ہے، اور اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہم انسان کے "پسینہ" کا بھی اس پر قیاس کریں اور یہ کہیں کہ چونکہ یہ دونوں سیال بعض حیثیتوں سے اور اپنے بعض اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں لہٰذا دونوں ناپاک و نجس ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں سیال اگرچہ بعض جہات سے ایکدوسرے کے مشابہ ہیں لیکن دیگر جہات سے مختلف بھی ہیں، ایک رقیق ہے دوسرا قدرے گاڑھا ہے۔ ایک سے اجتناب کرنا آسان ہے، دوسرے سے بہت مشکل ہے۔ علاوہ بریں پیشاب سے اجتناب کرنے کا فلسفہ پورے طور سے ہمیں نہیں معلوم، لہٰذا یہ مقایسہ ایک اندازے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ہمارے پیشواؤں نے جن کے ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین سے ماخوذ ہیں، قیاس کی سخت مذمت کی ہے اور اسے بالکل باطل جانا ہے کیونکہ اگر "قیاس" کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھل جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر شخص اپنے محدود مطالعے اور کوتاہ فکر کے باوجود احکام شریعت میں قیاس سے کام لینے لگے گا اور جہاں بھی دو چیزوں میں تھوڑی مشابہت دیکھی ایک کا حکم دوسری پر لگا دے گا اور اس طرح قوانین اسلام اور شریعت کے احکام میں ہرج مرج واقع ہو جائے گا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد دوم ص ۶۔

[2] تفسیر المنار جلد ۸ ص ۳۳۱، تفسیر طبری جلد ۸ ص ۹۰، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۶۰۷۔

عقل کی رُو سے بھی قیاس کا ممنوع ہونا صرف دینی قوانین پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ ایک بیمار کا نسخہ دوسرے بیمار کو ہرگز نہ استعمال کرایا جائے چاہے دونوں کی بیماری ظاہری طور پر ایک جیسی ہو۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دونوں بیمار ممکن ہے ہماری نظر میں آپس میں مشابہ ہوں، لیکن بہت سی چیزوں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ جیسے دوا کے لیے قوت برداشت، خون کا گروپ اور خون میں شکر اور چربی کی مقدار۔ ایک عام شخص ہرگز ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ ان کی تشخیص کر سکتا ہے انہیں تو ایک ماہر طبیب ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ان خصوصیات پر نظر رکھے بغیر ایک مریض کی دوا دوسرے مریض کو دے دی جائے تو بجائے فائدہ پہنچانے کے ہو سکتا ہے اسے الٹا نقصان پہنچ جائے، نقصان بھی ایسا جس کا کوئی تدارک اور علاج نہ ہو سکے۔

یہ ایک مثال تھی، ورنہ احکام الٰہی اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ اگر احکام خدا کے بارے میں قیاس کیا جائے تو دین خدا مٹ جائے گا یا یہ کہ قیاس کی خرابیاں اس کے فائدے سے زیادہ ہیں[1]

علاوہ بریں احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے قیاس کا سہارا لینا اس بات کی نشانی ہے کہ دین اسلام نامکمل ہے کیونکہ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہمارے دین میں ہر موضوع کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم ضرور موجود ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر قرآن وحدیث نے روشنی نہ ڈالی ہو تو پھر قیاس کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "شیعہ" مکتب کے ماننے والے قیاس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے تمام ضروری احکام دین اہلبیت طاہرینؑ سے حاصل کرتے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی نائب اور وارث ہیں۔ لیکن فقہائے اہلسنت نے چونکہ مکتب اہل بیتؑ (جس کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان تھا کہ وہ قرآن کے بعد مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے) کو نذر طاق نسیان کر دیا ہے اور اس بنا پر احکام اسلامی کے مدارک کی ان کے پاس کمی ہوگئی ہے، لہٰذا ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ وہ "قیاس" کی طرف دست سوال دراز کریں۔

اب رہا شیطان کا معاملہ جس کے متعلق روایات میں ملتا ہے کہ وہ پہلا فرد ہے جس نے قیاس سے کام لیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس نے اپنی مادی خلقت کو آدمؑ کی خلقت پر قیاس کیا اور بعض جہات سے خاک پر آگ کی برتری کو، آگ کی کلی برتری کی دلیل قرار دیا اُس نے خاک کے دیگر امتیازات پر نظر نہ کی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے خود آدمؑ کے روحانی و معنوی امتیازات پر توجہ نہیں کی۔ اصطلاحاً اس قیاس کو "قیاس اولویت" کہا جاتا ہے۔ اس نے اس قیاس کے ذریعے جو محض تخمین وگمان اور سطحی مطالعے پر مبنی تھا، اپنے کو آدمؑ سے بہتر و برتر سمجھ لیا۔ حتیٰ کہ اس نے اسی باطل قیاس کے بل بوتے پر فرمان الٰہی کو ٹھکرانے کی جرأت کی۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ باب قیاس کی طرف رجوع کریں۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ شیعہ اور سُنی دونوں طریقوں سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے جو روایات منقول ہیں ان میں ہے کہ :

"من قاس امرالدين برأيه قرنه الله تعالى يوم القيامة بابليس":

جو شخص دین کے امور میں اپنے قیاس کو کام میں لائے گا، اسے خدا بروز قیامت ابلیس کے ساتھ ملائے گا۔[1]

خلاصہ یہ کہ ایک موضوع کا دوسرے موضوع پر قیاس کرنا، بغیر اس کے کہ اس کے تمام اسرار و رموز سے آگاہی ہو ان دونوں موضوعوں کے لیے ایک جیسے حکم کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اگر مسائل مذہبی میں قیاس کا راستہ کھل جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ احکام الٰہی کا کوئی ضابطہ باقی نہ رہے گا کیونکہ اس امر کا امکان ہوگا کہ ایک شخص کسی موضوع میں اپنی سمجھ کے مطابق قیاس کرے اور اس سے تحریم کا حکم اخذ کرے، جبکہ کوئی دوسرا شخص اسی موضوع کو دوسرے موضوع پر قیاس کرے اور اس سے حلال ہونے کا نتیجہ نکالے۔

ایک استثناء

صرف ایک موضوع ایسا ہے جس کا استثنا کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ قانون بنانے والا مثلاً طبیب اپنے حکم کا فلسفہ و دلیل بیان کر دے بس اس صورت میں ممکن ہے کہ جہاں بھی وہ دلیل اور فلسفہ پایا جائے وہاں اس حکم کو جاری کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں "قیاس منصوص العلۃ" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر طبیب بیمار سے یہ کہے کہ فلاں میوہ سے پرہیز کرنا کیونکہ وہ ترش ہے۔ اس سے بیمار یہ سمجھے گا کہ اس کے لیے ترشی مضر ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے چاہے وہ کسی اور میوہ میں پائی جائے۔ بالکل اسی طرح قرآن یا سنت میں اس بات کی تصریح موجود ہو کہ شراب سے پرہیز کرو کیونکہ وہ نشہ آور ہے، اس سے ہم یہ سمجھیں گے کہ ہر نشہ آور مایع (چاہے وہ شراب نہ بھی ہو) حرام ہے۔ اس طرح کا قیاس ممنوع نہیں ہے کیونکہ اس کی دلیل قطعی کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ قیاس صرف اس جگہ ممنوع ہے جہاں ہم حکم کے فلسفہ و دلیل کو تمام جہات سے از روئے یقین نہ جان سکیں۔

"قیاس" کا موضوع ایک طویل الذیل موضوع ہے، سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مختصراً اور خلاصے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مزید توضیح کے لیے اصول فقہ اور احادیث کی کتابوں میں باب قیاس کی طرف رجوع کیا جائے۔ ہم یہاں پر ایک حدیث نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں :

کتاب علل الشرایع میں منقول ہے :

ایک دفعہ ابوحنیفہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آئے۔ امام علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم احکام خدا میں اپنے قیاس سے کام لیتے ہو!

ابوحنیفہ نے جواب دیا : جی ہاں ایسا ہی ہے، میں قیاس کرتا ہوں۔

---

[1] تفسیر "المنار" جلد ۸ ص ۱۳۱، ۲۳۲، تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۷۔

امام نے فرمایا : آئندہ ایسا نہ کرنا کیونکہ سب سے پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا جب اس نے کہا تھا : خلقتنی من نار وخلقتہ من طین ، اس نے آگ اور مٹی کا باہم قیاس کیا حالانکہ وہ آدم کی نورانیت و روحانیت کا آگ سے قیاس کرتا تو اسے ان دونوں کے درمیان بڑا فرق معلوم ہو جاتا ، اور نورانیت و روحانیت کو آگ پر جو فوقیت حاصل ہے اسے پہچان لیتا۔[1]

ایک سوال کا جواب

یہاں پر ایک سوال باقی رہ جاتا ہے ، اور وہ یہ کہ شیطان نے خدا سے کس طرح گفتگو کی ، کیا اس پر بھی وحی نازل ہوتی تھی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا بات کرنا ہمیشہ وحی کا پہلو نہیں رکھتا ، کیونکہ وحی کا مفہوم ہے "پیام رسالت و نبوّت"۔ اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ خدا کسی شخص سے ، نہ بہ عنوان وحی و رسالت ، بلکہ بطریق الہام درونی ، کسی فرشتے کے ذریعے بات کرے ، چاہے یہ شخص صالح افراد میں سے ہو جیسے مریمؑ و مادرِ حضرت موسیٰؑ یا غیر صالح ہو جیسے شیطان۔

اب ہم باقی آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

چونکہ شیطان کا آدم کو سجدہ کرنے سے انکار ، ایک عام اور معمولی انکار نہ تھا اور نہ ہی ایک عام گناہ شمار ہو سکتا تھا بلکہ یہ ایک سرکشی اور اعتراض تھا جس میں مقام پروردگار کا انکار چھپا ہوا تھا ، کیونکہ وہ جو یہ کہتا ہے کہ : "میں آدم سے بہتر ہوں" درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو سجدہ کرنے کے بارے میں تیرا حکم حکمت و عدالت کے خلاف ہے اور "مرجوح" (پست) کو "راجح" (بلند) پر مقدم کرنے کا باعث ہے ، اس وجہ سے ، اس کے اس انکار کا رشتہ کفر سے اور پروردگار کی حکمت اور علم کے انکار سے ملا ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس مقام اور مرتبے سے گر گیا جو اسے بارگاہِ احدیت میں حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے اسے اس بلند مرتبہ سے نکال دیا۔ جو اس نے فرشتوں کی صفوں کے درمیان حاصل کیا تھا اور اس سے فرمایا : اس مقام و مرتبہ سے گر جا (قال فاھبط منھا)۔

اس آیت میں "منھا" میں جو ضمیر ہے اس کے بارے میں کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ "آسمان" یا "بہشت" کی طرف پلٹتی ہے جبکہ بعض مفسرین نے اس سے مراد "مقام و مرتبہ" لیا ہے ، اگرچہ نتیجے کے لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔

بعد ازاں اس جملے کے ذریعے اس کے سقوط و تنزل کی اصل وجہ بیان فرمائی ہے : تجھے اس بات کا حق نہیں کہ تو اس مقام و مرتبے میں تکبر کا راستہ اختیار کرے (فما یکون لک ان تتکبر فیھا) ۔

ایک مرتبہ مزید تاکید کے لیے فرمایا : "باہر نکل جا کہ تو پست و ذلیل افراد میں سے ہے (یعنی تو اپنے اس عمل

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد ۲ ص ۹ ۔

کی وجہ سے نہ صرف کسی بزرگی کو حاصل نہ کر سکا بلکہ پستی و خواری کے گڑھے میں جا گرا (فاخرج انک من الصاغرین)۔

اس جملے سے بخوبی واضح ہوگیا کہ شیطان کی تمام بدبختی اس کے تکبّر کی وجہ سے تھی۔ اس کی یہ خود پسندی اور غرور کہ اس نے خود کو اس مرتبے پر قرار دیا جس کا وہ حقیقت میں مستحق نہ تھا، اس امر کا سبب بنا کہ اس نے نہ صرف آدم کے لیے سجدہ نہ کیا بلکہ اس نے خدا کے علم و حکمت کا بھی انکار کر دیا اور اس کے فرمان پر نکتہ چینی کی جس کے نتیجے میں اس نے اپنا مقام و مرتبہ کھو دیا اور بجائے بزرگی کے ابدی پستی و ذلت کو خرید لیا۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اپنے مقصد و مراد کو نہ پا سکا بلکہ اس کے بالکل برعکس دوسری سمت میں نکل گیا۔

حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے نہج البلاغۃ کے خطبہ "قاصعہ" میں تکبّر، خود پسندی اور غرور کی مذمت میں یوں فرمایا ہے:

فاعتبروا بما کان من فعل اللہ بابلیس اذ احبط عملہ الطویل وجھدہ الجھید، وکان قد عبداللہ ستۃ آلاف .. عن کبر ساعۃ واحدۃ فمن ذا بعد ابلیس یسلم علی اللہ بمثل معصیتہ؟! کلّا ما کان اللہ سبحانہ لیدخل الجنۃ بشرًا بامر اخرج بہ منھا ملکًا ان حکمہ فی اھل السمآء واھل الارض لواحد[1]

عبرت حاصل کرو اس بات سے جو اللہ نے ابلیس کے بارے میں کی، اس وقت جبکہ شیطان کے تمام اعمال اس کی، طول و طویل عبادتیں، پیہم زحمتیں جو اس نے چھ ہزار سال کی طویل مدت میں خدا کی بندگی کی راہ میں انجام دی تھیں ... ایک گھڑی کے تکبّر کی وجہ سے اللہ نے ان سب کو برباد کر دیا۔ جب یہ کیفیت ہو تو ابلیس کے اس انجام کے بعد کس کی مجال ہے کہ وہی معصیت کر کے جو اس نے کی تھی عذاب الٰہی سے نجات حاصل کرے؟ نہیں، ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی انسان کو اس عمل کے ساتھ جنت عطا کرے جس کی وجہ سے ایک فرشتے[2] کو جنت سے باہر نکال دیا۔ اللہ کا حکم اہل آسمان و اہل زمین کے لیے ایک ہے۔

نیز ایک حدیث میں امام زین العابدین علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے:

گناہوں کی کئی قسمیں اور کئی اسباب ہیں، لیکن معصیت پروردگار کا سب سے بڑا سبب "تکبّر" ہے، جو ابلیس کا گناہ تھا، جس کی وجہ سے اس نے خدا کے فرمان سے انکار کیا اور تکبّر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا گناہ "حرص" بنا، جس کی بنا پر حضرت آدم و حوا سے گناہ (اور ترک اولیٰ) سرزد ہوا۔ اس کے بعد "حسد" ہے، جو اُن کے بیٹے (قابیل) کے گناہ کا سبب بنا،

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ مطابق نہج البلاغہ صبحی صالح۔

[2] یہاں شیطان پر لفظ "فرشتہ" کا اطلاق اس بنا پر کیا گیا کہ وہ فرشتوں کی صفوں میں شامل تھا نہ کہ وہ خود فرشتہ تھا جیسا کہ اس سے قبل بھی اسکی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

جس نے اپنے بھائی (ہابیل) سے حسد کیا اور اسے قتل کر دیا[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اصول الکفر ثلاثة الحرص والاستکبار والحسد، فاما الحرص فان ادم حین نھی عن الشجرة، حملہ الحرص علی ان اکل منھا، واما الاستکبار فابلیس حیث امر بالسجود لادم فابی، واما الحسد فابنا ادم حیث قتل احدھما صاحبہ[2]

کفر و معصیت کی جڑیں تین ہیں: حرص، تکبّر اور حسد۔ حرص اس بات کا سبب بنا کہ آدم نے شجرِ ممنوعہ سے کھایا، تکبّر کی وجہ سے ابلیس نے خدا کے فرمان کو ماننے سے انکار کیا۔ اب رہا حسد تو اس کی وجہ سے آدم کے ایک بیٹے نے دوسرے کو قتل کیا۔

لیکن شیطان کی داستان اسی جگہ پر ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے جب یہ دیکھا کہ وہ درگاہِ خداوندی سے نکال دیا گیا ہے تو اس کی سرکشی اور ہٹ دھرمی میں اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ اس نے بجائے شرمندگی اور توبہ کے اور بجائے اس کے کہ وہ خدا کی طرف پلٹے اور اپنی غلطی کی اعتراف کرے، اس نے خدا سے صرف اس بات کی درخواست کی کہ: "خدایا! مجھے دُنیا کے اختتام تک کے لیے مہلت عطا فرما دے اور زندگی عطا کر (قال انظرنی الیٰ یوم یبعثون)۔

اس کی یہ درخواست قبول ہوگئی اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا: تجھے مہلت دی جاتی ہے (قال انک من المنظرین)۔

اگرچہ اس آیت میں اس بات کی صراحت نہیں کی گئی کہ ابلیس کی درخواست کس حد تک منظور ہوئی لیکن سورہ حجر کی آیت ۳۸ میں ہے:

"اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَۙ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ"

تجھ کو ایک روزِ معیّن تک کے لیے مہلت دی گئی یعنی اس کی پوری درخواست منظور نہیں ہوئی بلکہ جس مقدار میں خدا نے چاہا اتنی مہلت عطا کی۔

انشاء اللہ ہم اس آیت کے ذیل میں اس بارے میں بحث کریں گے۔

لیکن اس نے جو یہ مہلت حاصل کی وہ اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی غلطی کا تدارک کرے بلکہ اس نے اس طولانی عمر کے حاصل کرنے کا مقصد اس طرح بیان کیا: اب جبکہ تُو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، تو میں بھی تیرے سیدھے راستے پر تاک لگا کر بیٹھوں گا (مورچہ بناؤں گا) اور ان (اولادِ آدم) کو راستے سے ہٹا دوں گا (قال

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۴۵۸ (مادہ کبر)۔

[2] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۱۹ باب اصول الکفر

فبمآ اغویتنی لاقعدن لهم صراطك المستقیم)۔

تاکہ جس طرح میں گمراہ ہوا ہوں اسی طرح وہ بھی گمراہ ہو جائیں ۔

مسلک جبر کا بانی بھی ابلیس تھا

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے اپنی برائت بیان کرنے کے لیے جبر کی نسبت خدا کی طرف دی اور کہا : "چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں بھی نسل آدم کی گمراہی کے لیے پوری کوشش کروں گا"۔

اگرچہ کچھ مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ جملہ "فبمآ اغویتنی" کی اس طرح سے تفسیر کریں کہ اس سے "جبر" نہ نکلے، لیکن بہ ظاہر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس جملہ کا ظاہر "جبر" کے معنی دیتا ہے اور شیطان سے بھی یہ کوئی بعید بات نہیں ہے ۔

اس امر کی گواہ حضرت امیرالمومنینؑ کی وہ حدیث ہے جو آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ جنگ صفین سے پلٹ رہے تھے اور ایک بوڑھے شخص نے آپ سے "قضاء و قدر" کے متعلق سوال کیا حضرتؑ نے اس کے جواب میں فرمایا :

"ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب قضاء و قدر الٰہی تھا"۔

اس سے وہ بوڑھا شخص یہ سمجھا کہ اس سے مراد وہی "مسئلہ جبر" ہے، حضرتؑ نے اس وقت اس کو بڑی شدت کے ساتھ اس خیال باطل سے روکا اور ایک طویل گفتگو کے ضمن میں اس سے فرمایا :

"تلك مقالة اخوان عبدة الاوثان وخصماء الرحمان و حزب الشیطان"

یہ بت پرستوں اور دشمنان خدا اور شیطانی گروہ کا مقولہ ہے [1]

اس کے بعد آپ نے "قضاء و قدر" کے معنی قضاء و قدر تشریعی کے کیے یعنی اس سے مراد خدا کے فرامین اور تکالیف شرعیہ ہیں، بہرحال اس سے معلوم ہوگیا کہ سب سے پہلے جس نے "مسلک جبریہ" کی حامی بھری وہ ـ شیطان ہی تھا۔

اس کے بعد شیطان نے اپنی بات کی مزید تائید و تاکید کے لیے یوں کہا : میں نہ صرف یہ کہ ان کے راستہ پر اپنا مورچہ قائم کروں گا بلکہ ان کے سامنے سے، پیچھے سے، داہنی جانب سے، بائیں جانب سے گویا چاروں طرف سے ان کے پاس آؤں گا جس کے نتیجے میں تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہ پائے گا (ثم لاٰتینهم من بین ایدیهم ومن خلفهم وعن ایمانهم وعن شمآئلهم ولا تجد اکثرهم شاکرین)۔

---

[1] اصول کافی جلد ۱ باب جبر و قدر ص ۱۲۰ ۔

مذکورہ بالا تعبیر سے ممکن ہے مراد یہ ہو کہ شیطان ہر طرف سے انسان کا محاصرہ کرے گا اور اسے گمراہ کرنے کے لیے ہر وسیلہ اختیار کرے گا اور یہ تعبیر ہماری روز مرّہ کی گفتگو میں بھی ملتی ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص چاروں طرف سے قرض میں یا مرض میں گھِر گیا ہے۔

اوپر اور نیچے کا ذکر نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زیادہ تر اور عموماً فعالیت ان چار طرف ہوتی ہے۔

لیکن ایک روایت جو امام محمد باقر علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے، اس میں ان - چار جہت - کی ایک گہری تفسیر ملتی ہے۔ اس میں ایک جگہ پر حضرتؑ فرماتے ہیں:

> شیطان جو "آگے سے" آتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت کو جو انسان کے آگے ہے اس کی نظر میں سبک کر دیتا ہے۔ اور پیچھے سے آنے کے معنی یہ ہیں کہ: شیطان انسان کو مال جمع کرنے اور اولاد کی خاطر بخل کرنے کے لیے ورغلاتا ہے۔ اور - داہنی طرف" سے آنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ انسان کے دل میں شک و شبہ ڈال کر اس کے امورِ معنوی کو ضائع کر دیتا ہے اور "بائیں طرف" سے آنے سے مراد یہ ہے کہ شیطان انسان کی نگاہ میں لذاتِ مادّی و شہواتِ دنیوی کو حسین بنا کر پیش کرتا ہے[1]

زیرِ بحث آیت کے آخر میں ایک مرتبہ اور شیطان کو یہ فرمان دیا جاتا ہے کہ وہ مقامِ قربِ الٰہی اور اپنی سابقہ منزلت اور درجے سے نکل جائے۔ بس اتنا فرق ہے کہ یہاں پر اس کے باہر نکل جانے کا فرمان شدید تر اور زیادہ تحقیر آمیز لہجے میں صادر ہوا ہے۔ یہ شاید شیطان کی جرأت و جسارت اور اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے جس کا اظہار اس نے افرادِ انسانی کو گمراہ کرنے کے سلسلے میں کیا تھا یعنی شروع میں اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، اسی لیے اس کے خروج کا حکم صادر ہوا، اس کے بعد اس نے ایک اور بڑا گناہ یہ کیا کہ خدا کے سامنے بنی آدم کو بہکانے کا عہد کیا اور ایسی بات کہی گویا وہ خدا کو دھمکی دے رہا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسا گناہ ہو سکتا ہے، لہٰذا خدا نے اس سے فرمایا: اس مقام سے بدترین ننگ و عار کے ساتھ نکل جا اور ذلت و خواری کے ساتھ نیچے اُتر جا (قال اخرج منها مذؤمًا مدحورًا)[2]

اور فرمایا: میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کرے گا میں جہنم کو تجھ سے اور اس سے بھر

---

[1] تفسیر - مجمع البیان - جلد ۴ ص ۴۰۳ -

[2] - مذؤوم - مادّہ - ذٔم - (بروزن "حتم") سے ہے جس کے معنی ہیں عیب شدید - مدحور - مادّہ - دحر - (بروزن "دھر") سے ہے جس کے معنی ہیں ذلت و خواری کے ساتھ باہر نکال دینا۔

دوں گا (لمن تبعك منهم لاملئن جهنم منكم اجمعين)۔

شیطان کی پیدائش اور اسے مہلت دینے کا فلسفہ

اس طرح کی بحثوں میں بالعموم مختلف سوال ذہن میں آتے ہیں جن میں سب سے اہم دو سوال ہیں :

۱۔ خدا نے شیطان کو کس لیے پیدا کیا ؟ جبکہ اُسے علم تھا کہ وہ ہر طرح کی گمراہی اور وسوسہ انگیزی کا سرچشمہ ہے ۔

۲۔ جبکہ شیطان اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوا تو اس کے بعد اللہ نے اُس کی درخواست کو کیوں منظور کیا کہ اسے ایک طولانی عمر دی جائے ؟

پہلے سوال کا جواب ہم نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں دیا ہے کہ :

اوّلاً۔ شروع میں شیطان کی خلقت پاک اور بے عیب تھی۔ اسی لیے وہ سالہائے دراز تک فرشتوں کی صفوں میں رہ کر عبادت کرتا رہا اور مقام قرب الٰہی پر فائز تھا، اگرچہ اپنی آفرینش کے لحاظ سے ان میں سے نہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آزادی سے سوء استفادہ کیا اور اپنی سرکشی وطغیان کی وجہ سے راندۂ بارگاہِ الٰہی ہوگیا اور اس نے۔ شیطان۔ کا لقب حاصل کیا ۔

ثانیاً۔ شیطان کا وجود راہ حق پر چلنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ ضرر رساں نہیں بلکہ یہ ان کی ترقی و کمال کا ایک امتیاز ہے کیونکہ انسان کے مقابلے میں ایک قوی دشمن کا وجود درحقیقت انسان کی قوت اور پنپنے کا ایک سبب ہے۔ آپ دیکھیں کہ جہاں بھی کوئی ترقی کرتا ہے وہاں اس کے سامنے کوئی متضاد چیز ضرور موجود ہوتی ہے۔ کوئی موجود راہ کمال میں اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتا جب تک اس کے سامنے کوئی زبردست مخالف موجود نہ ہو ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان اگرچہ اپنی آزادیٔ ارادہ کی وجہ سے اپنی بد اعمالیوں کا جواب دہ ہے لیکن اس کی وسوسہ انگیزیاں بندگان خدا کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو راہ حق پر گامزن ہونا چاہتے ہیں ضرر رساں نہیں بلکہ بالواسطہ ان کے لیے مفید ہیں ۔

دوسرے سوال کا جواب بھی اس بات سے ظاہر ہو جائے گا جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں کہی ہے کیونکہ ایک منفی نقطے کے طور پر اس کی زندگی کا اس لیے باقی رہنا تاکہ مثبت نقاط کو تقویت پہنچے نہ صرف اس میں کوئی ضرر نہیں بلکہ یہ مؤثر بھی ہے۔ حتیٰ کہ شیطان سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی خود ہمارے اندر بھی ایسے مختلف غرائز (طبایع) پائے جاتے ہیں جو عقلائی و روحانی قوتوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے ایک تضاد و اختلاف کا میدان کارزار بن جاتا ہے اور اس میدان میں انسان کی ترقی اور آگے بڑھنے کا راز مضمر ہوتا ہے۔ شیطان کی زندگی کا باقی رہنا بھی دراصل اسی تضاد کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں

میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ راہ راست ہمیشہ اس وقت پہچانی جاتی ہے جب اس کے پہلو میں بہت سی ٹیڑھی اور کج راہیں ہوں، جب تک ایسا نہ ہو گا راہ راست کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ، بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ چونکہ اتنے عظیم گناہ کے بعد شیطان نے جہان آخرت میں اپنی نجات و سعادت کو پورے طور سے خطرے میں ڈال دیا ہے، اور اسے اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی لہٰذا اس نے اپنی ان عبادتوں کے بدلے میں جو اس نے دار دنیا میں ادا کی تھیں، خدا سے طویل عمر کی خواہش کی، جو خدا کے قانون عدالت کی بنا پر قبول کر لی گئی۔

نیز اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ اگرچہ شیطان کو خدا نے گمراہ کرنے اور وسوسہ انگیزی کی پوری آزادی دے دی لیکن اس کے مقابلے میں انسان کو بھی بالکل نہتا اور بے دفاع نہیں رکھا کیونکہ اولاً، اسے عقل و خرد کی عظیم طاقت عطا کی جس کی وجہ سے اس کے امکان میں ہے کہ اس کی وجہ سے وسوسہ ہائے شیطانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک مضبوط بند قائم کر سکے (خصوصاً اگر اس کی صحیح طور سے تربیت کی جائے تو یہ طاقت اور بڑھ جاتی ہے)۔

دوم، یہ کہ انسان کی پاک فطرت اور اس کی نہاد میں چھپا ہوا ترقی کرنے کا عشق، یہ بھی خدا کا عطیہ ہے جو انسان کو سعادت ابدی کی طرف بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

سوم، یہ کہ جب شیطان بہکاتا ہے اور انسان اس سے بچنا چاہتا ہے لیکن کمزور پڑتا ہے تو ایسے موقع پر خداوند کریم اس کی مدد کرنے کے لیے ایسے فرشتوں کو بھیجتا ہے جو اسے نیکی کا الہام کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ.

وہ بندے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدائے یگانہ ہے، اس کے بعد اس قول پر باقی بھی رہتے ہیں، ان پر فرشتے نازل ہوتے رہتے ہیں (اور ان کے دلوں کو قوت بخشنے کے لیے بذریعہ الہام طرح طرح کی بشارتیں دیتے ہیں)۔ (حٰمٓ السجدہ۔ ۳۰)

اور ایک اور جگہ وارد ہوا ہے:

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا.

تیرا پروردگار فرشتوں کی طرف وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری مدد کرتا ہوں تاکہ باایمان بندوں کی راہ حق پر مدد کرو اور انہیں ثابت قدم رکھو۔ (انفال۔ ۱۲)

نظریہ تکامل انواع و پیدائش آدم

یہاں پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا آدم کی خلقت اس نظریہ تکامل سے مطابقت رکھتی ہے جسے علوم

طبعی (سائنس) میں بیان کیا جاتا ہے، یا نہیں؟ نیز یہ کہ اصولی طور پر نظریہ تکامل سائنسدانوں کی نظر میں مرحلۂ یقین پر پہنچا ہے یا نہیں؟ یہ بحثیں ضروری ہیں جنہیں انشاء اللہ ہم متعلقہ آیات کے ذیل (جیسے آیات ۲۶ تا ۳۳ سورۂ حجر) میں بیان کریں گے۔

(۱۹) وَيَادَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(۲۰) فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝

(۲۱) وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝

(۲۲) فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

(۱۹) اور اے آدم! تم، اور تمہاری زوجہ بہشت میں مقیم رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ، لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ستم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

(۲۰) اس کے بعد شیطان نے انہیں بھسلایا تاکہ وہ چیز جو ان کے اندام میں پوشیدہ ہے ظاہر ہو جائے، اور اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا

ہے لیکن اس لیے کہ (اگر اس سے کھا لو گے تو) فرشتہ بن جاؤ گے یا ہمیشہ کے لیے (بہشت میں) باقی رہو گے۔

(۲۱) اور اس نے ان کے سامنے یہ قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔

(۲۲) اور اس طرح سے ان کو دھوکا دے کر (ان کے مقام و درجہ سے) نیچے گرا دیا اور جس وقت انہوں نے اس درخت سے چکھا، ان کا اندام (شرم گاہ) ان کے لیے نمایاں ہو گیا، اور انہوں نے درخت کے پتوں کو ایک دوسرے پر رکھنا شروع کیا تاکہ اس کو چھپائیں ان کے پروردگار نے ان کو ندا کی کہ آیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟!

تفسیر

دلفریب انداز میں شیطانی وسوسے

ان آیات میں سرگزشتِ آدم کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: خدا نے آدم اور ان کی زوجہ (حوّا) کو یہ حکم دیا کہ بہشت میں سکونت اختیار کریں (و یاآدم اسکن انت وزجک الجنة)۔

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوّا اپنی پیدائش کے وقت بہشت میں نہ تھے۔ خلقت کے بعد انہیں بہشت کی طرف بھیجا گیا۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی اُن آیات میں بھی جو پیدائشِ آدم سے متعلق ہیں توجہ دلائی ہے، کہ قرائن بتلاتے ہیں کہ یہ بہشت وہ جنت نہ تھی جس کا قیامت میں وعدہ کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ احادیث اہلبیت طاہرین علیہم السلام میں بھی وارد ہوا ہے یہ اسی دُنیا کا ایک سرسبز و شاداب باغ تھا، جس میں خدا کی طرح طرح کی نعمتیں مہیا کی گئی تھیں [۱]۔

اس موقع پر پہلی ذمہ داری اور امر و نہیٔ الٰہی اس شکل میں ظاہر ہوئی:

تم بہشت کے ہر درخت سے کھا سکتے ہو، لیکن خبردار اس مخصوص درخت کے پاس بھی نہ جانا ورنہ ستم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے (فکلا من حیث شئتما ولا تقربا ھٰذہ الشجرة فتکونا من الظّٰلمین)۔

---

[۱] تفسیر نمونہ جلد اوّل ص ۱۶۳، اُردو ترجمہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس کے بعد شیطان، جو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے مردُودِ بارگاہِ الٰہی ہوگیا تھا اور اس نے یہ پکّا ارادہ کرلیا تھا کہ جس طرح بھی ہوگا آدم اور ان کی اولاد سے اس شکست کا انتقام لے گا اور انہیں راہِ راست سے بہکانے کی کوشش کرے گا، نیز اس کو یہ بھی علم تھا کہ اگر آدم نے اس ممنوع درخت سے کھا لیا تو وہ بہشت سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالنا چاہا اور اپنے اس ناپاک مقصد تک پہنچنے کے لیے اس نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔

اس نے سب سے پہلے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: انہیں پھسلانا شروع کیا، تاکہ اطاعت و بندگی کی خلعت ان کے بدن سے اتار دے اور ان کی شرمگاہ کو جو پوشیدہ تھی ظاہر کردے (فوسوس لهما الشیطان لیبدی لهما ماوٗری عنهما من سوٰتهما)۔

مقصد تک پہنچنے کے لیے اس نے بہترین طریقہ یہ پایا کہ انسان میں تکامل و ترقی کا جو جذبہ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی جاودانی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس سے استفادہ کرے، اور اسے مخالفت خدا کا ایک عذر و بہانہ بتلائے۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے آدم و حوّا سے یہ کہا: خدا نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ اگر تم اس سے کھالوگے تو یا فرشتے بن جاؤ گے اور یا عمر جاودانی حاصل کرلوگے: (و قال ما نهاكما ربكما عن هٰذه الشجرة الآ ان تكونا ملكين او تكونا من الخالدين)۔

اس طرح اس نے فرمان خدا کو ان کی نظر میں ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا اور انہیں یہ تصور دلانے کی کوشش کی کہ اس "شجرۂ ممنوعہ" سے کھا لینا نہ صرف یہ کہ ضرر رساں نہیں بلکہ عمر جاوداں یا ملائکہ کا مقام و مرتبہ پالینے کا موجب ہے۔

اس بات کی تائید اس جملے سے بھی ہوتی ہے جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰ میں شیطان کی زبانی وارد ہوا ہے:

یاآدم هل ادلك علی شجرة الخلد وملك لا یبلی۔

اے آدم! کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں زندگانی جاودانی اور ایسی سلطنت کی رہنمائی کروں جو کہنہ نہ ہوگی؟!

ایک روایت جو "تفسیر قمی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور "عیون اخبار الرضا" میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے یہی وارد ہوا ہے:

شیطان نے آدم سے کہا کہ اگر تم نے اس شجرۂ ممنوعہ سے کھا لیا تو تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور پھر ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہوگے، ورنہ تمہیں بہشت سے باہر نکال دیا جائے گا۔[1]

آدم نے جب یہ سنا تو فکر میں ڈوب گئے، لیکن شیطان نے اپنا حربہ مزید کارگر کرنے کے لیے "سخت قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا بھی خواہ ہوں"! (وقاسمهما انی لكما

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد دوم ص ۱۳۔

لمن الناصحین) ۔

آدم، جنہیں زندگی کا ابھی کافی تجربہ نہ تھا، نہ ہی وہ ابھی تک شیطان کے دھوکے، جھوٹ اور نیرنگ میں گرفتار ہوئے تھے، انہیں یہ یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اتنی بڑی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے اور اس طرح کے جال دوسرے کو گرفتار کرنے کے لیے پھیلا سکتا ہے۔ آخرکار وہ شیطان کے فریب میں آگئے اور آب حیات و سلطنت جاودانی حاصل کرنے کے شوق میں مکرِ ابلیسی کی بوسیدہ رسّی کو پکڑ کے اس کے وسوسہ کے کنویں میں اتر گئے، رسّی ٹوٹ گئی اور انہیں نہ صرف آب حیات ہاتھ نہ آیا بلکہ خدا کی نافرمانی کے گرداب میں گرفتار ہو گئے۔ اس تمام مطلب کو قرآن کریم نے اپنے ایک جملے میں خلاصہ کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: " اس طرح سے شیطان نے انہیں دھوکا دیا اور اس نے اپنی رسی سے انہیں کنویں میں اتار دیا (فدلّٰھما بغرور[1]) ۔

شیطان کی سابقہ دشمنی اور خدا کی وسیع حکمت و رحمت اور اس کی محبت و مہربانی سے آگاہ ہوتے ہوئے آدم کو چاہیئے تو یہ تھا کہ شیطان کے تمام فریب و وسوسہ کے جال کو پارہ پارہ کر دیتے اور اس کے کہنے میں نہ آتے لیکن جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہو گیا۔

بس جیسے ہی آدم و حوّا نے اس ممنوعہ درخت سے چکھا، فوراً ہی ان کے کپڑے ان کے بدنوں سے نیچے گر گئے اور ان کے اندام ظاہر ہو گئے (فلما ذاقا الشجرۃ بدت لھما سوآتھما) ۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ درختِ ممنوع سے چکھنے کے ساتھ ہی فوراً اس کا اثر بد ظاہر ہو گیا اور وہ اپنے بہشتی لباس سے جو فی الحقیقت خدا کی کرامت و احترام کا لباس تھا، محروم ہو کر برہنہ ہو گئے۔

اس آیت سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آدم و حوّا یہ مخالفت کرنے سے پہلے برہنہ نہ تھے بلکہ کپڑے پہنے ہوئے تھے، اگرچہ قرآن میں ان کپڑوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی لیکن جو کچھ بھی تھا وہ آدم و حوّا کے وقار کے مطابق اور ان کے احترام کے لیے تھا جو اُن کی نافرمانی کے باعث ان سے واپس لے لیا گیا۔

لیکن خود ساختہ توریت میں اس طرح سے ہے:

> آدم و حوّا اس موقع پر بالکل برہنہ تھے لیکن اس برہنگی کی زشتی کو نہیں سمجھتے تھے، لیکن جس وقت انہوں نے اس درخت سے کھایا جو درحقیقت "علم و دانش" کا درخت تھا تو ان کی عقل کی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ اپنے کو برہنہ محسوس کرنے لگے اور اس حالت کی زشتی سے آگاہ ہو گئے۔

---

[1] "دلّی" مادّہ "تدلیہ" سے ہے جس کے معنی ہیں کنویں میں ڈول ڈالنا جسے رسّی میں باندھ کر تدریجاً کنویں میں اتارا جائے یہ درحقیقت اس لطیف معنی سے کنایہ ہے کہ شیطان نے اپنے مکر و فریب کی رسی سے انہیں باندھ کر ان کے بلند مرتبے سے نیچے اتار دیا اور یوں مشکلات اور رحمت خداوندی سے دوری کے کنویں میں گرا دیا۔

جس "آدم" کا حال اس خود ساختہ توریت میں بیان کیا گیا ہے، وہ فی الحقیقت آدم واقعی نہ تھا بلکہ وہ تو کوئی ایسا نادان شخص تھا جو علم و دانش سے اس قدر دُور تھا کہ اسے اپنے ننگا ہونے کا بھی احساس نہ تھا لیکن جس "آدم" کا قرآن تعارف کراتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اپنی حالت سے باخبر تھا بلکہ اسرار آفرینش (علم اسماء) سے بھی آگاہ تھا اور اسکا شمار معلم ملکوت میں ہوتا تھا، اگر شیطان اس پر اثر انداز بھی ہوا تو یہ اس کی نادانی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس نے ان کی پاکی اور صفائے نیت سے سوئے استفادہ کیا۔

اس بات کی تائید اسی سورۂ اعراف کی آیت ۲۷ سے بھی ہوتی ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

"یا بنیٓ اٰدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنة ینزع عنہما لباسہما"

اے اولادِ آدم! کہیں شیطان تمہیں اس طرح فریب نہ دے جس طرح تمہارے والدین (آدم و حوّا) کو دھوکا دے کر بہشت سے باہر نکال دیا اور ان کا لباس ان سے جُدا کر دیا۔

اگر بعض مفسّرین اسلام نے یہ لکھا ہے کہ آغاز میں حضرت آدم برہنہ تھے تو واقعاً یہ ایک واضح اشتباہ ہے جو توریت کی تحریر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

بہر حال اس کے بعد قرآن کہتا ہے: "جس وقت آدم و حوّا نے یہ دیکھا تو فوراً بہشت کے درختوں کے پتوں سے اپنی شرم گاہ چھپانے لگے (وطفقا یخصفان علیہما من ورق الجنة)"[1]

اس موقع پر خدا کی طرف سے یہ ندا آئی: "کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا، کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، تم نے کس لیے میرے حکم کو بھلا دیا اور اس پست گرداب میں گِھر گئے؟!" (وناداھما ربھما الم انھکما عن تلکما الشجرة واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین)۔

یہ آیت اور وہ پہلی آیت جس میں آدم و حوّا کو بہشت میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی تھی دونوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اس نافرمانی کے بعد مقام قرب الٰہی سے کس قدر دور ہو گئے تھے حتّٰی کہ بہشت کے درختوں سے بھی دور ہو گئے کیونکہ اس سے قبل کی آیت میں "ھٰذہ الشجرة" (یہ درخت) کہا گیا ہے جو نزدیک کے لیے اشارہ ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں جملہ "نادیٰ" (ندا کی) آیا ہے جو دُور کے لیے خطاب ہے، نیز کلمہ "تلکما" بھی دُوری کے لیے ہے۔

---

[1] "یخصفان" مادّہ "خصف" (بروزن خشم) سے ہے جس کے معنی ہیں ایک شے کو دوسری شے سے ملانا اور جمع کرنا۔ بعد میں یہ لفظ جُوتا یا کپڑا سینے کے لیے یا پیوند لگانے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ کیونکہ سینے میں مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے۔

چند نکات

۱۔ شیطانی وسوسے اور انسانی آزادی

"وسوس لہ" (کہ جس میں کلمہ لام بھی استعمال ہوا ہے جو عام طور سے فائدے اور نفع کے لیے آتا ہے)، سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالنے میں آدم کی خیر خواہی اور دوستی کا روپ بھرا تھا، جبکہ "وسوس الیہ" سے یہ معنی برآمد نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی صرف کسی کے دل میں مخفی طور سے اثر ڈالنے کے ہیں۔ لیکن ہر حال میں، یہ تصوّر نہ ہو کہ شیطانی وسوسے چاہے وہ جتنے بھی قوی اور مضبوط کیوں نہ ہوں انسان سے اس کی خود مختاری اور ارادہ سلب کر لیتے ہیں، بلکہ اس کے بعد بھی انسان اپنی عقل اور ایمان کی طاقت سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ شیطانی وسوسے انسان کو بُرے کاموں پر مجبور نہیں کر دیتے بلکہ اختیار و ارادہ کی قوت اپنے حال پر باقی رہتی ہے۔ تاہم ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پامردی و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس میں کبھی بڑے رنج و الم کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن ان تمام حالات میں اس طرح کے وسوسے کسی کی ذمہ داری اور مسئولیت ختم نہیں کر دیتے، جس طرح آدم سے نہیں کی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ان تمام تحریکوں اور ترغیبوں کے باوجود جو آدم کے بہکانے کے لیے شیطان نے انجام دیں، خدا تعالےٰ نے آدم کو ان کے عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اسی بنا پر جیسا کہ آگے آئے گا انہیں اس کی پاداش بھی دی۔

۲۔ شجرۂ ممنوعہ کونسا درخت تھا؟

قرآن کریم میں بلا تفصیل اور بغیر نام کے چھ مقام پر "شجرۂ ممنوعہ" کا ذکر ہوا ہے لیکن کتب اسلامی میں اس کی تفسیر دو قسم کی ملتی ہے۔ ایک تو اس کی تفسیر مادی ہے جو حسب روایات "گندم" ہے[1]

اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیئے کہ عرب لفظ "شجرہ" کا اطلاق صرف درخت پر نہیں کرتے، بلکہ مختلف نباتات کو بھی "شجرہ" کہتے ہیں، چاہے وہ جھاڑی کی شکل میں ہوں یا بیل کی صورت میں۔ اسی بنا پر قرآن میں "کدو" کی بیل کو بھی شجرہ کہا گیا ہے۔

وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (صافات ۱۴۶)

دوسری تفسیر معنوی ہے جس کی تعبیر روایاتِ اہلبیت علیہم السلام میں "شجرۂ حسد" سے کی گئی ہے۔ ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ آدم نے جب اپنا مقام بلند و درجہ رفیع دیکھا تو یہ تصوّر کیا کہ ان کا مقام بہت بلند ہے اس سے بلند کوئی مخلوق اللہ نے نہیں پیدا کی۔ اس پر اللہ نے انہیں بتلایا کہ ان کی اولاد میں کچھ ایسے اولیاء الٰہی (پیغمبر اسلام اور ان کے اہلبیت کرام علیہم السلام) بھی ہیں جن کا درجہ ان سے بھی بلند و بالا ہے۔ اس وقت آدم

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد اوّل ص ۵۹ - ۶۰ و جلد دوم ص ۱۱ تفسیر سورۂ بقرہ و اعراف۔

میں ایک حالت حسد سے مشابہ پیدا ہوئی[1] اور یہی وہ "شجرۂ ممنوعہ" تھا جس کے نزدیک جانے سے آدم کو روکا گیا تھا[2]

حقیقت امر یہ ہے کہ آدم نے (ان روایات کی بنا پر) دو درختوں سے تناول کیا۔ ایک درخت تو وہ تھا جو ان کے مقام سے نیچے تھا، اور انہیں مادی دنیا میں لے جاتا تھا اور وہ "گندم" کا پودا تھا۔ دوسرا درخت معنوی تھا، جو مخصوص اولیائے الٰہی کا درجہ تھا اور یہ آدم کے مقام و مرتبہ سے بالاتر تھا۔ آدم نے دونوں پہلوؤں سے اپنی حد سے تجاوز کیا اس لیے ایسے انجام میں گرفتار ہوئے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ یہ "حسد" حسد حرام کی قسم سے نہ تھا، یہ صرف ایک نفسانی احساس تھا جبکہ انہوں نے اس طرف قطعاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے آیاتِ قرآنی چونکہ متعدد معانی کی حامل ہیں لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ "شجرہ" سے دونوں معنی مراد لے لیے جائیں۔

اتفاقاً کلمہ "شجرہ" قرآن مجید میں دونوں معنی میں آیا ہے، کبھی تو انہی عام درختوں کے معنی میں، جیسے:

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاۤءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ (مومنون - ۲۰)۔

جس سے مراد زیتون کا درخت ہے، اور کبھی شجرہ معنوی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِى الْقُرْاٰنِ (اسراء - ۶۰)۔

جس سے مراد مشرکین یا یہودی یا دوسری باغی قومیں (جیسے بنی امیہ) ہیں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس کے اور معنی بھی بیان کیے ہیں مگر سب سے واضح تر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

لیکن یہاں پر ایک نکتہ ہے جس کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے (اگرچہ جلد اول میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے) اور وہ یہ ہے کہ موجودہ خود ساختہ توریت میں، جو اس وقت کے تمام یہود و نصاریٰ کی قبول شدہ ہے اس شجرہ ممنوعہ کی تفسیر "شجرہ علم و دانش اور شجرہ حیات و زندگی" کی گئی ہے توریت کہتی ہے:

"قبل اس کے کہ آدم شجرۂ علم و دانش سے تناول کریں، وہ علم و دانش سے بے بہرہ تھے حتیٰ کہ انہیں اپنی برہنگی کا بھی احساس نہ تھا۔ جب انہوں نے اس درخت سے کھایا اس وقت وہ واقعی آدم بنے اور بہشت سے نکال دیئے گئے، کہ مبادا درختِ حیات و زندگی سے بھی کھالیں اور خداؤں کی طرح حیاتِ جاودانی حاصل کرلیں"[3]

یہ عبارت اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ موجودہ توریت آسمانی کتاب نہیں بلکہ کسی ایسے کم اطلاع

---

[1] یہاں پر حسد سے مراد رشک ہے جو مستحسن ہے، لیکن در باب محمد و آل محمد علیہم السلام رشک بھی ممنوع ہے، جیسا کہ قصہ آدم سے ظاہر ہے۔ عربی میں حسد کا اطلاق رشک پر بھی ہوا ہے۔ (مترجم)

[2] تفسیر، نور الثقلین۔ جلد اول ص ۵۹ - ۶۰ و جلد دوم ص ۱۱ تفسیر سورۂ بقرہ و اعراف۔

[3] سفر تکوین فصل دوم نمبر ۱۷۔

انسان کی ساختہ ہے جو علم و دانش کو آدم کے لیے معیوب سمجھتا تھا اور آدم کو علم و دانش حاصل کرنے کے جرم میں خدا کی بہشت سے نکالے جانے کا مستحق سمجھتا تھا۔ گویا بہشت فہمیدہ انسانوں کے لیے نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ولیم میلر (جسے عہدین خصوصاً انجیل کا ایک مقتدر مفسر مانا گیا ہے) اپنی کتاب "مسیحیت چیست" (مسیحیت کیا ہے؟) میں رقمطراز ہے:

> شیطان ایک سانپ کی شکل میں باغ کے اندر داخل ہوا اور اس نے حوا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس درخت کے میوہ میں سے کھالیں۔ چنانچہ حوا نے خود بھی کھایا اور آدم کو کھانے کو دیا اور انہوں نے بھی کھایا۔ ہمارے اوّلین والدین کا یہ عمل ایک معمولی اشتباہ پر مبنی نہ تھا یا ایک بے سوچی سمجھی خطا بھی نہ تھی بلکہ اپنے خالق کے برخلاف ایک جانا بوجھا عصیان تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ خود "خدا" بن جائیں۔ وہ اس بات کے لیے آمادہ نہ تھے کہ خدا کے ارادہ کے مطیع بنیں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ خدا نے ان کی شدت سے سرزنش کی اور باغ (فردوس) سے باہر نکال دیا تاکہ درد و رنج سے بھری دُنیا میں زندگی بسر کریں۔[1]

توریت و انجیل کے اس مفسر نے درحقیقت یہ چاہا ہے کہ "شجرۂ ممنوعہ" کی توجیہ کرے لیکن اس کی بجائے عظیم ترین گناہ یعنی خدا سے جنگ کی نسبت آدم کی طرف دے دی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ بجائے اس طرح کی پوچ تفسیروں کے کم ازکم اپنی "کتب مقدسہ" میں تحریف کے قائل ہو جاتے۔

۲۔ آیا آدم نے گناہ کیا تھا؟

یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ سے ہم نے جو مذکورہ بالا عبارت پیش کی اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس بات کے معتقد ہیں کہ آدم گناہ و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے بلکہ ان کا گناہ کوئی معمولی گناہ نہیں تھا۔ ان سے ایک سنگین گناہ سرزد ہوا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مقام ربوبیت سے جنگ کی ٹھان لی لیکن مدارک اسلامی چاہے وہ عقل کی رُو سے ہوں یا آیات و روایات ہوں، ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی پیغمبر گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ ہی پیشوائی خلق کا منصب کسی گناہگار کو سونپا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت آدمؑ انبیائے الٰہی میں سے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت یا دیگر آیات جن میں عصیان کی نسبت دیگر انبیاء کی طرف دی گئی ہے۔ سب سے مراد "عصیان نسبی" اور "ترک اولیٰ" ہے نہ کہ مطلق گناہ۔

جاننا چاہیئے کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک "گناہ مطلق" دوسرے "گناہ نسبی"۔ گناہ مطلق کے مفہوم میں نہی تحریمی کی مخالفت اور خدا کے فرمان قطعی اور ہر طرح کے واجب کو ترک کرنا یا کوئی حرام کام

---

[1] کتاب "مسیحیت چیست؟"، ص ۱۶۔

انسان کی ساختہ ہے جو علم و دانش کو آدم کے لیے معیوب سمجھتا تھا اور آدم کو علم و دانش حاصل کرنے کے جرم میں خدا کی بہشت سے نکالے جانے کا مستحق سمجھتا تھا۔ گویا بہشت فہیدہ انسانوں کے لیے نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ولیم میلر (جسے عہدین خصوصاً انجیل کا ایک مقتدر مفسر مانا گیا ہے) اپنی کتاب مسیحیت چیست (مسیحیت کیا ہے؟) میں رقمطراز ہے:

شیطان ایک سانپ کی شکل میں باغ کے اندر داخل ہوا اور اس نے حوّا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس درخت کے میوہ میں سے کھالیں۔ چنانچہ حوّا نے خود بھی کھایا اور آدم کو کھانے کو دیا اور انہوں نے بھی کھایا۔ ہمارے اوّلین والدین کا یہ عمل ایک معمولی اشتباہ پر مبنی نہ تھا یا ایک بے سوچی سمجھی خطا بھی نہ تھی بلکہ اپنے خالق کے برخلاف ایک جانا بوجھا عصیان تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ خود "خدا" بن جائیں۔ وہ اس بات کے لیے آمادہ نہ تھے کہ خدا کے ارادہ کے مطیع بنیں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ خدا نے ان کی شدّت سے سرزنش کی اور باغ (فردوس) سے باہر نکال دیا تاکہ درد و رنج سے بھری دُنیا میں زندگی بسر کریں [1]

توریت و انجیل کے اس مفسّر نے درحقیقت یہ چاہا ہے کہ "شجرۂ ممنوعہ" کی توجیہ کرے لیکن اس کی بجائے عظیم ترین گناہ یعنی خدا سے جنگ کی نسبت آدم کی طرف دے دی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ بجائے اس طرح کی پوچ تفسیروں کے کم از کم اپنی "کتب مقدسہ" میں تحریف کے قائل ہو جاتے۔

۲۔ آیا آدم نے گناہ کیا تھا؟

یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ سے ہم نے جو مذکورہ بالا عبارت پیش کی اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس بات کے معتقد ہیں کہ آدم گناہ و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے بلکہ ان کا گناہ کوئی معمولی گناہ نہیں تھا۔ ان سے ایک سنگین گناہ سرزد ہوا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مقام ربوبیت سے جنگ کی ٹھان لی لیکن مدارکِ اسلامی چاہے وہ عقل کی رُو سے ہوں یا آیات و روایات ہوں، ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی پیغمبر گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ ہی پیشوائی خلق کا منصب کسی گنہگار کو سونپا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت آدمؑ انبیائے الٰہی میں سے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت یا دیگر آیات جن میں عصیان کی نسبت دیگر انبیاء کی طرف دی گئی ہے، سب سے مراد "عصیان نسبی" اور "ترک اولیٰ" ہے نہ کہ مطلق گناہ۔

جاننا چاہیئے کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک "گناہ مطلق" دوسرے "گناہ نسبی"۔ گناہ مطلق کے مفہوم میں نہی تحریمی کی مخالفت اور خدا کے فرمان قطعی اور ہر طرح کے واجب کو ترک کرنا یا کوئی حرام کام

---

[1] کتاب "مسیحیت چیست؟" ص ۱۷۔

انجام دینا شامل ہے۔

لیکن گناہ نسبی یہ ہے کہ کسی بلند پایہ شخص سے کوئی ایسا غیر حرام عمل انجام پائے جو اس کی شان اور مقام کے مناسب نہ ہو کیونکہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل مباح و جائز، بلکہ عمل مستحب ایک بڑے درجہ کے انسان کے مناسب نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس عمل کو "گناہ نسبی" کہا جائے گا، مثلاً اگر کوئی باایمان اور ثروتمند شخص کسی فقیر کو فقر و افلاس کے پنجے سے نجات دینے کے لیے اس کی بہت معمولی سی مدد کرے۔ بلاشبہ یہ مدد چاہے جتنی بھی کم ہو حرام تو نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے، لیکن جو بھی سُنے گا مذمت کرے گا، گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس صاحب ایمان ثروت مند سے زیادہ مدد کی توقع کی جاتی تھی۔

اسی نسبت سے جو اعمال مقربان بارگاہِ الٰہی سے سرزد ہوتے ہیں، وہ ان کے مقام کے لحاظ سے پرکھے جاتے ہیں اگر وہ ان کے معیار پر پورے نہ اتریں تو اس کے لیے بھی کبھی عصیان یا ذنب (گناہ) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے[۱] مثال کے طور پر ایک نماز (جس میں حضور قلب نہ ہو) ایک عام شخص کے لحاظ سے ایک ممتاز نماز محسوب کی جائے گی لیکن یہی نماز اولیائے حق کے لحاظ سے "گناہ" شمار ہوگی، کیونکہ ان کے مقام کے لحاظ سے حالتِ نماز میں ایک لحظہ کی غفلت مناسب و شائستہ نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے علم و تقویٰ کی بناء پر ہنگام عبادت میں اس کے جمال و جلال میں غرق ہو جانا چاہیئے۔

عبادت کے علاوہ ان کے دیگر اعمال کا حال بھی یہی ہے۔ انہیں بھی ان کے مقام کے لحاظ سے جانچا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اگر ایک "ترکِ اولیٰ" ان سے سرزد ہو جائے تو وہ پروردگارِ عالم کے عتاب و سرزنش کا باعث بنے گا (ترکِ اولیٰ سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی بہتر کام کو ترک کرکے کارِ خوب یا عمل مباح بجا لائے)۔

روایاتِ اسلامی میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کے مصائب اور فراقِ فرزند کے سلسلے میں انہیں جو زحمتیں اٹھانا پڑیں اس وجہ سے تھیں کہ ایک محتاج روزہ دار مغرب کے وقت ان کے دروازہ پر آیا اور انہوں نے اس کی مدد سے غفلت کی جس کی وجہ سے وہ فقیر بھوکا اور دل شکستہ واپس چلا گیا۔

یہ عمل اگر ایک عام فرد سے سرزد ہوا ہوتا تو شاید اس کی اس قدر اہمیت نہ ہوتی لیکن خدا کے ایک عظیم پیغمبر اور رہبر امت سے جب یہ عمل ظاہر ہوا تو خدا نے اسے اتنی اہمیت دی کہ ان کیلئے نہایت شدید پاداش مقرر کی[۲]

آدم کو "شجرۂ ممنوعہ" سے جو نہی کی گئی تھی وہ بھی "نہی تحریمی" نہ تھی، بلکہ "ترکِ اولیٰ" تھا لیکن آدم کے

---

[۱] جیسا کہ کہا گیا ہے کہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" یعنی کبھی نیک افراد کے لحاظ سے جو عمل حسنہ شمار ہوتا ہے، وہی عمل مقربان بارگاہ الٰہی کے لحاظ سے گناہ شمار ہوتا ہے۔ (مترجم)

[۲] تفسیر "نور الثقلین" جلد دوم ص ۴۱۱ نقل از کتاب "علل الشرائع"۔

(۲۴) قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

(۲۵) قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ ع ۵

ترجمہ

(۲۳) ان دونوں نے کہا، پروردگارا! ہم نے اپنی جانوں پر ستم کیا، اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

(۲۴) (خدا نے) فرمایا: (اپنے مقام سے) نیچے اتر جاؤ اس حال میں کہ ایک دوسرے کے دشمن ہوگے (شیطان تم دونوں کا دشمن اور تم دونوں اس کے دشمن) اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک مدت تک کے لیے وسائل زندگی مہیا ہیں۔

(۲۵) (خدا نے) فرمایا: اسی (زمین) میں جیو گے، اسی میں مرو گے، اور اسی سے (بروز محشر) باھر نکلو گے۔

تفسیر

آدمؑ کی بازگشت خدا کی طرف

آخر کار جب آدم و حوّا نے شیطان کی چال کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا اور مخالفت کرنے کا نتیجہ ان کے سامنے آگیا تو انہیں اپنے گذشتہ نقصان کی تلافی کی فکر لاحق ہوئی. چنانچہ انہوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے اوپر جو ظلم و ستم کیا تھا اس کا خدا کی بارگاہ میں اعتراف کیا اور کہا: اے پروردگارا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم و ستم کیا (قالا ربنا ظلمنآ انفسنا)۔

اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور اپنی رحمت ہمارے شامل حال نہ کرے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں

میں سے ہو جائیں گے (وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین)۔

خدا کی طرف پلٹنے کے سلسلہ میں اور اصلاح مفاسد کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی عزور اور ہٹ دھرمی کی سواری سے نیچے اتر آئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرے ، ایک ایسا اعتراف جو اس کی اصلاح کرنے والا ہو اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں مدد کرے ۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ آدمؑ و حواؑ نے توبہ اور طلب عفو میں یہ ادب ملحوظ رکھا کہ یہ بھی نہ کہا کہ خدایا ! ہمیں بخش دے (اغفرلنا) بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تو ہمیں نہ بخشے گا تو ہم گھاٹا اٹھائیں گے !

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہر گناہ اور اس کی ہر نافرمانی اپنے اوپر ظلم و ستم کا کرنا ہے کیونکہ جتنے بھی احکام و قوانین ہیں سب کے سب سعادتِ انسانی اور اس کے تکامل کے لیے بنائے گئے ہیں بنابریں ان قوانین کی جو بھی خلاف ورزی ہو گی وہ تکامل کی راہ میں حائل ہو کر انسان کے تنزل کا باعث بنے گی۔ آدم و حوا نے بھی اگرچہ گناہ واقعی نہیں کیا تھا لیکن یہی ترکِ اولیٰ ان کے لیے اپنے بلند و بالا مقام سے نیچے اتر آنے کا باعث بن گیا ۔

اگرچہ آدم و حوا کی خالص توبہ خدا کی بارگاہ میں درجۂ قبولیت پر فائز ہو گئی ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۷ میں ہم نے پڑھا کہ " فتاب علیہ " (خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی) لیکن اس ترکِ اولیٰ کا جو لازمی نتیجہ تھا وہ ظاہر ہو کر رہا کیونکہ انہیں یہ حکم ملا کہ بہشت سے باہر نکل جائیں فرمایا : نیچے اتر جاؤ اس طرح سے تم (یعنی انسان اور شیطان) ایک دوسرے کے دشمن ہو گے (قال اھبطوا بعضکم لبعض عدو)۔

اور زمین ایک مدت تک تمہاری قرارگاہ اور زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے ایک وسیلہ بنے گی (ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین)۔

نیز یہ بات بھی ان کے کان میں ڈال دی کہ تم زمین میں زندگی کے دن پورے کرو گے ، اسی میں مرو گے اور بروز محشر حساب کتاب کے لیے اسی سے برآمد بھی ہو گے (قال فیھا تحیون وفیھا تموتون ومنھا تخرجون)۔

اس آیت " قال اھبطوا بعضکم لبعض عدو " سے ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے آدم و حوا اور شیطان سب مراد ہیں لیکن بعد والی آیت اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے صرف آدم و حوا مراد ہیں کیونکہ انہی کا حشر و نشر زمین سے ہو گا ۔

❊ ❊ ❊

آدمؑ کا ماجرا اور اس جہان پر ایک طائرانہ نظر

اگرچہ بعض ایسے مفسرین نے جو افکار غرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں، اس بات کی کوشش کی ہے کہ حضرت آدم اور ان کی زوجہ کی داستان کو اوّل سے لے کر آخر تک تشبیہ، مجاز اور کنایہ کا رنگ دیں اور آج کی اصطلاح میں یوں کہیں کہ یہ ایک سمبولک (SIMBOLIC) تھا لہذا انہوں نے اس پوری بحث کو ظاہری مفہوم کے خلاف لیتے ہوئے مسائل معنوی سے کنایہ مراد لیا ہے لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان آیات کا ظاہر ایک ایسے واقعی اور حقیقی - قصّہ - پر مشتمل ہے جو ہمارے اولین ماں باپ کو پیش آیا تھا۔ چونکہ اس پوری داستان میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جو ظاہری عبارت سے میل نہ کھاتا ہو یا عقل کے خلاف ہو، اس لیے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے ظاہری مفہوم پر یقین نہ کیا جائے یا جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان سے پہلو تہی کی جائے۔

لیکن در این حال اس حسّی و عینی واقعہ میں کچھ انسان کی آئندہ زندگی کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔

یعنی: انسان کو اس پُر جنجال زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آ سکتے ہیں جو قصّۂ آدم و حوا سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرف تو وہ انسان ہے جو قوت، عقل اور ہوا و ہوس سے مرکب ہے، یہ دونوں طاقتیں اسے مختلف جہتوں میں کھینچ رہی ہیں۔ دوسری طرف کچھ ایسے جھوٹے رہبر ہیں جن کا ماضی شیطان کی طرح جانا پہچانا ہے اور وہ انسان کو اس بات پر اکسا رہے ہیں کہ عقل پر پردہ ڈال کر ہوا و ہوس کو اختیار کر لو تاکہ یہ بے چارہ انسان پانی کی امید میں "سراب" کو آب سمجھ کر ریگستانوں میں بھٹک کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔

ایسے شیطانوں کے بہکانے میں آجانے کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے جسم سے - لباس تقویٰ - گر جاتا ہے اور اس کے اندرونی عیوب عیاں و آشکارا ہو جاتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقام قرب الٰہی سے دُور ہو جاتا ہے اور انسان کا جو بلند مقام ہے اس سے گر جاتا ہے اور سکون و اطمینان کی بہشت سے نکل کر حیاتِ مادی کی مشکلات و آفات کے جنگلوں میں گھر جاتا ہے۔

اس موقع پر بھی عقل کی طاقت اس کی مدد کر سکتی ہے اور اسے اس نقصان کی تلافی کا موقع فراہم کر سکتی ہے اور اسے خدا کی بارگاہ میں دوبارہ بھیج سکتی ہے تاکہ جرأت و صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔ ایسا اعتراف جو اس کی زندگی کی تعمیر نو کا ضامن ہو اور اس کی زندگی کا ایک نیا موڑ بن جائے۔

یہی وہ موقع ہوتا ہے جبکہ دست رحمت الٰہی بار دیگر اس کی طرف دراز ہوتا ہے تاکہ اسے ہمیشہ کے انحطاط اور تنزل سے نجات دے۔ اگرچہ اپنے گذشتہ گناہ کا تلخ مزا اس کے کام و دہن میں باقی رہ جاتا ہے جو اس کا اثر وضعی ہے۔ لیکن یہ ماجرا، اس کے لیے درس عبرت بن جاتا ہے کیونکہ وہ اس شکست کے تجربہ سے

اپنی حیاتِ ثانیہ کی بنیاد مستحکم کر سکتا ہے اور اس نقصان و زیان کے ذریعے سُرورِ آئندہ فراہم کر سکتا ہے۔

(۲۶) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

(۲۷) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

(۲۸) وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

(۲۶) اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا تاکہ تمہارے اندام کو ڈھانپے اور تمہارے لیے زینت بنے، اور تقوے کا لباس اس سے بہتر ہے۔ یہ (سب) خدا کی آیتوں (نشانیوں) میں سے ہے شاید[1] تم اس کی نعمتوں کو یاد کرنے والے ہو۔

(۲۷) اے اولادِ آدم! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے، جس طرح تمہارے ماں باپ کو دھوکا

[1] لفظ شاید پر ہمارا نوٹ پہلے بھی گزر چکا ہے جو "لعل" کا ترجمہ ہے، یہ لفظ جب اللہ اپنے لیے استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی "تاکہ" کے ہوتے ہیں، نہ کہ "شاید" کے۔ کیونکہ "شاید" وہ کہتا ہے جس کو نتیجہ کا علم ہو (مترجم)۔

دے کر بہشت سے باہر نکال دیا اور ان کے لباس کو ان کے جسموں سے اتار دیا تا کہ ان کی شرمگاہیں انہیں دکھا دے، کیونکہ وہ (شیطان) اور اس کے کارندے تمہیں دیکھتے ہیں اور تم انہیں نہیں دیکھتے" (لیکن یہ جان لو) ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا ولی قرار دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

(۲۸) اور جس وقت وہ کوئی کارِ بد کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپوں کو یہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں یہی حکم دیا ہے (اے ہمارے رسول!) ان سے کہہ دو کہ خدا (ہرگز) کبھی کسی کو بُرے کام کا حکم نہیں دیتا، آیا خدا کی طرف اس بات کی نسبت دیتے ہو جو نہیں جانتے؟!

تفسیر

بنی آدم کے لیے خطرے کی گھنٹی

جیسا کہ ہم نے آیاتِ گذشتہ کی آخری بحث میں بیان کیا کہ آدم کی سرگزشت اور ان کی شیطان سے کشمکش روئے زمین پر آنے والے تمام انسانوں کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا ایک عکس ہے یہی وجہ ہے کہ خدا نے ان آیات کے بعد تمام بنی آدم کے لیے کچھ ایسے تعمیری فرامین بیان کیے گئے درحقیقت بہشت میں آدم کو دیئے جانے والے احکام کا تتمہ ہیں۔

سب سے پہلے اسی مسئلہ لباس اور جسم ڈھانپنے کی بات کا ذکر کیا ہے جو واقعۂ آدم میں بھی اہمیت کا حامل ہے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا تاکہ (تمہارے اندام کو ڈھانپ لے اور) تمہارے بدن کے بدنما حصّوں کو چھپالے (یٰبنیٓ اٰدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوٰاتکم)۔

لیکن اس لباس کا یہی فائدہ نہیں ہے کہ تمہارے بدن کو چھپالے اور اس کی برائی کو پوشیدہ کردے بلکہ ہم نے اسے تمہارے بدن کی زینت کے لیے بھی بھیجا ہے تاکہ یہ جیسا ہے اسے اس سے خوش نما تر دکھائے (وریشا)۔

عربی میں - ریش - دراصل پرندے کے پر کو کہتے ہیں، چونکہ پرندوں کے لیے پر بھی لباس کا کام انجام

دیتے ہیں اس بنا پر ہر لباس کو "ریش" کہا جانے لگا، علاوہ براین پرندوں کے پر خوبصورت بھی ہوتے ہیں اس لیے لفظ "ریش" میں زینت کا مفہوم بھی شامل ہوگیا۔ نیز جو کپڑا گھوڑے کی زین سر یا اونٹ کی پشت پر ڈالا جاتا ہے اسے بھی "ریش" کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے "ریش" کے اس سے بھی وسیع معنی بیان کیے ہیں، یعنی ہر وہ سامان جس کی انسان کو ضرورت ہو۔ لیکن اس آیت میں مناسب معنی لباس اور زینت کے ہیں۔

اس جملے میں لباس ظاہری کے بیان کرنے کے فوراً بعد قرآن نے لباس معنوی کی بحث کو بھی چھیڑا ہے جیسا کہ دیگر مواقع پر قرآن کا طریقہ ہے۔ اگر کسی چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں تو دونوں کو بیان فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: پرہیزگاری اور تقویٰ کا لباس اس سے بہتر ہے (ولباس التقوٰی ذٰلک خیر)۔

تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے لباس کی تشبیہ نہایت بلیغ اور معنی خیز ہے۔ کیونکہ جس طرح لباس انسان کے بدن کو سردی اور گرمی سے بچاتا ہے، بہت سے خطروں میں ڈھال کا کام بھی کرتا ہے، جسمانی عیوب کو پوشیدہ رکھتا ہے اور انسان کے لیے ایک قسم کی زینت بھی ہے، اسی طرح تقویٰ و پرہیزگاری کا جذبہ علاوہ اس کے کہ وہ انسان کو گناہوں کے بُرے اثرات سے بچاتا ہے، اور بہت سی انفرادی و اجتماعی خطروں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ انسان کے لیے ایک بڑی زینت بھی بن جاتا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی جاذب نظر زینت ہے جو انسان کی شخصیت میں اہمیت پیدا کر دیتی ہے۔

"لباس تقویٰ" سے کیا مراد ہے؟ اس امر میں بھی مفسرین کے درمیان بڑی گفتگو ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی "عمل صالح" ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد "حیا" ہے۔ بعض نے اس سے "لباس عبادت" مراد لیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد "لباس جنگ" ہے جیسے زرہ، خود اور سپر وغیرہ کیونکہ "تقویٰ کی اصل" "وقایۃ" ہے جس کا معنی ہے "حفاظت"۔ قرآن کریم میں بھی "تقویٰ" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ نحل کی آیت ۸۱ میں ہے:

(وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ ...)۔

تمہارے لیے ایسے پیراہن بنائے گئے ہیں جو تمہیں گرمی سے حفاظت کرتے ہیں اور کچھ پیراہن وہ ہیں جو میدان جنگ میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیات قرآنی غالباً وسیع معنی کی حامل ہوتی ہیں جن کے مختلف مصداق ہوتے ہیں۔ لہٰذا آیت مورد بحث میں بھی یہ تمام معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

اور چونکہ "لباس تقویٰ" کا لباس جسمانی کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی "روح تقویٰ و پرہیزگاری" ہے جس کی وجہ سے انسان کی جان محفوظ رہتی ہے اور "حیا" و "عمل صالح" بھی اس میں داخل ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ لباس جو خدا نے تمہیں عطا کیے ہیں، چاہے وہ مادّی ہوں یا معنوی، لباس جسمانی ہوں یا لباس تقویٰ، یہ سب خدا کی آیات و نشانیاں ہیں تاکہ بندگان خدا، خدا کی نعمتوں کو یاد کریں (ذالک من اٰیات الله لعلهم یذکرون)۔

لباس کا نازل ہونا

قرآن کریم کی متعدد آیات میں لفظ "انزلنا" (ہم نے اتارا) ملتا ہے، جو بظاہر اوپر سے نیچے کی طرف بھیجنے کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا، جیسے زیر بحث آیت میں ہے۔ کیونکہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے: ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا تاکہ تمہارے اندام کو چھپالے۔ باوجود اس کے کہ ہمیں معلوم ہے کہ عام طور سے جو لباس تیار ہوتا ہے وہ یا تو جانوروں کی اُون سے بنتا ہے۔ یا نباتات سے۔ یہ سب چیزیں زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔

سورہ زمر کی آیت ۶ میں بھی ہے:

وَاَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ

اللہ نے تمہارے لیے نازل کیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے۔

اور سورہ حدید آیت ۲۵ میں ہے:

وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ ......

اور ہم نے لوہا اتارا۔ ......

بہت سے مفسّروں کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس قسم کی آیات سے "نزول مکانی" یعنی اوپر سے نیچے کی طرف آنا مراد لیا جائے اور اسی طرح ان کی تفسیر بھی کی جائے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ چونکہ بارش اوپر سے نازل ہوتی ہے جس سے نباتات روئیدہ ہوتے ہیں، حیوانات سیراب ہوتے ہیں بنا بریں لباس کا مواد اس معنی سے آسمان سے نازل ہوتا ہے، لوہے کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ آسمان سے جو پتھر برستے ہیں (شہابیے) ان کے اجزاء میں لوہے کی آمیزش ہوتی ہے۔

لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ لفظ "نزول" سے کبھی "نزول مقامی" مراد ہوتا ہے جس کا استعمال روزمرہ میں داخل ہے جیسے کہتے ہیں کہ "مقام بالا سے یہ حکم صادر ہوا ہے" یا یہ کہ "رفعت شکوای الی القاضی" (میں نے اپنی شکایت قاضی کی طرف اٹھائی)، تو اس بات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان آیات کی تفسیر میں نزول مکانی پر اصرار کیا جائے۔ کیونکہ اللہ کی تمام نعمتیں اس کی بلند و بالا بارگاہ سے بندوں کے لیے آتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے لفظ "نزول" کا استعمال حسب حال اور عین مناسب ہے۔

اس موضوع کی نظیر و مثال ان الفاظ میں بھی ملتی ہے جن سے قریب اور دُور کے لیے اشارہ کیا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز مکانی حیثیت سے ہم سے بالکل قریب ہوتی ہے، لیکن اپنے مقام و درجہ کے لحاظ سے ہم سے بلند ہوتی ہے تو ایسی چیز کے لیے اشارہ کرنے کے لیے ہم وہ لفظ استعمال کرتے ہیں جو دُور کے لیے وضع ہوئی ہے۔ جیسے بجائے "آپ" کے کہتے ہیں: آنجناب کی خدمت میں عرض ہے (حالانکہ بسا اوقات "آنجناب" بالکل پہلو میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں) قرآن میں بھی ہم پڑھتے ہیں۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ "(وہ کتاب پُرعظمت و بلند پایہ (یعنی قرآن) ایسی ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں)۔

گذشتہ اور موجودہ زمانے میں لباس

جہاں تک تاریخ کی دسترس ہے ہمیں انسان ہمیشہ لباس میں ملتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخ جتنی دُور ہوتی جاتی ہے اور مقامات بدلتے جاتے ہیں تو لباسوں میں بھی بڑا فرق ہوتا جاتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں لباس صرف جاڑے اور گرمی سے بچنے کے لیے یا بدن کی زینت کے لیے پہنا جاتا تھا۔ لیکن بدن کی حفاظت کے پہلو سے غفلت تھی۔ آج کی زندگی میں یہ پہلو بھی سامنے آگیا ہے جیسا کہ بعض شعبوں میں اس کی طرف خاص نظر ہے۔ جیسے فضا نوردوں، آگ بجھانے والوں، کان کنوں، سمندر میں غوطہ لگانے والوں اور اسی طرح کے دیگر کام کرنے والوں کے خصوصی لباس جو ان کی جان و بدن کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں۔

عصر حاضر میں صنعت لباس بافی کے موادِ خام میں اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ جس کا گزشتہ دور میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

تفسیر "المنار" کا مؤلف آٹھویں جلد میں اس آیت کے ذیل میں اس طرح رقمطراز ہے:

ایک دن کا واقعہ ہے کہ جرمنی کا صدر ایک کپڑے کی مل کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب وہ اس عظیم کارخانے میں داخل ہوا تو شروع میں اس نے کچھ بھیڑوں کو دیکھا جن سے اُون اتاری جا رہی تھی۔ اس کے بعد جب وہ اس کارخانے سے باہر نکلنے لگا تو کارخانے کے مہتمم نے اسے ایک خوبصورت کپڑا پیش کیا اور کہا کہ یہ اسی اُون سے تیار ہوا ہے جو ابھی تھوڑی دیر پیشتر آپ کے سامنے بھیڑوں سے حاصل کی جارہی تھی یعنی دو گھنٹے سے بھی کم کی مدت میں بھیڑ کے بدن سے اتری ہوئی اُون صدرِ مملکت کے پہننے کے لیے ایک خوبصورت کپڑا بن گیا۔

لیکن ہمارے دُور میں کپڑے کے استعمال کا ایک ناپسندیدہ اور افسوسناک پہلو اس طرح سامنے آیا ہے کہ اس کا اصلی فائدہ تحت الشعاع ہوگیا ہے، اور وہ پہلو یہ ہے کہ لباس حُسن پرستی، فساد، شہوت انگیزی، خود نمائی اور تکبر، اسراف اور فضول خرچی وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض افراد کے بدن پر ایسا لباس دیکھا گیا ہے (خاص کر مغرب زدہ جوانوں کے بدن پر) جس کا جنونی پہلو عقلی پہلو پر غالب نظر آتا

ہے۔ وہ لباس ایسا ہے جو دنیا کی ہر چیز ہو سکتا ہے لیکن اسے لباس نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو ذہنی نقص ہے اس کا اظہار وہ اس طرح کے عجیب وغریب لباس پہن کر کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کسی کارنمایاں سے لوگوں کی نظر اپنی طرف نہیں موڑ سکتے وہ عجیب وغریب اور حیران کن لباس کے ذریعے معاشرے میں اپنے وجود کا اظہار چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو بردبار ہیں اور ان میں کسی قسم کا نقص یا احساس کمتری نہیں ہے وہ ایسے لباس سے اجتناب کرتے ہیں۔

علاوہ بریں کتنا کثیر مال اور سرمایہ ان گوناں گوں لباسوں، فیشن پرستیوں اور لباس پہننے کے مقابلوں میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر اس مبلغ کثیر کو ان فضول خرچیوں سے بچا لیا جائے تو اس سے نہ معلوم کتنی اجتماعی اور معاشرتی مشکلیں حل ہو سکتی ہیں اور اس کے ذریعے اس دکھی معاشرے کے کتنے زخموں پر مؤثر طور پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔

لباس کے بارے میں فیشن پرستی سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ زرِ کثیر بیکار خرچ ہو جاتا ہے بلکہ اس سے وقت اور انسانی توانائی بھی بہت تلف ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر آئمہ طاہرین علیہم السلام لباس کے معاملہ میں تجمل پرستی کے سخت مخالف تھے۔ جیسا کہ روایات میں ملتا ہے کہ نصاریٰ بنی نجران کا ایک وفد آنحضرتؐ سے ملنے آیا۔ وہ لوگ اپنے بدنوں پر ریشم سے بُنا ہوا ایسا خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھے جو اس وقت عرب عام طور پر نہیں پہنتے تھے۔ جب یہ لوگ رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سلام کیا تو آنحضرتؐ نے انہیں سلام کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ ان سے بات تک کرنے کے روادار نہ ہوئے۔ جب حضرت علی علیہ السلام سے اس مشکل کا حل پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ یہ لباسِ فاخرہ اتار دیں اور قیمتی انگوٹھیاں بھی اپنی انگلیوں سے اتار دیں اس کے بعد پیغمبرؐ کی خدمت میں جائیں تو انہیں شرفِ ملاقات حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی ہدایت پر عمل کیا تو آنحضرتؐ نے ان کے سلام کا جواب بھی دیا اور ان سے بات بھی کی بعد ازاں جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا:

والذی بعثنی بالحق لقد أتونی المرة الاولی وان ابلیس لمعهم۔

اس ہستی کی قسم جس نے مجھے مبعوث برسالت کیا، جب یہ لوگ پہلی دفعہ آئے تھے تو ان کے ساتھ شیطان بھی آیا تھا۔[1]

اس کے بعد والی آیت میں خداوندکریم تمام افرادِ بشر اور اولادِ آدم کو خبردار کرتا ہے کہ شیطان کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہیں۔ کیونکہ شیطان نے اپنی پرانی دشمنی کا اظہار انسانوں کے پدر و مادرِ اوّل سے کر

[1] سفینۃ البحار جلد دوم صفحہ ۵۰۴ مادہ لبس۔

دیا ہے کہ انہیں فریب دے کر ان کا لباس جنت ان کے بدنوں سے اتروا دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے لباس تقویٰ کو بھی اتروائے، اس لیے فرمایا گیا ہے: اے آدم کی اولاد! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے جیسا کہ اس نے تمہارے باپ آدم اور ماں حوا کو (دھوکا دے کر) بہشت سے نکال دیا اور ان کا لباس ان کے تن سے الگ کر دیا تاکہ ان کی شرمگاہ ان کو دکھلا دے (یا بنی آدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنة ینزع عنهما لباسهما لیریهما سواٰتهما)۔

درحقیقت جو چیز اس آیت کو گذشتہ آیت سے مربوط کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں ظاہری اور معنوی لباس (لباس تقویٰ) کا تذکرہ تھا اور اس آیت میں خبردار کیا جا رہا ہے کہ ہوشیار رہنا کہیں شیطان تمہارے اس لباس تقویٰ کو بھی نہ اتروا دے۔

بیشک ظاہری عبارت میں تو یہ نہی کا حکم شیطان کے لیے ہے، لیکن اس طرح کی عبارتوں میں ایک لطیف کنایہ مخاطب کو نہی کرنے کے لیے مضمر ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنے کسی دوست سے کہیں کہ خبردار فلاں دشمن تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ مقصد یہ ہے کہ تم ہشیار رہنا اور اس سے مار نہ کھانا۔

اس کے بعد تاکید فرماتا ہے کہ شیطان اور اس کے کارندوں کا حساب کتاب دیگر دشمنوں سے بالکل الگ ہے کیونکہ۔ وہ اور اس کے کارندے تمہیں دیکھتے ہیں اس عالم میں کہ تم انہیں نہیں دیکھتے لہٰذا ایسے دشمن سے بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے (انه یراکم هو وقبیله من حیث لا ترونهم)۔

درحقیقت جس مقام پر تمہیں یہ گمان گزرے کہ یہاں پر بس تم ہی تم ہو، ممکن ہے کہ شیطان اور اس کا گروہ بھی وہاں موجود ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ دشمن اگر ایسا چھپا ہوا ہو کہ اس کے متعلق ہر آن یہ خطرہ ہو کہ نہ معلوم کب حملہ کر بیٹھے، ایسے خطرناک دشمن کے مقابلہ میں ہمیشہ آمادۂ جنگ رہنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت ایک اہم اعتراض کا جواب ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ: خدائے مہربان و عادل نے کس لیے ایسے موذی اور قوی دشمن کو انسان پر مسلط کر دیا، دشمن ایسا جو اپنی طاقتوں میں انسان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جہاں چاہے چلا جائے بغیر اس کے کہ کوئی اس کے پاؤں کی آہٹ سن سکے، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ وہ انسان کے اندر اس طرح دوڑ جاتا ہے جس طرح خون بدن کی رگوں کے اندر دوڑتا ہے، آیا یہ عمل عدالتِ الٰہی سے مطابقت رکھتا ہے؟!

مذکورہ آیت اس احتمالی سوال کے جواب میں کہتی ہے: ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا ولی و سرپرست قرار دیا ہے جو بے ایمان ہیں (انا جعلنا الشیاطین اولیآء للذین لا یؤمنون)۔

یعنی ان شیاطین کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ ان بندوں کی جان و روح میں داخل ہو سکیں جنہوں نے ان شیاطین کو قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا ہے، اور وہ صاحبان ایمان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ شیطان کی طرف ابتدائی قدم خود انسان کی طرف سے اٹھتے ہیں اور خود اس کی جانب سے شیطان

گو یہ اجازت ملتی ہے کہ سلطنت بدن میں داخل ہوجائے۔ لہٰذا انسان کی اجازت سے شیطان اس کے بدن میں داخل ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ بنابریں جو افراد اپنے بدن کی کھڑکیاں شیطان کے لیے بند رکھتے ہیں، شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ان کے بدن کی قلمرو میں داخل ہو سکے۔

قرآن کریم کی بعض دیگر آیات بھی اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۰۰ میں ہے:

اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۔

شیطان کا قبضہ ان لوگوں پر ہے جو اسے چاہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔

نیز سورۂ حجر کی آیت ۴۲ میں ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ۔

میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہ ہوسکے گا سوا ان گمراہوں کے جو تیری اتباع کریں گے۔

دیگر لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ درست ہے کہ ہم ان ظاہری آنکھوں سے خود شیطان اور اس کے ساتھیوں کو نہیں دیکھتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے نقش پا کو تو دیکھتے ہیں۔ جس جگہ محفل گناہ برپا ہو، اسباب معصیت فراہم ہوں، دنیا اپنے زرق برق لباس میں محو رقص ہو، تجمل پرستی موجزن ہو اور جس وقت غرائز طبعی میں طوفان بھی اٹھ رہا ہو، یا آتش غیظ و غضب بھڑک رہی ہو، یہ سمجھو کہ یہ سب شیطان کے نقش پا ہیں کیونکہ ان خطرناک مواقع پر شیطان کی موجودگی لازمی ہے گویا ان مقامات پر انسان شیطانی وسوسوں کو اپنے دل کے کانوں سے سُن رہا ہوتا ہے اور اس کے منحوس قدموں کے نشانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

اس بارے میں ایک جاذب نظر حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے فرمایا:

لما دعا نوح ربه عزوجل على قومه اتاه ابليس لعنه الله فقال يا نوح ان لك عندي يدا اريد ان اكافيك عليها، فقال نوح انه ليبغض الي ان يكون لك عندي يد فما هي؟ قال بلى دعوت الله على قومك فاغرقتهم فلم يبق احد اغويه، فانا مستريح حتى ينشق قرن آخر واغويهم، فقال له نوح ما الذي تريد ان تكافئني به؟ قال اذكرني في ثلاث مواطن فاني اقرب ما اكون الى العبد اذا كان في احداهن:

اذكرني اذا غضبت؟

واذكرني اذا حكمت بين اثنين!

واذکرنی اذا کنت مع امرأة خالیًا لیس معکما احد ![1]

جس وقت حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے لیے بد دعا کی اور خدا سے یہ چاہا کہ وہ اسے ہلاک کردے (اور ان سب کو غرق کردے)، تو طوفان کے بعد ابلیس ان کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے نوح! میری گردن پر تمہارا ایک حق ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکا دوں!

یہ سن کر نوحؑ کو تعجب ہوا کہ کیا احسان! کہا یہ امر مجھے بہت شاق ہے کہ میرا کوئی حق تیرے ذمہ ہو ذرا بتلا کہ وہ حق کیا ہے؟

ابلیس نے کہا وہی بد دعا جو تم نے اپنی قوم کے لیے کی ہے جس کی وجہ سے سب ہلاک ہو گئے اور کوئی ایسا شخص نہ بچا جس کو میں گمراہ کرنے کی زحمت گوارا کروں اس وجہ سے مجھے ایک عرصہ تک کے لیے چھٹی مل گئی کہ آرام کروں یہاں تک کہ دوسری نسل بڑی ہو اور میں نئے سرے سے انہیں گمراہ کرنے میں مشغول ہوں۔

نوحؑ نے اگرچہ اپنی قوم کی ہدایت کی بڑی کوشش کی تھی اور جب کسی طرح وہ ٹھیک نہ ہوئی اس وقت انہوں نے بد دعا کی تھی اس لیے شیطان کا یہ طعنہ درست نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ناراحت ہوئے، انہوں نے ابلیس سے کہا: اب تو کس طرح تلافی کرنا چاہتا ہے؟

اس نے کہا: تین مواقع ایسے ہیں جہاں مجھے یاد کر لینا! کیونکہ ان مواقع پر میں بندگانِ خدا سے سب سے زیادہ نزدیک ہو جاتا ہوں۔

یاد رکھو مجھے، جب تم غصّہ میں ہو۔

اور یاد رکھو مجھے جب تم دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اور یاد رکھو مجھے اس وقت جبکہ تم کسی نامحرم عورت کے ساتھ اکیلے ہو!

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ کچھ مفسّرین نے آیہ مذکورہ سے یہ استفادہ کیا ہے کہ شیطان کسی حال میں انسان کے لیے قابلِ دید نہیں ہے جبکہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

لیکن بظاہر ان دونوں باتوں میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ بمقتضائے اصل شیطان قابلِ رویت نہیں ہے لیکن مثل دیگر کلیات کے یہ کلیہ بھی قابلِ استثناء ہے لہٰذا وہ بعض مواقع پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں شیطان کے ایک اہم وسوسہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بعض شیطان صفت انسانوں کی زبان پر بھی جاری ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب بھی وہ کوئی عمل قبیح بجا لاتے ہیں اور ان سے اس کے

[1] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۱ ص ۳۱۸۔

متعلق جواب طلب کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں : یہ وہ طریقہ ہے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو گامزن پایا ہے (واذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا علیها اٰبآءنا)۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں : خدا نے بھی ہمیں اس طریقہ پر چلنے کا حکم دیا ہے (واللہ امرنا بھا)۔

بزرگوں کی کورانہ تقلید اور بارگاہِ خداوندی کو کسی بارے میں متہم کرنا یہ دو ناقابلِ قبول عذر ہیں جو بعض شیطان صفت افراد پیش کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ خدا نے ان کی پہلی دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا گویا یہ ایسی پوچ اور کمزور ہے جس کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس دلیل کے بطلان کو ہر عقل سلیم سمجھ سکتی ہے، علاوہ بریں قرآن کریم میں متعدد بار اس کا جواب دہرایا گیا ہے، لہٰذا صرف دوسرے جواب پر اکتفاء کی ہے۔ فرمایا گیا ہے، خدا کبھی بُرے کاموں کا حکم نہیں دیتا، کیونکہ اس کا حکم عقل کے حکم سے جدا نہیں ہے (قل ان اللہ لا یأمر بالفحشآء)۔

بُرے کاموں کا حکم دینا نصِّ قرآنی کے مطابق ایک شیطانی کام ہے نہ کہ خدا کا کام، خدا تو صرف نیکی اور اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے[۱]

بعد ازاں اس جملہ پر آیت کا خاتمہ ہوتا ہے : کیا تم خدا کی جانب ایسی باتوں کی نسبت دیتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے (أتقولون علی اللہ ما لا تعلمون)۔

اگرچہ بظاہر زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ فرمایا جاتا : تم کیوں اس بات کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہو جو جھوٹ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے؟ لیکن اس کی بجائے فرمایا : جس چیز کو تم نہیں جانتے اس کی نسبت خدا کی طرف کیوں دیتے ہو؟ یہ دراصل اس وجہ سے ہے کہ وہ مطالب جو طرفین کیلئے قابلِ قبول اور مسلّم ہیں ان کا سہارا لیا جائے۔ گویا ان سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں اگر ان باتوں کے جھوٹ ہونے کا یقین نہیں ہے تو کم از کم اتنا تو ہے کہ ان کے صحیح ہونے پر بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا بغیر دلیل کے کیوں تہمت لگاتے ہو اور جس چیز کو نہیں جانتے اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔

"فحشآء" سے کیا مراد ہے ؟

لفظ "فاحشۃ" (عمل قبیح) کے متعلق بہت سے مفسّرین کا قول ہے کہ اس سے زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کے گرد مادر زاد برہنہ طواف کرتے تھے، اس میں مرد و عورت کا بھی کوئی فرق نہ تھا، اس بارے میں ان کی دلیل یہ تھی کہ جن کپڑوں سے خدا کا گناہ کیا ہے انہیں وقتِ طواف بدن سے الگ کر دینا چاہیئے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۶۸ - ۲۶۹ ملاحظہ ہو۔

بے شک یہ تفسیر ان آیات سے ضرور مناسبت رکھتی ہے جو اس سے قبل گذر چکی ہیں اور ان میں لباس اور اس کے پہننے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن متعدد روایات میں ملتا ہے کہ "فاحشۃ" سے مراد یہاں پر ظالم پیشواؤں کا لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں کیونکہ (بقول ان کے) خدا نے ان کی اطاعت کو لوگوں پر فرض کیا ہے۔

لیکن بعض مفسرین جیسے "المنار" اور "المیزان" کے مؤلف نے اس کے ایک وسیع معنی بیان کیے ہیں جس کے دائرے میں ہر بُرا کام آجاتا ہے۔ اگر آیت کے وسیع معنی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ "فاحشۃ" کے معنی میں وسیع و عام ہونا چاہیئے برہنگی کے عالم میں طواف کرنا اور پیشوایان ظلم و ستم کی پیروی اس کے واضح مصداقوں میں سے ہوگا، اور یہ روایات کے خلاف بھی نہیں ہوگا۔

تفسیر نمونہ کی جلد اول سورۂ بقرہ آیہ ۱۷۰ کے ذیل میں بزرگوں کے طریقہ اور رسوم پر بغیر کسی قید و شرط کے عمل کرنے کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

(۲۹) قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۗ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝

(۳۰) فَرِیْقًا هَدٰی وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

(۲۹) (اے میرے رسول!) کہہ دو کہ میرے پروردگار نے عدالت کا حکم دیا ہے اور ہر مسجد میں (اور وقتِ عبادت) اپنی توجہ اس کی طرف رکھو، اسے پکارو اور اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرو (اور یہ جان لو کہ) جس طرح اس نے تم کو آغاز میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) تم حشر کے روز اس کی طرف) پلٹو گے۔

(۳۰) (خدا نے) کچھ لوگوں کی ہدایت کی اور کچھ لوگ (جن میں لیاقت نہیں ہے) ان کی گمراہی مسلّم الثبوت ہے، (یہ وہ لوگ ہیں کہ) انہوں نے بجائے خدا کے شیطانوں کو اپنا ولی و سرپرست بنایا ہے، اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

چونکہ گزشتہ آیت میں لفظ "فحشاء" (جس کے معنی ہر قسم کے بُرے کام کے ہیں) سے بحث کی گئی تھی، اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ خدا ہرگز بُرے کام کا حکم نہیں دیتا لہٰذا اب اس آیت میں ایک مختصر جملے کے ذریعے پروردگارِ عالم کے ان فرامین بنیادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا تعلق عملی ذمہ داری سے ہے۔ اس کے بعد اصول عقائد کی دو بنیادوں یعنی مبداء و معاد کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

ابتدا میں فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ میرے پروردگار نے مجھے عدالت کا حکم دیا ہے (قل امر ربی بالقسط)۔

ہم جانتے ہیں کہ عدالت کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں تمام اعمال نیک آجاتے ہیں۔ کیونکہ عدالت کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کو اس کے محل و مقام پر رکھا جائے اور وہ جس لیے ہے اسے وہاں استعمال کیا جائے اگرچہ لفظ "عدالت" اور لفظ "قسط" میں فرق ہے۔ عدالت اسے کہتے ہیں کہ انسان ہر ایک کا حق ادا کر دے اس کے مدِمقابل دوسروں پر ظلم و ستم کرنا اور ان کے حقوق کا غصب کرنا ہے، لیکن "قسط" کے معنی یہ ہیں کہ کسی کا حق دوسرے کو نہ دے، یعنی تقسیم کرنے میں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دے اور کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ برتے، اس کے مدِمقابل یہ ہے کہ ایک کا حق دوسرے کو دے دے۔

لیکن ان دونوں کلموں کا وسیع مفہوم، خصوصاً جبکہ یہ الگ الگ استعمال کیے جائیں تقریباً بالکل مساوی ہے جس کے معنی ہر چیز اور ہر کام میں اعتدال برتنے اور ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں۔

اس کے بعد توحید پرستی اختیار کرنے اور ہر طرح کے شرک کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: اپنے دل کو ہر عبادت میں اس کی طرف متوجہ رکھنا اور اس کی ذات پاک سے منہ موڑ کر اور کسی طرف نہ مڑنا (واقیموا وجوھکم عند کل مسجد)۔

اسے پکارو، اور اپنے دین و آئین کو اس کے لیے خالص اور مخصوص کر دو (وادعوہ مخلصین لہ الدین)۔

توحید کے ستون کو مستحکم کرنے کے بعد مسئلہ معاد و محشر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: جس طرح تمہیں آغاز میں پیدا کیا، اسی طرح دوبارہ بروز قیامت تم پلٹ کر آؤ گے (کمابدأکم تعودون)۔

دو اہم نکات :

۱۔ "اقیموا وجوھکم عند کل مسجد" کا مفہوم : مفسّرین نے جملہ " اقیموا وجوھکم عند کل مسجد" کے بارے میں مختلف تفسیریں کی ہیں :

کبھی تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ہر نماز کے وقت قبلہ رُو ہونا ہے۔

کبھی کہا ہے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ ہنگام نماز روزانہ مسجدوں میں حاضر ہونا۔

کبھی یہ احتمال دیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نماز میں حضورِ قلب و خالص نیّت ہونا چاہیئے۔

لیکن ہم نے جو تفسیر مذکورہ بالا سطور میں بیان کی ہے یعنی خدا کی طرف توجہ اور ہر طرح کے شرک اور غیراللہ کی طرف التفات کرنے سے مبارزہ و اختلاف کرنا وہ آیت کے ماقبل و مابعد سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اگرچہ ان تمام معانی کا مراد لیا جانا بھی آیت کے مفہوم سے بعید نہیں ہے۔

۲۔ معاد پر ایک مختصر ترین استدلال : اگرچہ معاد اور حیات بعد الموت کے متعلق بہت بحثیں کی گئی ہیں اور آیاتِ قرآنی کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں بہت سے کوتاہ فکر افراد کے لیے یہ حقیقت قبول کرنا بہت دشوار تھا۔ حد یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے انبیائے الٰہی کو اسی لیے (معاذ اللہ) جھوٹا بلکہ دیوانہ خیال کیا کہ وہ انہیں روزِ قیامت اور دوبارہ زندہ ہوکر اٹھنے کی خبر دیتے تھے۔ وہ یہ کہہ دیتے تھے :

اَفۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمۡ بِہٖ جِنَّۃٌ ۔

یہ جو پیغمبر نے خبر دی ہے کہ مٹی ہو جانے کے بعد اور اجزا منتشر ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے یہ خدا پر ایک بہتان ہے، یا یہ شخص دیوانہ ہے [1]

لیکن اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ جو بات سب سے زیادہ ان کے تعجب کا باعث بنتی تھی وہ معادِ جسمانی کا مسئلہ تھا، کیونکہ کسی طرح سے یقین نہیں آتا تھا کہ بدن خاک ہونے کے بعد، اور اس خاک کے ذرات ہُوا میں منتشر ہوکر کرۂ زمین کے مختلف گوشوں میں بٹ جانے کے بعد بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ پراگندہ اجزاء زمین کے مختلف گوشوں سے، دریاؤں کی موجوں کی آغوش سے، مختلف ہُواؤں کے دامن سے دوبارہ اکٹھے کیے جا سکیں گے اور ان کے اکٹھا ہونے کے بعد وہی پہلا انسان دوبارہ زندہ ہوکر کھڑا ہو جائے گا۔

قرآن نے اپنی متعدد آیات میں اس غلط استبعاد اور بے جا استعجاب کا جواب دیا ہے۔ آیت مذکورہ بالا انہی جوابات میں سے ایک مختصر ترین لیکن جاذب ترین جواب ہے، جس میں فرمایا گیا ہے :

---

[1] سورۂ سبا آیت ۸۔

ذرا اپنی ابتدائے آفرینش پر ایک نظر تو ڈالو اور دیکھو کہ یہی تمہارا جسم جس کا زیادہ حصہ پانی اور باقی مختلف معدنیات پر مشتمل ہے، پہلے کہاں تھا؟ تمہارے جسم میں جو پانی دوڑ رہا ہے اس کا ہر قطرہ شاید رُوئے زمین کے کسی اوقیانوس میں سرگرداں تھا، جو عملِ تبخیر کے ذریعہ اَبر بنا، پھر قطرات باراں کی شکل میں زمین پر برسا، پھر تمہارا جزو بدن بنا، اسی طرح وہ ذرات جن سے تمہارے جسم کی عمارت بنی ہے، کسی روز یہ دانۂ گندم یا کسی میوہ یا سبزی کی شکل میں تھے جو زمین کے مختلف حصوں سے سمٹ کر آئے اور تمہارا جزو بدن بنے.

بنا بریں اس بات میں کونسا تعجب ہے کہ جب یہ ذرات دوبارہ پریشان ہوجائیں گے[1] اس کے بعد دوبارہ وہ خالق کے حکم سے اکٹھا ہو جائیں گے اور اسی جسم کی تشکیل کر دیں گے۔ اگر یہ امر محال تھا تو پہلی دفعہ کیسے ہوگیا؟ لہٰذا:- جس طرح آغاز میں خدا نے تمہیں مختلف اجزاء سے بنایا روزِ محشر بھی وہ تمہیں پلٹائے گا۔ یہی مفہوم اس مختصر آیت میں پنہاں ہے۔

۞ ۞ ۞

اس کے بعد کی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس دعوت (یعنی نیکیوں، توحید اور معاد کی طرف دعوت) کا لوگوں پر کیا اثر ہوا اور انہوں نے اس کا کیا ردّ عمل پیش کیا، ارشاد ہوتا ہے: خدا کی توفیق ایک گروہ کے شامل حال ہوگئی، اور اسے حق کے راستہ کی طرف ہدایت کی، جبکہ دوسرا گروہ وہ تھا کہ اس کی گمراہی مسلّم ہو گئی (فریقا ھدٰی و فریقا حق علیھم الضلالۃ)[2]

اور چونکہ کسی کے ذہن میں یہ خیال ہوسکتا تھا کہ خدا بلاجہت کسی کو ہدایت کرتا ہے اور کسی کو گمراہ کرتا ہے، لہٰذا اس خیال کی تردید کے لیے بعد والے جملے میں فرمایا: گمراہ گروہ وہی لوگ ہیں کہ جنہوں نے شیطان کو اپنا ولی منتخب کرلیا ہے اور بجائے خدا کی ولایت کے شیطان کی ولایت اختیار کرلی ہے (انھم اتخذوا الشیاطین اولیآء من دون اللہ)۔

جائے تعجب یہ ہے کہ: ان تمام گمراہیوں کے بعد بھی وہ یہ تصور کرتے تھے کہ حقیقی ہدایت یافتگان وہی ہیں (ویحسبون انھم مھتدون)۔

یہ حالت خاص کر ان لوگوں کی ہے جو طغیان اور گناہ میں ڈوب جائیں اور اس طرح فساد، تباہی، بُت پرستی اور کج رَوی کے دَلدل میں غرق ہو جائیں کہ ان کی حس تشخص بالکل دگرگوں ہو جائے، برائی کو اچھائی اور گمراہی کو ہدایت سمجھنے لگیں۔ یہی وہ حالت ہوتی ہے کہ دربائے ہدایت ان کے لیے بالکل بند ہو جاتے ہیں اور یہ حالت ان کی خود فراہم کردہ ہوتی ہے۔

---

[1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترکیب موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا (مترجم)

[2] جملہ "فریقاً ھدیٰ" اس کی ادبی ترکیب اس طرح پر ہے: "فریقاً" مفعول مقدم، "ھدیٰ" فعل مؤخر اور "فریقاً" اصل کا مفہوم دوم ہے اور جملہ "حق علیھم الضلالۃ" اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۳۱) یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿﴾

(۳۲) قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ قُلۡ ہِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾

ترجمہ

(۳۱) اے اولادِ آدم! مسجد میں جاتے وقت اپنی زینت اپنے ساتھ لے لو، کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۳۲) کہو کس نے حرام کیا ہے ان زینتوں کو جو خدا نے اپنے بندے کے لیے پیدا کی ہیں اور پاک روزیوں کو؟ کہو کہ یہ زندگانی دنیا میں ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے (اگرچہ دوسرے لوگ بھی ان کے شریک ہیں لیکن) قیامت کے روز خالص ہوگی (صاحبان ایمان کے لیے) ایسی آیتوں کی تفصیل ہم ان لوگوں کے لیے پیش کرتے ہیں جو آگاہ ہیں۔

تفسیر

ان آیات میں سرگزشت آدم اور لباس کی مناسبت سے دوبارہ مسئلہ پوشاک اور دیگر نعمات زندگی او ان کے طریق استفادہ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

سب سے پہلے تمام فرزندانِ آدم کو ایک ایسا حکم دیا گیا ہے جو ایک لازوال قانون کے طور پر تمام زمانوں پر محیط ہے: اپنی زینت کو مسجد میں جاتے وقت ہمراہ رکھنا (یا بنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد)۔

اس جملہ سے جسمانی زینتوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جیسے صاف ستھرا لباس پہننا، کنگھی کرنا، عطر

لگانا اور اسی طرح کی دوسری زینتیں کرنا، اور اس سے روحانی زینتوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جس سے مراد صفاتِ انسانی، ملکات نفسانی، نیت کی پاکیزگی اور اخلاص ہے۔

بعض روایاتِ اسلامی میں یہ جو ہے کہ اس سے مراد اچھے کپڑے پہننا یا کنگھی کرنا ہے یا یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مراسم نماز عید و جمعہ ہیں تو یہ اس کی دلیل نہیں ہے کہ تفسیر صرف انہی چیزوں میں منحصر ہے بلکہ اس سے ان کے واضح مصداق بیان کرنا مقصود ہے[1]

اسی طرح اگر ہم دیکھیں کہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ لفظ "زینت" سے مراد لائق رہبر و پیشوا ہیں تو یہ بھی وسعتِ مفہوم کی ایک دلیل ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم ہر قسم کی ظاہری و باطنی زینت کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا حکم (زینت) ہر زمانے کے فرزندان آدم کے لیے ہے۔ لیکن ضمنی طور سے یہ سرزنش ہے عربوں کی ایک جماعت کو جن کا زمانۂ جاہلیت میں طریقہ یہ تھا کہ جب خانۂ کعبہ کے طواف کیلئے مسجد الحرام میں آتے تھے تو بالکل برہنہ ہو جاتے تھے نیز انہیں اس کی بھی نصیحت کرنا مقصود تھی کہ وہ جب نماز جماعت کے لیے مسجد میں آئیں تو ذرا صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئیں کیونکہ ان کی عادت یہ تھی کہ جب وہ مسجد میں آتے تھے تو انہی میلے کچیلے کپڑوں میں آجاتے تھے جو گھر میں پہنے ہوتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی بعض نادان مسلمانوں کی عادت یہی ہے کہ وہ گھر کے معمولی لباس میں ہی مسجد میں آجاتے ہیں اور خراب کپڑوں کے ساتھ شریک نماز جماعت ہوتے ہیں جبکہ اس آیت کی تفسیر میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب مسجدوں میں آئیں تو اپنا بہترین لباس پہن کر اور آراستہ ہو کر آئیں۔

اس کے بعد کی آیت میں خدا کی دیگر نعمتوں، جن کا تعلق کھانے پینے سے ہے، کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے: کھاؤ اور پیو (وکلوا واشربوا)۔

لیکن چونکہ انسان کی طبیعت میں ہوس ہے اس لیے ہو سکتا تھا کہ وہ ان دو احکام سے ناجائز فائدہ حاصل کر لیتا اور صحیح پوشاک اور مناسب خوراک کی بجائے تجمل پرستی، فضول خرچی اور کھانے میں افراط کا راستہ اختیار کر لیتا لہٰذا اس کی طرف فوراً تنبیہ کر دی ہے کہ: اسراف نہ کرنا کیونکہ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین)۔

"اسراف" کا کلمہ ایک بہت جامع ہے، جو ہر قسم کی زیادہ روی کا مفہوم دیتا ہے چاہے وہ کمیت کے لحاظ سے ہو یا کیفیت کے اعتبار سے، اتلاف ہو یا فضول خرچی یہ سب کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن کریم کی ایک روش ہے کہ جب بھی وہ نعماتِ فطرت سے بہرہ اندازی کی طرف شوق دلاتا ہے تو فوراً

---

[1] ان روایات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر برہان جلد دوم ص ۹-۱۰ و تفسیر نور الثقلین جلد دوم ص ۱۸-۱۹۔

راہِ اعتدال سے بھٹکنے کی روک تھام بھی کر دیتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ذرا تند لہجہ میں ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زہد کے معنی یہ ہیں کہ زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا جائے، اور پاک وحلال رزق و روزی کو ترک کر دیا جائے۔ تو یہ زہد و پارسائی کی نشانی اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! "کہو کس نے خدا کی ان زینتوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کس نے اس کی نعمتوں اور پاک روزیوں کو حرام کیا ہے" (قل من حرم زينة الله التی اخرج لعباده والطيبات من الرزق)۔

اگر یہ چیزیں بُری تھیں تو سرے سے اللہ انہیں پیدا ہی نہ کرتا، اور اب جبکہ اس نے ان چیزوں کو بندوں کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں حرام کر دے؟ کیا خلقت کی فطرت اور شریعت کے احکام میں تضاد ممکن ہے؟

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: ان سے یہ کہہ دو کہ یہ نعمتیں با ایمان لوگوں کے لیے اس دنیا میں خلق ہوئی ہیں، اگرچہ دوسرے افراد بھی لیاقت نہ ہونے کے باوجود ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن بروزِ آخرت اور اعلیٰ زندگی کے موقع پر جبکہ انسانوں کی صفوں کو چھانٹ کر کھوٹا کھرا الگ کیا جائے گا تب یہ سب نعمتیں اور لذتیں صرف با ایمان اور نجات یافتہ افراد کو دی جائیں گی، دوسرے لوگ ان سے بالکل محروم ہو جائیں گے (قل هی للذين اٰمنوا فی الحيٰوة الدنيا خالصة يوم القيامة)۔

بنا بریں وہ نعمتیں اور لذتیں جو دنیا میں بھی ان کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور آخرت میں تو صرف انہی کے لیے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ خدا انہیں حرام قرار دے دے، حرام وہ چیز ہوتی ہے جس میں کوئی ضرر ہو نہ کہ نعمت و رحمت۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ قدرت کے یہ عطیے اور نعمتیں اگرچہ دار دنیا میں رنج و تکلیف کے ساتھ مخلوط ہیں لیکن آخرت میں یہ نعمتیں ہر قسم کے رنج و اذیت سے خالص ہو کر مؤمنین کو ملیں گی (لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے)۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ہم اپنی ان آیتوں اور احکام کی ان لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں اور سمجھتے ہیں تشریح کرتے ہیں (كذالك نفصل الاٰيات لقوم يعلمون)۔

اسلام کی نظر میں زیب و زینت کی حیثیت

ہر طرح کی زینتوں سے استفادہ کے بارے میں اسلام نے جیسا کہ اس کا رویہ دوسری چیزوں میں ہے

راہِ اعتدال کو اختیار کیا ہے۔ نہ تو بعض لوگوں کی طرح یہ کہا ہے کہ زینت کرنا اور اپنے کو آراستہ کرنا چاہے وہ حدِ اعتدال میں ہو، زہد و پارسائی کے خلاف ہے اور نہ ہی ان لوگوں کی تائید کی ہے جو جذبۂ تجمل پرستی کی وجہ سے طرح طرح کی زینتوں میں غرق ہیں اور اس غیر معقول امر کے لیے ہر ناشائستہ عمل بجالاتے ہیں۔

اگر ہم انسان کے جسم و روح کی عمارت پر نظر کریں اور اس کے بعد ان تعلیمات کو دیکھیں جو ہمیں دی گئی ہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام تعلیمات ہماری روح و جسم سے ہم آہنگ ہیں۔

اس امر کی توضیح اس طرح ہے کہ علمائے علم نفس کی یہ تحقیق ہے کہ ہر انسان کی روح میں چار احساس پائے جاتے ہیں: حس زیبائی، حس نیکی، حس دانائی اور حس مذہبی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تمام ادبی محاسن، شعر و سخن میں حسن کی مدح، لطیف و حسین صنعتیں یہ سب اسی حس زیبائی کے نتیجے میں نمودار ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحیح قانون اس فطری احساس کا گلا گھونٹ دے اور اس کے جو نتائج بد برآمد ہوں انہیں نظر انداز کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں فطرت کے حسن و جمال، خوبصورت و مناسب لباس، طرح طرح کی خوشبوئیں اور اسی طرح کے دیگر جمالیات سے لطف اندوز ہونا نہ صرف جائز و مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ ان امور کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کثیر روایات کتب معتبرہ میں وارد ہوئی ہیں۔ چند ایک ہم بطورِ نمونہ ذکر کرتے ہیں:

امام حسن علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ آپ جس وقت نماز کے لیے سجادہ پر کھڑے ہوتے تھے اپنا بہترین لباس زیب تن فرماتے تھے۔ جب حضرتؑ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا:

ان اللّٰہ جمیل یحب الجمال، فاتجمل لربی و ھو یقول خذوا زینتکم عند کل مسجد۔

خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں حسین لباس اپنے پروردگار سے راز و نیاز کرنے کے لیے پہنتا ہوں اور خود اس نے یہ حکم دیا ہے کہ مسجد جاتے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک ریاکار زاہد جس کا نام عباد بن کثیر تھا راستے میں امام جعفر صادقؑ کو ملا۔ اس وقت امامؑ نسبتاً خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس نے امامؑ سے کہا: آپ خاندانِ نبوّت سے ہیں، آپ کے جد (حضرت علی علیہ السلام) تو بہت معمولی لباس پہنا کرتے تھے، آپ کے بدن پر یہ عمدہ لباس کیوں ہے؟ کیا بہتر نہ تھا کہ اس سے کم قیمت لباس پہنتے!

حضرت نے فرمایا: افسوس ہے تجھ پر اے عباد! کیا تُو نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی من حرم زینۃ اللّٰہ

---

[1] وسائل جلد سوم ابواب احکام الملابس۔

التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق : کس نے حرام کیا ہے ان زینتوں کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور پاکیزہ روزیوں کو؟[1]

اس سلسلہ میں دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔

یہ تعبیر کہ خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، یا یہ کہ خدا نے اچھی چیزوں کو پیدا کیا ہے ان سب سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہرطرح کے جمال سے استفادہ کرنا ممنوع ہوتا تو خدا ہرگز ان کو پیدا نہ کرتا۔ اس جہان میں ہرطرف حُسن فطرت کا پایا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ خالق حُسن، حُسن کو پسند کرتا ہے۔

اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ایسے امور میں عام طور سے لوگ راہ افراط اختیار کرتے ہیں اور مختلف بہانوں سے تجمل پرستی اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا قرآن اس حکم اسلامی کو بیان کرنے کے بعد بلا فاصلہ اسراف و زیادہ روی اور حد سے تجاوز کرنے سے مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے۔ قرآن میں بیس مقامات سے زیادہ مسئلہ اسراف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے (اسراف کے متعلق ہم آئندہ آنے والی آیات میں تفصیلاً گفتگو کریں گے)۔

بہرحال اسلام و قرآن کا ردّیہ اس معاملہ میں موزوں اور اعتدال پسندانہ ہے۔ نہ تو جمود ہے، نہ ہی حُسن پرستی کا ایسا میلان ہے جس کی وجہ سے روحِ انسانی ضائع ہو جائے، نہ ہی اسراف کرنے والوں اور تجمل پرستوں اور زیادہ کھانے والوں کے عمل کی تائید و تصدیق کی گئی ہے۔ خاص طور پر ان معاشروں میں جہاں محروم اور غریب طبقہ موجود ہو وہاں معتدل زینتوں سے بھی رد کا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ملتا ہے کہ جب بعض آئمہ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ لباس فاخر کیوں پہنتے ہیں جبکہ آپ کے جد حضرت علی علیہ السلام ایسا لباس نہیں پہنتے تھے؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

اس زمانہ میں لوگ مالی سختی میں مبتلا تھے لہٰذا ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمارے زمانہ میں لوگوں کی مالی حالت بہتر ہے لہٰذا اس زمانہ میں ان زینتوں سے (ایک معقول حد تک) استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تندرستی کے بارے میں ایک اہم فرمان

مذکورہ بالا آیت میں "کلوا واشربوا ولا تسرفوا" "اور کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو" یہ جملہ جو آیا ہے اگرچہ بادی النظر میں ایک سادہ جملہ معلوم ہوتا ہے، لیکن آج کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ حفظانِ صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک زبردست اصول ہے۔ کیونکہ آج کل کے اطبا، تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر

[1] وسائل الشیعہ جلد ۳ ابواب احکام ملابس باب ، حدیث ۴۔

پہنچے ہیں کہ بہت سی بیماریوں کی جڑ وہ اضافی غذائیں ہیں جو بدن انسانی میں جذب نہ ہونے کی وجہ سے باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ غیر ضروری مادّے قلب کے لیے بھی بار سنگین بن جاتے ہیں اور دوسرے اعضاء پر بھی اپنا بُرا اثر چھوڑتے ہیں۔ بہت سی بیماریوں اور گندگیوں سے جسم کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لیے پہلا قدم یہی ہے کہ یہ غیر ضروری مادّے (جو فی الحقیقت جسم کے کارخانہ میں کوڑا کرکٹ کی حیثیت رکھتے ہیں) جلا دیئے جائیں اور اس طرح جسم کے اندرونی حصّے کی صفائی عمل میں آ جائے۔

اس ضرر رساں مواد کے جمع ہونے کا اصلی سبب یہی کھانے میں زیادتی ہے جسے "پُرخوری" کہا جاتا ہے۔ اسے روکنے کے لیے سوائے خوراک میں میانہ روی کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ خصوصاً ہمارے زمانہ میں جبکہ طرح طرح کی بیماریاں پھیل گئی ہیں جیسے "ذیابیطس" "چربی خون" و "تصلب شرائین" (رگوں کا سخت ہو جانا) خرابی جگر، طرح طرح کے سکتے (فالج) اور اسی طرح کی دیگر بیماریاں بہت زیادہ ہو گئی ہیں ان سب کو اگر ہم دیکھیں تو ان کی تہ میں عدم نقل و حرکت کے ساتھ "پُرخوری" کا ہاتھ نظر آئے گا جس کا علاج صرف یہی ہے کہ کافی حرکت کی جائے اور خوراک کے معاملہ میں اعتدال برتا جائے۔

ہمارے ایک بزرگ مفسّر علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہارون رشید کے دربار میں ایک عیسائی طبیب تھا جس کی بڑی شہرت تھی۔ ایک روز اس طبیب نے ایک عالم سے یہ کہا کہ تمہاری آسمانی کتاب میں مجھے طب کا کوئی ذکر نہیں ملتا جبکہ مفید علم دو ہی ہیں، علم ادیان اور علم ابدان۔ عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ خداوند کریم نے تمام احکام طبّی کو آدھی آیت میں سمو دیا ہے جہاں فرمایا ہے: "کلوا واشربوا ولا تسرفوا": "کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو" نیز ہمارے پیغمبرؐ نے بھی طب کو اپنے اس ارشاد میں مختصراً بیان کر دیا ہے:
>
> المعدة بيت الادواء والحميته رأس كل دواء واعط كل بدن ماعودة۔
>
> "یعنی معدہ تمام بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز ہر دوا کی بنیاد ہے، اور بدن کو جو (مناسب) عادت ڈالی ہے اسے اس سے مت روکو"
>
> عیسائی طبیب نے جب یہ سنا تو کہا:
>
> ماترك كتابكم ولا نبيكم لجالينوس طبا۔
>
> یعنی تمہارے قرآن اور تمہارے پیغمبر نے جالینوس (مشہور طبیب) کیلئے کچھ نہیں چھوڑا۔

جو لوگ اس حکم کو ایک معمولی حکم خیال کرتے ہیں، بہتر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسے آزمائیں تاکہ اس کی اہمیت و گہرائی کا انہیں اندازہ ہو جائے اور اس قانون پر عمل کرنے کا معجزنما اثر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے۔

(۳۳) قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الۡاِثۡمَ وَالۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَاَنۡ تُشۡرِکُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

(۳۳) کہہ دو کہ میرے پروردگار نے صرف بُرے کاموں کو، چاہے وہ آشکارا ہوں یا پنہاں، حرام کیا ہے، اور (اسی طرح) گناہ و ناحق ستم کو (حرام کیا ہے) اور یہ کہ اس چیز کو خدا کا شریک ٹھہراؤ جس کی کوئی دلیل خدا نے نازل نہیں کی، اور خدا کے متعلق وہ بات کہو جو نہیں جانتے (ان تمام باتوں کو اس نے حرام کیا ہے)۔

تفسیر

محرّماتِ الٰہی

قرآنی اسلوب میں ہم نے متعدد بار یہ دیکھا کہ جب بھی قرآن نے کسی امر مباح یا امر لازم کے متعلق گفتگو کی ہے تو فوراً اس کے بعد اس کے نقطۂ مقابل یعنی بد اعمالیوں اور محرمات کا بھی ذکر چھیڑ دیا ہے۔ تاکہ دونوں بحثیں آمنے سامنے ہوکر ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی عنایاتِ الٰہی اور زینتوں کے استعمال کی اجازت اور ان کی نفیٔ تحریم کے بعد محرمات کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ پہلے حرمت کی عمومی بات ہے اور اس کے بعد خاص طور سے چند اہم نکتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ابتدا میں "فواحش" کی تحریم کو بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے: اے پیغمبر! کہہ دو میرے پروردگار نے صرف بُرے کاموں کو حرام کیا ہے چاہے وہ آشکارا ہوں یا پنہاں (قل انما حرم ربی الفواحش ما ظہر منہا وما بطن)۔

"فواحش" جمع ہے "فاحشۃ" کی جس کے معنی ہیں "انتہائی بُرا کام" اور ہر بُرے کام کو "فاحشۃ" نہیں کہتے۔ اس بات کی تاکید کہ وہ گناہ چاہے آشکارا ہو یا پنہاں شاید اس وجہ سے کی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ اگر وہ کوئی بُرا کام خلوت میں کرتے تو اس میں کوئی عیب خیال نہیں کرتے تھے لیکن وہ ظاہر ہو جاتا تو اس کو بُرا جانتے تھے۔

اس کے بعد موضوع کو عام کرکے تمام گناہوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا (والاثم)۔
۔ اثم ۔ اصل میں ہر اس کام کو کہتے ہیں جو نقصان دہ ہو اور انسان کو اس کی حیثیت سے گرانے کا سبب بنے اور اسے ثواب اور جزائے خیر تک پہنچنے سے روکے ۔ اس بنا پر ہر طرح کا گناہ ۔ اثم ۔ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے ۔
لیکن بعض مفسرین نے ۔ اثم ۔ کے معنی اس مقام پر صرف ۔ شراب ۔ کے لیے ہیں اور شاہد میں یہ شعر پیش کیا ہے :

شربت الاثم حتی ضل عقلی کذاک الاثم یصنع بالعقول[1]

میں نے اس قدر اثم (شراب) پی کہ میری عقل زائل ہوگئی ، اور شراب عقلوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے ۔
لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ معنی مفہوم ۔ اثم ۔ کا تمام مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم مصداق ہے ۔
بعد ازاں ایک مرتبہ پھر چند بڑے گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے : اور ہر طرح کا ستم اور دوسروں کے حقوق پر ناحق تجاوز کرنا (حرام ہے) (والبغی بغیر الحق) ۔
۔ بغی ۔ کے معنی کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کے ہیں لیکن عام طور پر اس کا استعمال کسی دوسرے کی چیز ناجائز طور پر چھیننے کے لیے ہوتا ہے لہٰذا اس کا مفہوم غالباً ظلم و ستم کے مفہوم کے مساوی ہوتا ہے ۔ لہٰذا ۔ بغی ۔ کے بعد ۔ غیر الحق ۔ مزید تاکید و توضیح کے لیے ہے ۔
اس کے بعد مسئلہ شرک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے : اے رسول ! کہہ دو میرے پروردگار نے یہ بھی حرام کیا ہے کہ کسی چیز کو بغیر دلیل کے اس کا شریک بناؤ (وان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطاناً)۔
یہاں بھی یہ بات واضح ہے کہ ۔ مالم ینزل بہ سلطاناً ۔ اس بات کی تاکید اور توضیح کے لیے ہے کہ مشرکین نے جو خدا کے شریک بنائے ہیں ان پر کوئی دلیل منطقی یا تائید عقلی قائم نہیں ہے ۔ «سلطان» کے معنی ہر قسم کی دلیل اور گواہ کے ہیں جس کی وجہ سے انسان کو اپنے مخالف پر کامیابی حاصل ہو ۔
محرمات میں سے آخری چیز جس کا آیت نے ذکر کیا ہے وہ ہے ۔ بغیر جانے بوجھے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت دینا ۔ (وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون) ۔
بغیر علم کے کوئی بات کہنا ، اس کے متعلق ہم نے اسی سورہ کی آیت ۲۸ میں گفتگو کی ہے ۔ آیات قرآنی اور روایات اسلامی میں اس بات کی بڑی تاکید کی ہے کہ مسلمان کو ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے جس کا علم نہ ہو ، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے آپ نے فرمایا :

من افتی بغیر علم لعنتہ ملائکۃ السموات والارض ۔

---

[1] تفسیر تبیان در ذیل آیت مورد بحث و تاج العروس مادہ ۔ اثم ۔

جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دیتا ہے اس پر آسمان و زمین کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں [1]
اگر ہم انسانی معاشروں کی وضعیت اور ان بدبختیوں کا بنظر غائر مطالعہ کریں جو بشریت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان بدبختیوں کا زیادہ حصّہ افواہ سازی، بغیر علم کے بات کہنے، ناحق گواہی دینے، بغیر مدرک و دلیل کے اظہار رائے کا مرہون منت ہے۔

(۳۴) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝

ترجمہ

(۳۴) ہر قوم و ملّت کے لیے ایک (معیّن) مُدت اور زمانہ ہے، جب بھی ان کی مدت ختم ہو جائے گی تو وہ لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

تفسیر

ہر گروہ کا ایک انجام ہے

اس آیت میں خداوند کریم قوانین آفرینش میں سے ایک اہم قانون، فنا و نیستی کا ذکر فرماتا ہے۔ فرزندان آدم کی روئے زمین پر زندگی سے متعلق جو بحثیں ہوئی ہیں پھر آخر امر میں گناہگاروں کا جو انجام بد گذشتہ آیات میں دکھلایا گیا ہے یہ سب اس بحث سے واضح ہو جائے گا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہر امت کے لیے ایک زمانہ و مدّتِ معیّن مقرر کی گئی ہے (ولکل امة اجل)۔

اور جس وقت یہ مدّت پوری ہو جائے گی تو پھر ایک لحظہ کے لیے وہ اس سے بڑھ سکیں گے نہ پیچھے ہٹ سکیں گے (فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون)۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں بھی افراد کی طرح قانون موت و حیات سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ کچھ قومیں توصفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں پھر ان کے بجائے دوسری قومیں آجاتی ہیں۔ لہٰذا قانون فنا سے نہ افراد الگ ہیں نہ قومیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ قوموں کی موت زیادہ تر اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ وہ لوگ راہ حق و عدالت سے منحرف ہو جاتے ہیں، ظلم و ستم کا راستہ اختیار کرتے ہیں، شہوت رانی و خواہشات کے دریا میں غرق ہو جاتے

---

[1] عیون اخبار الرضا نقل از تفسیر "نور الثقلین" جلد دوم ص ۲۶۔

ہیں، تجمل پرستی، تن پروری کی موجوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

جب دُنیا کی کوئی قوم ان راستوں پر آنکھیں بند کرکے چل پڑے اور مسلم الثبوت قوانین فطرت کو پس پشت ڈال دے تو اس کا قہری نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ وہ اپنے سرمایۂ ہستی کو کھو بیٹھے گی اور تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لیے جا گرے گی۔ اگر مختلف قوموں کے تمدنوں کا مطالعہ کیا جائے جیسے بابل، فراعنۂ مصر، قوم سبا، کلدانی، آشوری، مسلمانانِ اُندلس اور اسی طرح کی دوسری قومیں تو معلوم ہوگا کہ جب ان کی کج رویاں اور سرکشیاں حد سے بڑھ گئیں تو ان کی نابودی کا فرمان آسمان سے نازل ہوگیا، پھر ایک گھڑی کے لیے بھی وہ اپنی حکومت کے لرزاں ستونوں کو باقی نہ رکھ سکے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ عربی میں لفظ "ساعت" کم از کم وقت کے لیے بولا جاتا ہے، کبھی ایک "پل" کے لیے اور کبھی زمانہ کی ایک کم مقدار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ آج کل شب و روز کے چوبیسویں حصہ (ایک گھنٹہ) کو "ساعت" کہتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

بعض خود ساختہ مذہب جو اس زمانہ میں رونما ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے مقاصدِ شوم تک پہنچنے کیلئے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ سب سے پہلے پیغبر اسلامؐ کی خاتمیت پر بخیال خود ضرب کاری لگا کر اسے متزلزل کر دیا جائے بنابریں انہوں نے قرآن کریم کی بعض آیتوں کو مغالطے اور تفسیر بالرائے کے ذریعہ اپنے مقصد پر منطبق کرنے کی ناکام کوشش کی ہے چنانچہ آیت موردِ بحث سے بھی انہوں نے اپنا مطلب نکالنا چاہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہر اُمّت کا ایک اختتام اور انجام ہوتا ہے اور امت سے مراد مذہب ہے، بنابریں مذہب اسلام کا بھی خاتمہ ہونا چاہیئے۔

اس غلط استدلال کی حقیقت سمجھنے کے لیے بہتر ہے کہ لفظ "اُمّت" کے معنی پہلے لُغت میں اس کے بعد قرآن میں تلاش کیے جائیں۔

جس وقت لُغت کی کتابوں کو دیکھا گیا، نیز قرآن میں اس لفظ "اُمّت" کے استعمال کو دیکھا گیا جو ۶۴ مرتبہ آیا ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں اس کے معنی مجمع اور گروہ کے ہیں۔

مثلاً حضرت موسیٰؑ کی داستان میں ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۔

جب وہ مدین کے گھاٹ پر پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک مجمع کو دیکھا کہ وہ (اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے) پانی کھینچنے میں مشغول ہے[1]

---

[1] سورہ قصص آیت ۲۳۔

نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں یہ آیت ملتی ہے :

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ -

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو (لوگوں) کو خیر کی دعوت دے [1]

نیز یہ آیت بھی ہے :

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا -

ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا [2]

یہ آیت بھی قرآن میں ہے :

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ -

ایک گروہ (جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شہر ایلہ میں سکونت رکھتا تھا اس) نے کہا: ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا (ان کے گناہوں کی وجہ سے) ہلاک کرنے والا ہے ...[3]

ان تمام آیتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "امۃ" قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے وہ گروہ اور مجمع کے معنی میں آیا ہے، نہ کہ مذہب یا پیروانِ مذہب کے معنی میں اور کہیں پیروانِ مذہب پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے تو وہ بھی اس وجہ سے ہے کہ وہ بھی ایک گروہ ہوتا ہے۔ بنا بریں مورد زیر بحث آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر گروہ کا ایک وقت میں خاتمہ ہوگا یعنی صرف افراد ہی الگ الگ نہیں مریں گے بلکہ "من حیث القوم" بھی ان کے لیے موت و فنا برحق ہے۔ ان کی جمعیت بھی ایک وقت میں پراگندہ ہو جائے گی۔ بہرحال اصولی طور پر کہیں بھی لفظ "اُمّت" کا اطلاق مذہب پر نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیت کسی لحاظ سے بھی مسئلہ خاتمیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ [4]

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۰۴۔

[2] سورہ اعراف آیت ۱۶۰۔

[3] سورہ اعراف آیت ۱۶۴۔

[4] بلکہ قرآن و حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر ختم نبوت ہونے کی ناقابل تردید نصوص موجود ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ -

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں وہ تو اللہ کے رسول ہیں اور انبیاء کا اختتام کرنے والے ہیں (احزاب ۴۰)۔

نیز رسول اللہؐ کی حدیث متواتر کہ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا :

"انت منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه لا نبی بعدی"

اے علی! تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسٰی سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب غزوہ تبوک، و صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة)۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(۳۵) يٰبَنِيٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(۳۶) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۵) اے آدم کی اولاد ! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور وہ میری آیتیں تمہارے لیے پڑھیں (تو ان کی پیروی کرنا)، کیونکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اور عمل صالح بجا لائیں، (اور اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کریں)، تو ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔

(۳۶) اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں تکبّر کریں گے وہ دوزخی ہیں ، اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

بقیۂ گذشتہ حاشیہ : علاوہ بریں یہ حدیث بھی صحیح بخاری میں موجود ہے :

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون : ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ فقال : فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین ۔

میری اور دیگر انبیاء کی مثال اس شخص کی ہے جس نے ایک بہت اچھا اور عمدہ مکان بنایا ہو لیکن اس میں ایک اینٹ نامکمل چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کے چاروں طرف پھر کر دیکھیں گے اور تعجب سے کہیں گے کہ یہ ایک اینٹ کیوں نہ لگائی ۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا میں وہ آخری اینٹ ہوں اور نبیوں کا آخری ہوں ۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب خاتم النبیین) (مترجم)

[1] "اِمّا" دراصل "ان" و "ما" سے مرکب ہے ۔ "ان" حرف شرط ہے اور "ما" برائے تاکید شرط ہے ۔

تفسیر

فرزندانِ آدم کیلئے ایک اور فرمان

بار دیگر خداوندِ عالم فرزندانِ آدم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! اگر تم میں سے کچھ رسول (ہماری طرف سے)، تمہارے پاس آئیں، جو ہماری آیتوں کو تمہارے سامنے پیش کریں تو ان کی پیری کرنا، کیونکہ جو لوگ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں انہیں الٰہی عتاب و سزا کا نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی کوئی غم و اندوہ ہوگا (یا بنیٓ آدم اما یأتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی فمن اتقیٰ واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے وہ اصحابِ دوزخ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے (والذین کذبوا باٰیاتنا واستکبروا عنھا اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون)۔

ایک اور سازش کا جواب

جیسا کہ ہم نے سابقہ سطور میں بیان کیا کہ قرونِ آخر کے کچھ "دین ساز" گروہ، اپنی غلط کاریوں کیلئے راہ ہموار کرنے کے لیے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ قرآن کی کچھ آیتوں کے غلط معنیٰ کر کے مسئلہ خاتمیت پر اپنے مدعیٰ کے مطابق استدلال کریں حالانکہ ان آیات کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان آیات میں ایک آیت وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ بغیر اس کے کہ آیت کا سیاق و سباق دیکھیں وہ کہتے ہیں: اس آیت میں لفظ "یأتینکم" جو فعل مضارع ہے اور جس کے معنیٰ ہیں "تمہارے پاس آئے گا" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ بھی کچھ پیغمبر آ سکتے ہیں ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے۔

لیکن اگر ہم تھوڑا پلٹ کر دیکھیں اور ان آیات پر نظر کریں جن میں خلقتِ آدم، ان کی بہشت میں سکونت پھر بہشت سے ان کا اور ان کی زوجہ کا نکالا جانا بیان کیا گیا ہے، اور اس کا بھی لحاظ کریں کہ ان آیات میں مسلمان مخاطب نہیں ہیں بلکہ یہاں تمام انسانی معاشرے سے خطاب ہے۔ تو اس شبہ کا جواب واضح ہو جائے گا۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تمام فرزندانِ آدم کے لیے بہت رسول آئے جن میں سے بہت سوں کا نام قرآن کریم میں لیا گیا ہے اور بہتوں کا نام کتبِ تاریخ میں ثبت ہے۔

لیکن ان نیا مذہب گھڑنے والے افراد نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے پچھلی آیات کو نظر انداز کر دیا

ہے اور اس آیت کا مخاطب صرف مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ دوسرے رسولوں کے آنے کا ابھی امکان پایا جاتا ہے۔

اس طرح مغالطے سابقاً بھی بہت ہوئے ہیں خصوصاً ان لوگوں کے درمیان جو کسی آیت یا اس کے ایک حصّہ کو بقیہ سے جدا کرکے من مانے معنی نکالتے ہیں، اور اس سے قبل و بعد سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی چاہے مفہوم برعکس ہو جائے۔

(۳۷) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

(۳۷) ان لوگوں سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر بہتان باندھیں، یا اس کی آیتوں کی تکذیب کریں! یہ لوگ جو کچھ ان کے مقدر میں ہے (اس جہان کی نعمتوں میں سے)، اس سے اپنا نصیبہ پائیں گے، یہاں تک کہ ہمارے فرستادہ (قبض ارواح کے فرشتے) انہیں لینے آجائیں گے اور جانوں کو قبض کریں گے اور ان سے پوچھیں گے: کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے؟ (وہ آج تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے؟) وہ کہیں گے کہ وہ (سب آج) گم ہو گئے (اور ہم سے دُور ہو گئے) اور وہ اپنے برخلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔

تفسیر

اس آیت اور اس کے بعد والی آیات میں ان لوگوں کے انجام بد کے کچھ حالات بیان کیے گئے

ہیں جو خدا پر افترا و بہتان باندھتے ہیں اور خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ان کی کیا حالت ہو گی : کون شخص ان لوگوں سے زیادہ ظالم ہے جو خدا پر بہتان لگاتے ہیں ، یا اس کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا او کذب بآیاتہ) ۔

جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۲۱ کی تفسیر میں ہم نے اشارہ کیا کہ قرآن کی متعدد آیتوں میں " ظالم ترین افراد " کا مختلف طریقوں سے ذکر کیا گیا ہے لیکن جب ان کی ان صفات کو دیکھا جاتا ہے جو بیان کی گئی ہیں تو سب کی اصل ایک نظر آتی ہے اور وہ ہے شرک و بت پرستی اور پروردگار کی آیتوں کی تکذیب ۔ زیر بحث آیت میں ان کے علاوہ خدا پر تہمت و افترا کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جس کا ان لوگوں کی ایک نمایاں صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے ۔

اگر اس نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ تمام بدبختیوں کی جڑ شرک ہے اور تمام سعادتوں کی اصل توحید ہے ، تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ یہ لوگ جو گمراہ و گمراہ کنندہ ہیں ، کس بنا پر ظالم ترین افراد ہیں ۔ یہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور اس معاشرہ پر بھی ظلم کرتے ہیں جس کا یہ حصہ ہیں ، کیونکہ یہ ان میں نفاق و افتراق کا بیج بو کر وحدت ، ترقی اور اصلاح بشر کے راستہ پر ایک بہت بڑا سنگ راہ بن جاتے ہیں [1]

بعد ازاں وقت مرگ ان کی حالت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے : یہ لوگ چند روز کے لیے جتنا ان کے مقدر میں ہے اس سے اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں اور اللہ کی مختلف نعمتوں سے اپنے نصیب بھر بہرہ ور ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کی عمر کا جام لبریز ہو جاتا ہے اور اجل آ جاتی ہے ایسے موقع پر موت کے فرشتے جو ان کی روحیں لے جانے کے لیے مقرر ہیں وہ ان کے سر پر نازل ہو جاتے ہیں (اولٰئک ینالہم نصیبہم من الکتاب حتّٰی اذا جاءتہم رسلنا یتوفونہم) ۔

جملۂ بالا میں لفظ " کتاب " سے مراد اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمائی ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد " الٰہی پاداش عمل " ہے یا ان دونوں سے اعم معنی مراد ہیں ، لیکن اگر لفظ " حتّٰی " پر توجہ کی جائے جو عام طور سے وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی چیز کے اختتام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو معلوم ہو گا کہ " کتاب " سے مراد یہی دنیا کی گوناگوں نعمتیں ہیں جن میں نیکوکار و بدکار دونوں طرح کے افراد کا حصہ مقرر ہے مرتے وقت جن کا خاتمہ ہو جاتا ہے نہ کہ مجازات الٰہی جن کا خاتمہ مرتے وقت نہیں ہوتا ، ان نعمتوں کی تعبیر لفظ " کتاب " سے اس لیے کی گئی ہے کہ ان کو ان مسائل سے شباہت حاصل ہے جن کا حصہ رسد مقرر ہوتا ہے اور ریکارڈ بک میں اس کا اندراج کیا جاتا ہے ۔

بہر حال مرنے کے ساتھ ہی ان کی پاداش عمل شروع ہو جاتی ہے ۔ سب سے پہلے موت کے فرشتے

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد پنجم ملاحظہ فرمائیں (اردو ترجمہ)

ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور - ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے وہ معبود کہاں ہیں خدا کو چھوڑ کر تم جن کی پرستش کرتے تھے - اور تمام عمر ان کی پرستش کا دم بھرتے تھے اور اپنی تمام چیزوں کو ان پر قربان کرتے تھے (قالوآاین ماکنتم تدعون من دون اللّٰہ)۔

وہ جب یہ دیکھیں گے کہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ ختم ہوگیا ہے اور جو امیدیں ان خود ساختہ خداؤں سے باندھ رکھی تھیں وہ سب خاک ہوگئی ہیں تو وہ جواب میں کہیں گے : " وہ سب گم ہوگئے اور ہم سے دُور ہوگئے " اب ہمیں ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ وہ یہ عذاب ہم سے دُور کرسکیں اور ہماری تمام عبادتیں جو ان کے لیے تھیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں (قالوا ضلوا عنا)۔

اور - اس طرح وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے (و شھدوا علیٰ انفسھم انھم کانوا کافرین)۔

اگرچہ اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے ان سے صرف سوال کریں گے اور وہ جواب دیں گے ، لیکن فی الحقیقت یہ ان کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوگی مقصد یہ ہے کہ ان کی جو خراب حالت مرنے کے بعد ہونے والی ہے وہ انہیں یاد دلائی جائے کہ کس طرح انہوں نے ایک عمر غلط راستہ پر گزار دی اور اپنا تمام سرمایۂ وجود تباہ کر دیا اس کے عوض انہیں کچھ بھی نہ ملا۔ پلٹنے کا راستہ بھی ان کے لیے بند ہوگیا اور یہ ان کے کیفر اعمال کا پہلا تازیانہ ہے جو اللہ کی طرف سے ان کی روح پر لگایا جائے گا۔

(۳۸) قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ○

(۳۹) وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○ ؏

ترجمہ

(۳۸) (خداوند کریم ان سے) کہے گا : جنوں اور انسانوں میں سے جو تم سے پہلے تھے (اور

وہ بد اعمالی میں تم جیسے تھے) ان کے ہمراہ تم بھی آگ میں داخل ہو جاؤ، جب بھی ایک گروہ (آگ میں) داخل ہوگا تو وہ دوسرے گروہ پر لعنت بھیجے گا تاکہ سب ذلت کے ساتھ اس میں باقی رہیں۔ (اس ہنگام) پیروی کرنے والا گروہ اپنے پیشواؤں کے متعلق کہے گا: خدایا! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا آگ کے عذاب کو ان کے لیے دوگنا قرار دے (ایک عذاب خود ان کی گمراہی کے بدلہ میں دوسرا عذاب ہم کو گمراہ کرنے کے بدلہ میں۔ خدا) کہے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے (کیونکہ پیروی کرنے والے اگر پیشواؤں کے چاروں طرف اکٹھا نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو گمراہ نہ کر پاتے)۔

(۳۹) پیشوا اپنے پیروؤں سے کہیں گے تمہیں ہم پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے پس عذاب (الٰہی) کا مزہ اس (عمل)، کے بدلے میں چکھو جو تم نے انجام دیا ہے۔

تفسیر

دوزخ میں پیشواؤں اور پیروؤں کا جھگڑا

ان آیتوں میں بھی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام بد ہونے والا ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔ پچھلی آیتوں میں وقتِ مرگ ان لوگوں کو جو کچھ پیش آنے والا ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں گمراہ کرنے والوں اور گمراہ ہونے والوں میں جو جھگڑا ہوگا اسے بیان کیا گیا ہے: قیامت کے روز خدا ان سے کہے گا کہ جنوں اور انسانوں کا جو گروہ تم جیسا تم سے پہلے گزرا ہے ان کے ساتھ آتشِ جہنم میں داخل ہو جاؤ (قال ادخلوا فیٓ امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس فی النار)۔

ہوسکتا ہے کہ یہ فرمان ایک فرمانِ تکوینی ہو۔ یعنی خدا ان دونوں گروہوں کو آتشِ جہنم میں ایک جگہ ٹھہرائے گا، یا یہ کہ یہ فرمانِ تشریعی کے مشابہ ہو جسے وہ اپنے کانوں سے سنیں گے اور مجبوراً اس کی اطاعت کریں گے۔

جس وقت وہ دوزخ میں داخل ہوں گے تو جو لوگ ان کے ہم کیش اور ہم مسلک ہیں ان سے ان کا جھگڑا شروع ہوگا۔ ایک عجیب و عبرت انگیز جھگڑا۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو دوسرے گروہ پر

لعنت کرے گا اور اسے اس بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا" (کلما دخلت امة لعنت اختہا)[1]

ہم نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے کہ قیامت کا منظر اس دُنیا کی عکاسی کرے گا۔ اس دنیا میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنے برخلاف گروہ سے برسر پیکار ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبران الٰہی اور اللہ کے نیک اور مصلح بندے جب بھی آئے انہوں نے ایک دوسرے کی تائید کی اور یہ بتلایا کہ ہم سب کا مقصد ایک ہی ہے۔

مطلب یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب سب کے سب بڑی ذلت وخواری کے ساتھ دوزخ کے شرر بار شعلوں میں پہنچ جائیں گے تو ایک دوسرے کی شکایت خدا کی بارگاہ میں کرنے لگ جائیں گے۔ سب سے پہلے فریب خوردہ افراد جب اپنے لیے راہ نجات ہرطرف سے بند پائیں گے تو یہ شکایت کریں گے: پروردگارا! ان گمراہ کرنے والوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، خدایا! ان کے عذاب کو دوگنا کر دے، ایک عذاب خود گمراہ ہونے کی وجہ سے، دوسرا عذاب ہمیں گمراہ کرنے کی وجہ سے" (حتّیٰ اذا ادارکوا فیھا جمیعًا قالت اخراھم لاولٰھم ربنا ھٰؤلاء اضلونا فاٰتھم عذابًا ضعفًا من النار)۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ درخواست بالکل صحیح ومنطقی ہے، بلکہ اگر ان کی یہ درخواست نہ بھی ہو تب بھی گمراہ کرنے والے دوسرے عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ وہ ان کا بار بھی اپنے کاندھے پر اٹھائیں گے جن کو انہوں نے گمراہ کیا تھا اور ان کے اپنے عمل کا عذاب بھی کم نہ ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے جواب میں یہ کہا جائے گا: "تم دونوں گروہوں کا عذاب دوگنا ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے" (قال لکل ضعف ولٰکن لا تعلمون)۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اتباع کرنے والوں کا عذاب کیوں دوگنا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیشوایانِ ظلم وستم اور سردارانِ بے راہ روی وگمراہی اپنی اسکیموں کو اکیلے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ یہ ضدی وہٹ دھرم پیروکار ہیں جو ان کے باطل مقصد تک پہنچنے میں مدد کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ یہ پیروکار ہیں جو ان کا تنور گرم کرتے ہیں اور ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں دوسروں کو گمراہ کرنے کا موقع ملتا ہے، لہٰذا اس گروہ کو بھی دوگنا عذاب ملنا چاہیئے۔ ایک سزا تو ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے، دوسری سزا ظالم، ستمگر اور گمراہ پیشواؤں کی حمایت کی وجہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مشہور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے ایک دوست جس کا نام صفوان تھا کو ظالم ہارون رشید کے کاموں میں کسی طرح کی شرکت کرنے سے روکا اور فرمایا:

اگر لوگ ان ظالموں کی مدد نہ کریں اور ان کی حمایت نہ کریں تو یہ عادل پیشواؤں کا

---

[1] چونکہ لفظ "امۃ" مؤنث ہے اس لیے اس کی مناسبت سے لفظ "اخت" آیا ہے جس کے معنی بہن کے ہیں جو ان گمراہ گروہوں کے ارتباط باہمی پر دلالت کرتا ہے۔

حق کس طرح غصب کر سکتے ہیں۔

بعد کی آیت میں ان گمراہ پیشواؤں کا جواب اس طرح نقل کیا گیا ہے: وہ اپنے پیروکاروں سے کہیں گے ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی اگر ہم نے کوئی غلط بات کہی تو تم نے تائید کی اور اگر ہم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو تم نے ہمارا ساتھ دیا اور اگر ہم نے ستم کیا تو تم ہمارے یار و مددگار تھے لہٰذا تم بھی اپنے کرتوتوں کے بدلے خدا کا دردناک عذاب چکھو (و قالت اولٰهم لاخرٰهم فما کان لکم علینا من فضل فذوقوا العذاب بما کنتم تکسبون)۔
یہاں پر لفظ "اولی" سے مراد پہلے لوگ یعنی پیشوا گروہ اور لفظ "اخری" سے مراد پیروی کرنے والا گروہ ہے۔

(٤٠) اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ○

(٤١) لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ○

ترجمہ

(٤٠) وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے میں تکبّر کیا، آسمان کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جائیں گے (اور وہ کبھی) بہشت میں داخل نہ ہوں گے الا یہ کہ اُونٹ سُوئی کے ناکہ سے گزر جائے (یعنی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا) مجرموں کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔

(٤١) ان کے لیے دوزخ (کی آگ) کے بستر ہوں گے اور ان کے اوپر اوڑھنا بھی (اسی کا)

ہے اور ظالموں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں ۔

تفسیر

ایک مرتبہ پھر قرآن نے ان متکبر اور ضدی افراد کا انجام بیان کیا ہے جو پروردگار کی آیتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور حق کو نہیں مانتے۔ کہا گیا ہے : وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں تکبر اختیار کیا آسمان کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جائیں گے (ان الذین کذبوا بآیاتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء)۔

ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے اس طرح وارد ہوئی ہے :

اما المؤمنون فترفع اعمالهم وارواحهم الی السماء فتفتح لهم ابوابها واما الکافر فیصعد بعمله وروحه حتی اذا بلغ الی السماء نادی مناد اهبطوا به الی سجین ۔

مومنین کے اعمال و ارواح آسمان کی طرف لے جائے جائیں گے اور آسمان کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور کافر کا عمل اور روح بھی آسمان کی طرف لے جائی جائے گی جب یہ آسمان کے پاس پہنچے گی تو آواز آئے گی اسے سجین (دوزخ) کی طرف نیچے لے جاؤ[1]

اسی مضمون کی دیگر روایات بھی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تفسیر طبری وغیرہ میں اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں ۔

یہاں پر آسمان سے مراد ممکن ہے کہ اس کے ظاہری معنی ہوں۔ نیز ممکن ہے اس سے مراد مقام قرب الٰہی ہو جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت ۱۰ میں ہے :

اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ ۔

"پاکیزہ کلمے اس کی طرف اوپر جاتے ہیں اور عمل صالح ان کو اوپر اٹھاتا ہے ۔"

اس کے بعد مزید اشارہ ہوتا ہے : وہ بہشت میں داخل نہیں ہوں گے مگر اس وقت جبکہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے گزر جائے (ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط)۔

یہ ایک لطیف کنایہ ہے اس امر کے محال ہونے کی طرف ۔ مقصد یہ ہے کہ ان افراد کے جنت میں جانے کا غیر ممکن ہونا حسی طور سے لوگوں کے سامنے آجائے کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اونٹ اپنے عظیم جثہ کے ساتھ سوئی کے ناکہ میں نہیں گھس سکتا اسی طرح ان بے ایمان و متکبر افراد کا بہشت میں داخلہ ناممکن ہے۔

لغت میں "جمل" اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے حال ہی میں دانت نکلے ہوں۔ لیکن "جمل" کے ایک معنی اس مضبوط رسی کے بھی ہیں۔ جس سے کشتی کو باندھتے ہیں[2] چونکہ رسی اور سوئی آپس میں مناسبت رکھتے ہیں

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکورہ ۔

[2] کتاب "تاج العروس" اور "قاموس" ملاحظہ فرمائیں ۔

اس لیے بعض مفسّرین نے اس معنی کو بہتر جانا ہے۔ لیکن اکثر مفسّرین نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے اور حق پہلا معنی اختیار کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے، کیونکہ :

(۱) پیشوایانِ اسلام کی روایات میں پہلے ہی معنی وارد ہوئے ہیں۔

(۲) اس تفسیر کی نظیر خود پسند و متکبّر ثروت مندوں کے بارے میں بھی موجودہ انجیل میں ملتی ہے۔ انجیل لوقا باب ۱۸ جملہ ۲۴، ۲۵ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا :

کس قدر مشکل ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحبانِ دولت ہیں کہ وہ داخل ہوں خدا کی ملکوت و سلطنت میں، کیونکہ یہ بات زیادہ آسان ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو بہ نسبت اس کے کہ دولت والا[1] خدا کی ملکوت و سلطنت میں داخل ہو۔

کم از کم اس جملہ سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ یہ محاورہ قدیم زمانہ سے عربوں میں مستعمل تھا۔ آج کل بھی یہ محاورہ ہمارے درمیان ایسے شخص کے بارے میں جو کبھی تو بہت سخت گیری کرتا ہو اور کبھی بہت نرمی سے پیش آتا ہو رائج ہے کہ - فلاں شخص کبھی تو دروازہ میں داخل نہیں ہوتا اور کبھی سوئی کے ناکے سے گزر جاتا ہے :

(۳) لفظ - جمل - کا استعمال زیادہ تر پہلے معنی (اونٹ) میں کیا جاتا ہے۔ جبکہ موٹی رسّی کے لیے اس کا استعمال بہت کم ہے لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید و توضیح کے لیے فرماتا ہے : ہم اس طرح کے گنہگاروں کو سزا دیتے ہیں (و کذالک نجزی المجرمین) ۔

اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کے دردناک عذاب کے ایک اور حصّے کی طرف اشارہ فرماتا ہے : ایسے لوگوں کے لیے جہنم اور بھڑکتی ہوئی آگ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے (لھم من جھنم مھاد ومن فوقھم غواش)[2]

پھر دوبارہ تاکید کے لیے فرماتا ہے : ہم اس طرح سے ظالموں اور ستمگاروں کو سزا دیں گے (و کذالک نجزی الظالمین) ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ کبھی انہیں - مجرم - کبھی - ظالم - کبھی - آیاتِ الٰہی کا جھٹلانے والا - اور کبھی - متکبّر - کے لقب سے تعبیر کیا گیا ہے درحقیقت ان سب کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

---

[1] یہاں پر - دولت والے - سے مراد فاسق و فاجر دولت مند مراد ہیں نہ کہ مطلقاً ہر دولت والا۔ (مترجم)

[2] - مھاد - جمع ہے - مھد - (بروزن عھد) کی جس کے معنی بستر کے ہیں۔ - غواش - جو دراصل - غواشی - تھا جمع ہے - غاشیہ - کی جس کے معنی ہر طرح کی پوشش کے ہیں خیمہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ اس آیت میں ممکن ہے خیمہ کے معنی میں ہو یا اس کا معنی پوشش ہو۔

(۴۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(۴۳) وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۙ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

(۴۲) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے کسی پر ہم اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے، وہ اہل بہشت ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۴۳) اور ان کے دلوں میں جو کینہ اور حسد ہے اسے ہم باہر نکال دیں گے (تاکہ صلح و صفائی کے ساتھ باہم زندگی بسر کریں) اور ان کے (محلوں اور درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ (اس وقت) وہ کہیں گے ساری تعریفیں اس خدا کے لیے مخصوص ہیں جس نے ان (نعمتوں) کی طرف ہماری ہدایت کی اور اگر اللہ ہماری ہدایت نہ کرتا تو ہمیں (ان کی) راہ نہ ملتی، بے شک ہمارے رب کے سارے رسول حق کے ساتھ آئے اور (اس وقت) انہیں یہ ندا سنائی دے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، ان اعمال کے بدلے جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

تفسیر

سکون کامل وسعادتِ جاودانی

جیسا کہ ہم نے سابقاً بھی اشارہ کیا ہے کہ روشِ قرآنی یہ ہے کہ کسی مطلب کی تاکید کے لیے وہ مختلف گروہوں اور ان کے انجاموں کا برابر سے ذکر کرتا ہے، اور ان کا آپس میں موازنہ کرکے ان کی وضعیت وحیثیت کی تشریح کرتا ہے۔ گذشتہ آیات میں منکرینِ آیاتِ خدا متکبر و ظالم افراد کے انجام کو دکھایا گیا تھا۔ اب ان آیات میں با ایمان لوگوں کے تابناک انجام کی اس طرح شرح کرتا ہے: اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیا وہ اہل بہشت ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات . . . اولٓئک اصحاب الجنة هم فیها خالدون)۔

لیکن اس جملہ کے درمیان میں (یعنی مبتدا و خبر کے درمیان میں) ایک جملہ معترضہ[۱] آیا ہے' جو فی الحقیقت بہت سے سوالات کا جواب ہے اور وہ یہ ہے: ہم کسی شخص پر اس کی قوت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے (لا نکلف نفسًا الا وسعها)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ با ایمان اور صالح افراد کی صف میں داخل ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، سوائے گنے چنے افراد کے اور کوئی ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ پروردگار عالم کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریاں (احکام) افراد کی قوت وصلاحیت کے لحاظ سے ہوتی ہیں اور اس طرح وہ عالم و جاہل، چھوٹے بڑے اور ہر عمر کے انسانوں کے لیے راستہ کھول دیتا ہے اور ہر ایک کو صالحین کی صف میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ خدا کو ہر شخص سے اتنی ہی توقع ہے جتنی اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیت ہے۔

یہ آیت مثل کثیر دیگر آیات کے بیان کرتی ہے کہ نجات وسعادت ابدی کا ذریعہ صرف ایمان وعمل صالح ہے۔ اس طرح عیسائیوں کے اس خرافاتی عقیدہ کی رد ہو جاتی ہے جس کے مطابق آج کل کے مسیحی لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی قربانی بشر کے تمام گناہوں کے مقابلے میں وسیلۂ نجات ہے۔ آیۂ مذکورہ اس عقیدہ پر خطِ تنسیخ کھینچتی ہے۔ قرآن کریم نے جو بار بار ایمان وعمل صالح پر زور دیا ہے وہ اسی قسم کے عقیدوں کو باطل کرنے کے لیے ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک انتہائی اہم نعمت جو اللہ جنت والوں کو عطا کرے گا اور وہ نعمت ان

---

[۱] یہ اشتباہ نہ ہو کہ جملہ معترضہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ مطلب سے بالکل بے ربط ہے۔ بلکہ وہ بھی مطلب سے ایک طرح کا ربط رکھتا ہے اگرچہ جملہ بندی کی رُو سے دوسری عبارت کے درمیان اسے جگہ دی جاتی ہے۔ بنا بریں جملہ معترضہ صرف جملہ بندی کے لحاظ سے الگ دکھائی دیتا ہے نہ کہ معنی کے لحاظ سے۔

کی روح کے آرام کا باعث ہوگی اسے اس طرح بیان فرمایا ہے : ان کے دلوں سے ہم ہر طرح کے کینے، حسد اور دشمنی کو دُور کر دیں گے (و نزعنا ما فی صدورھم من غل)۔

۔غل۔ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز کسی چیز میں مخفی طور سے اُتر جائے۔ اسی وجہ سے حسد، کینہ اور دشمنی کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ جذبے چپکے سے انسان میں نفوذ کر جاتے ہیں اور کبھی رشوت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی کسی خیانت کے لیے خفیہ طور سے دی جاتی ہے [1]

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں انسان کی ناراضی و پریشانی کا ایک بڑا سبب جس کی وجہ سے عالمی جنگیں بھی پھیل چکی ہیں، جانی و مالی نقصانات مرتب ہوتے ہیں اور انسانی سکون رخصت ہوگیا ہے، وہ یہی کینہ و حسد ہے۔

ہم بہت سے ایسے افراد کو جانتے ہیں جن کی اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دوسروں سے حسد ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ یہ کینہ پروری ہے جو اُن کی راحت و آرام کی زندگی کو تاراج کر دیتی ہے اور تھکا دینے والی بیکار کد و کاوش میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اہلِ بہشت اس طرح کی بدبختیوں سے بالکل آسودہ ہوں گے۔ ان کے دلوں میں نہ کینہ ہوگا نہ حسد ہوگا اور نہ ان کے بُرے نتائج ہوں گے۔ وہ لوگ آپس میں نہایت دوستی اور مہر و محبت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے اور سب کے سب اپنی حالت پر راضی ہوں گے۔ حتیٰ کہ جن کا مرتبہ نیچا ہوگا وہ بھی اعلیٰ درجہ والوں پر حسد نہیں کریں گے اس طرح ان کی باہم زندگی کی سب سے بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس وقت اہلِ بہشت، بہشت کی طرف روانہ ہوں گے تو جنت کے دروازہ پر ایک درخت دیکھیں گے جس کے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے۔ اہلِ بہشت ان میں سے جب ایک چشمہ سے پانی پئیں گے تو ان کے دلوں سے ہر قسم کے کینے اور حسد دُھل جائیں گے، یہ وہی ۔شرابِ طہور۔ ہے جس کا ذکر سورۂ دھر میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے چشمے میں جب وہ نہائیں گے تو جسم کے تمام عیوب اور تھکاوٹ سستی وغیرہ زائل ہو جائے گی اس کے بدلے ان کے بدن میں تازگی اور خوبصورتی آجائے گی اس طرح کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی نہ بوڑھے ہوں گے نہ متغیر [2]

اس حدیث کی سند اگرچہ پیغمبرِ اکرمؐ یا آئمہؑ تک نہیں پہنچی ہے کیونکہ اسے صرف ایک مفسر۔ سدی۔ نے نقل کیا ہے لیکن بعید نہیں کہ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مروی ہو کیونکہ یہ ایسے مسائل نہیں ہیں جن سے ۔سدی۔ یا ان کی طرح کے دوسرے افراد مطلع ہوں۔ بہر حال اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے کہ اہلِ بہشت اندر اور باہر دونوں طرف سے دُھل جانے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔ خدا تعالیٰ انہیں حُسنِ ظاہری عطا فرمائے گا اور جمالِ باطنی بھی، اُس عالم میں وہ کینہ اور حسد سے بچے رہیں گے۔

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم ص ۱۱۷ ملاحظہ ہو (اردو ترجمہ)۔

[2] تفسیر المنار جلد ۸ ص ۴۰۱۔

کیا کہنا ان لوگوں کا جو اس دنیا میں بھی اپنے لیے جنت بنا لیں اور اپنے سینوں کو کینہ اور حسد سے پاک کرلیں اور اس کے نتیجہ میں جو تکلیفیں پیدا ہوتی ہیں ان سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بچالیں۔

قرآن کریم اس روحانی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد، ان کی مادّی اور جسمانی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے: ان کے محلوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہوں گی (تجری من تحتھم الانھار)۔

اس کے بعد اہل بہشت کی پوری رضامندی اور کامل خوشنودی کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: جبکہ وہ یہ کہیں گے۔ ساری تعریفیں اور شکرانے اس خدا کے لیے مخصوص ہیں جس نے ان تمام نعمتوں کی طرف ہماری ہدایت کی، اگر وہ ہماری ہدایت نہ کرتا تو ہم ہرگز ہدایت نہ پاتے، یہ اس کی توفیق تھی جس نے ہمارا ہاتھ تھام کر زندگی کی سخت گذرگاہوں میں سے ہمیں گزار دیا اور سعادت کی منزل تک پہنچا دیا" (وقالوا الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولآ ان ھدانا اللہ)۔

بے شک ہمارے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول سچ کہتے تھے اور ہم اب اپنی آنکھوں سے ان کی سچائی کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں (لقد جآءت رسل ربنا بالحق)۔

اسی اثناء میں خدا کی طرف سے ایک ندا بلند ہوگی جو ان کے دل و جان میں سما جائے گی اور وہ اسے سُن کر خوش ہوجائیں گے اور وہ ندا یہ ہوگی: یہ جنت تم نے اپنے پاک اور نیک اعمال کے بدلے میراث میں پائی ہے (ونودوآ ان تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون)۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ نجات ابدی عمل صالح کے سایہ میں ہے، نہ کہ بے بنیاد توہمات و مزعومات کی بناء پر۔

"ارث" کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مال یا ثروت ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے بغیر اس کے کہ ان کے درمیان کوئی قرار داد یا معاہدہ طے پائے (یعنی ایک طبیعی طریقے سے، نہ کہ خرید و فروخت وغیرہ کے ذریعے سے) میت سے اس کے اعزاء کو جو مال پہنچتا ہے اسے بھی "ارث" اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

"ارث" کیوں کہا گیا

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس لیے اہل بہشت سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کو اپنے اعمال کی وجہ سے میراث کے طور پر پایا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک حدیث میں ملتا ہے جو سُنّی اور شیعہ دونوں طریقوں سے مروی ہے۔ یہ حدیث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے جس میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

ما من احد الاولہ منزل فی الجنۃ ومنزل فی النار فاما الکافر فیرث المؤمن منزلہ من النار، والمؤمن یرث الکافر منزلہ من الجنۃ فذالک قولہ: اورثتموھا بما کنتم تعملون۔

ہر شخص بغیر کسی استثناء کے، ایک منزل جنت میں اور ایک منزل دوزخ میں رکھتا ہے، کافر مؤمنین کی ان منزلوں کو میراث میں پائیں گے جو جہنم میں ہیں اور مؤمنین کافروں کی جنت میں منزلوں کو میراث میں پائیں گے اور یہی ہیں معنی خدا کے اس قول کے : اورثتمو ھا بما کنتم تعملون [1]

اس حدیث میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خوش قسمتی اور بدبختی کے دروازے ہر ایک شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، اپنے آغاز میں کوئی شخص نہ جنتی ہے نہ جہنمی، بلکہ ہر شخص دونوں کی استعداد رکھتا ہے یہ خود انسان کا ارادہ ہے جو اس کی قسمت کو معیّن کرتا ہے۔ یہ بات بدیہی ہے کہ جب مؤمنین اپنے نیک عمل کی وجہ سے جنّت میں جائیں گے اور ناپاک اور بے ایمان دوزخ میں جگہ پائیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک کی خالی جگہ دوسرے کو مل جائے گی۔

بہرحال یہ آیت اور یہ حدیث ان واضح دلیلوں میں سے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسئلہ جبر باطل ہے اور انسان اپنے ارادہ میں کامل آزاد ہے۔

(۴۴) وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدْتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ‌ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ‌ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۙ‏

(۴۵) الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ‌ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ‌ ۘ‏

ترجمہ

(۴۴) اور بہشت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہم نے اس وعدہ کو حق پایا جو ہمارے اللہ نے ہم سے کیا تھا۔ کیا تم نے بھی حق پایا اس وعدہ کو جو اللہ نے تم سے کیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں! اسی اثناء میں ایک ندا کرنے والا ان کے درمیان یہ ندا کرے گا کہ خدا کی لعنت ہو ظالموں پر۔

---

[1] نور الثقلین جلد دوم ص ۳۱، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۶۴۵ اور دیگر تفاسیر۔

(۴۵) (ایسے ظالم) جو لوگوں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں اور (ان کے دلوں میں شبہات ڈال کر) اس (راستے) کو ٹیڑھا دکھلاتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔

تفسیر

گذشتہ بحث کے بعد جس میں جنتیوں اور دوزخیوں کا انجام بیان کیا گیا ہے، ان آیات میں دونوں گروہوں کی آخرت میں جو گفتگو ہوگی اسے بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنتی لوگ دوزخ والوں کو مخاطب کرکے آواز دیں گے کہ ہم نے اپنے پروردگار کا وعدہ برحق پایا، کیا تم نے بھی اپنے اس انجام کو پایا ہے جس کا وعدہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ کیا تھا (ونادیٰ اصحاب الجنة اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فهل وجدتم ما وعد ربكم حقًا)۔

وہ لوگ جواب میں کہیں گے ہاں ہم نے تمام باتیں حقیقت کی صورت میں دیکھ لیں (قالوا نعم)۔

اس بات کی طرف توجہ ہونا چاہیئے کہ لفظ "نادیٰ" اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن اس جگہ اس کے معنی مستقبل کے نکلیں گے۔ اس طرح کی تعبیریں قرآن میں بہت استعمال ہوئی ہیں جن میں آئندہ ہونے والے یقینی واقعات و حوادث کو فعل ماضی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس میں ایک طرح کی تاکید منظور ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہونے والی بات اس طرح یقینی ہے جیسے زمانہ ماضی میں ہوچکی ہو۔

ضمنی طور سے یہ مطلب بھی اس میں مضمر ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان مقامی و مکانی طور سے کافی فاصلہ ہوگا کیونکہ "ندا" دور سے کی جاتی ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہاں پر یہ سوال کرے کہ ان دو گروہوں کی مذکورہ گفتگو کا کیا فائدہ؟ جبکہ دونوں کو ایک دوسرے کا جواب معلوم ہے۔

اس بات کا جواب بھی معلوم ہے کیونکہ سوال ہمیشہ معلومات بڑھانے کے لیے نہیں کیا جاتا، بلکہ کبھی سرزنش و توبیخ کے لیے بھی سوال کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ سوال اسی مقصد کے ماتحت کیا جائے گا۔ حقیقت میں گنہگاروں اور ستمگاروں کے لیے یہ سوال بھی ایک طرح کی سخت سزا ہوگی، کیونکہ جب یہ لوگ دارِ دنیا میں تھے تو اپنی ملامت اور سرزنش سے باایمان افراد کو روحانی اذیت دیتے تھے لہٰذا آج (بروزِ قیامت) انہیں اس کی سزا ضرور ملنا چاہیئے اس کی نظیر قرآن میں کئی جگہ ملتی ہے۔ جیسے آخر سورۂ مطففین میں[1]

---

[1] آخر سورۂ مطففین جیسے:

هل ثوب الكفار ما كانوا يفعلون۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اسی اثنار میں ایک بولنے والا یہ ندا کرے گا (ایسی ندا جو ہرایک کے کان میں پہنچے گی) کہ لعنت ہو خدا کی ستم کرنے والوں پر! (فاذّن موذن بینھم ان لعنۃ اللہ علی الظالمین)۔

بعدازاں ان ستمگاروں کی پہچان یوں کرواتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو راہِ راست سے روکتے تھے، اور اپنی زہریلی تبلیغات سے لوگوں کے عقائد کی جڑوں کو کمزور کرکے ان کے دلوں میں شک و شبہ ڈالتے تھے اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے (الذین یصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجًا وھم بالاٰخرۃ کافرون)،[1]

مذکورہ بالا آیت سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہرقسم کی بے راہ رویاں اور مفسدے "ظلم وستم" کے مفہوم میں جمع ہیں اور لفظ "ظالم" کا ایک ایسا وسیع مفہوم ہے جو اپنے دامن میں تمام گنہگاروں کو خصوصاً ان گمراہوں کو جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، لیے ہوئے ہے۔

یہ ندا کرنے والا کون ہے؟

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "مؤذن" (ندا کرنے والا) جو اس طرح سے ندا کرے گا کہ اس کی آواز سب اہلِ محشر سُن لیں گے اور اس طرح تمام اہلِ محشر پر اس کا تفوق و برتری ظاہر ہوگی، کون ہے؟ آیت سے تو کچھ نہیں کھلتا، لیکن اسلامی روایات میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں زیادہ یہ وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ ابوالقاسم حسکانی جو اہلِ سنت کے علماء میں سے ہیں اپنی سند کے ساتھ محمد حنفیہ سے اور وہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

انا ذالک المؤذن:

وہ ندا کرنے والا میں ہی ہوں۔

نیز اسی طرح اپنی سند سے ابنِ عباس سے نقل کرتے ہیں:

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا حاشیہ): یا اوّل سورہ قمر جیسے:

اقترب الساعۃ وانشق القمر۔

قرب اور اقتربت اور انشق یہ سب ماضی کے صیغے ہیں جو بمعنی مستقبل کے استعمال ہوئے ہیں۔ (مترجم)

[1] "یبغونھا عوجا" کا معنی ہے "یطلبونھا عوجاً" یعنی وہ چاہتے ہیں اور سعی و جستجو کرتے ہیں کہ شبہات پیدا کرکے اور زہریلے پراپیگنڈا سے حقیقی راستے کو دگرگوں کردیں۔

ضمناً راغب مفردات میں کہتا ہے "عوج" (بروزن "کرج") حسی ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں، لیکن "عوج" (بروزن "پدر") فکری ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کی کچھ آیات مثلاً سورہ طٰہٰ آیت ۱۰۷ اس سے مناسبت نہیں رکھتی (غور کیجئے گا)۔

قرآن میں حضرت علیؑ کے کچھ نام ہیں جن کو لوگ نہیں جانتے ، ان میں سے ایک نام آپ کا "مؤذن" بھی ہے جو اس آیت " فاذن موذن بینھم " میں آیا ہے ، علی ہیں جو یہ ندا کریں گے اور کہیں گے : " الا لعنة الله علی الذین کذبوا بولایتی واستخفوا بحقی " : اللہ کی لعنت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے میری ولایت کو جھٹلایا اور میرے حق کو سبک سمجھا۔[1]

شیعہ طریقوں سے بھی اس بارے میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں ، جیساکہ جناب صدوق علیہ الرحمۃ نے اپنی سند کے ساتھ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے :

حضرت امیرالمؤمنینؑ کو جنگ نہروان سے واپسی کے موقع پر معلوم ہوا کہ معاویہ آپ کو کھلے بندوں گالیاں دیتا ہے اور آپ کے دوستوں کو قتل کر رہا ہے اس وقت حضرت نے ایک خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا :

دنیا و آخرت میں ندا کرنے والا میں ہوں جس کا خدا نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے کہ : فاذن موذن بینھم ان لعنة الله علی الظالمین ، میں وہ روزِ قیامت کا مؤذن ہوں ، نیز اللہ نے فرمایا ہے : واذان من الله ورسولہ (حج کے موقع پر یہ ندا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہر ایک کے کان میں پہنچ جائے) یہ ندا کرنے والا بھی میرے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا ۔[2]

ہم نے جہاں تک سوچا کہ بروزِ قیامت حضرت علی علیہ السلام ندا کیوں کریں گے تو سمجھ میں آیا کہ :

اولاً ۔ یہ کہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے رسول کی طرف سے یہ منصب آپؑ کو ملا ہوا تھا کیونکہ فتح مکہ کے بعد آپ کو یہ حکم ملا تھا کہ موسم حج میں سورۂ برأت کو تمام حاجیوں کے سامنے پڑھ کر اس طرح سنا دیں کہ اسے سب سُن لیں اور ان سے یہ کہہ دیں : وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (یہ ندا ہے خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن کہ خدا اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں)[3]

دوسرے ۔ یہ کہ اپنی تمام زندگی میں حضرت علی علیہ السلام کا جو مُوقف تھا وہ ظلم وستم سے مبارزہ اور جنگ کا مؤقف تھا ۔ ایک ایسا مؤقف جس میں آپ ظالموں اور ستمگاروں کے برخلاف مصروف پیکار رہے ۔ کیونکہ آپ کی پوری زندگی میں یہ پہلو بہت درخشاں نظر آتا ہے کہ آپ کی زندگی ہمیشہ مظلوم کی حمایت اور ظالم سے عداوت میں صرف ہوئی ہے لیکن ان شرائط کے ساتھ جو اس عصر کا تقاضا تھا ۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکور ۔

[2] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۱ ۔

[3] سورۂ توبہ آیت ۳ ۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ آخرت کی زندگی، اسی دنیا میں انسانوں کی جو زندگی ہے اس کا ایک ترقی یافتہ نمونہ ہوگی۔ اس لیے کیا جائے تعجب ہے کہ اس دن کا مؤذن جو جنت اور دوزخ کے درمیان خدا اور رسول کی طرف سے ظالموں پر لعنت کی ندا کرے گا۔ وہ حضرت علی علیہ السلام ہی ہوں گے۔!

ہماری بات سے مؤلف "المنار" کے اعتراض کا جواب معلوم ہو جائے گا جنہیں حضرت علی علیہ السلام کی اس فضیلت میں شک ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس بات کا حضرت علیؑ کے لیے فضیلت ہونا یقینی نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ جس طرح حج اکبر کے موقع پر حضرت علیؑ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں سورۂ برأت کا تلاوت کرنا ان کے لیے عظیم فضیلت اور بڑے فخر کا سبب ہے اور جس طرح ظالموں اور سرکشوں سے نبرد آزما ہونا آپ کی نمایاں منقبت ہے، بالکل اسی طرح قیامت کے روز آپؑ کا اس منصب جلیل پر فائز ہونا جو فی الحقیقت آپؑ کے دنیاوی عہدوں کا تتمہ ہوگا آپؑ کے لیے عظیم منقبت اور فضیلت کا باعث ہے۔

نیز گذشتہ سطور سے آلوسی مؤلف تفسیر "روح المعانی" کی بات کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا جنہوں نے کہا ہے کہ ان احادیث کا اہل سنت کی سندوں سے روایت ہونا ثابت نہیں ہے، کیونکہ ہم نے تحریر کیا ہے کہ ان احادیث کو شیعہ اور سُنّی عالموں نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

(۴۶) وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○

(۴۷) وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

(۴۸) وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ○

(۴۹) أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ

لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

(۴۶) اور ان دونوں (جنت والوں اور دوزخ والوں) کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ان دونوں کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے۔ وہ بہشت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلام ہو لیکن وہ بہشت کے اندر داخل نہ ہو سکے ہوں گے جبکہ اس کے امیدوار ہوں گے۔

(۴۷) اور جس وقت ان کی نظر دوزخیوں پر پڑے گی تو کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ستمگاروں کے ساتھ نہ رکھنا۔

(۴۸) اور اعراف والے (مرد) کچھ مردوں کو (دوزخیوں میں سے)، جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے، پکاریں گے اور کہیں گے کہ (دیکھا) تم نے جن چیزوں کو اکٹھا کیا تھا (یعنی مال و دولت اور زوجہ و اولاد) اور جو تم تکبّر کیا کرتے تھے (آج) یہ سب کچھ تمہارے کچھ کام نہ آیا۔

(۴۹) کیا یہ (وہ پسماندہ افراد جو اعراف میں ہوں گے)، وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسم کھایا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت ہرگز ان کے شامل حال نہ ہوگی (لیکن ان کے ایمان اور ان کے بعض اعمال خیر کی وجہ سے خدا انہیں اپنی رحمت کے دامن میں پناہ دے گا، اب ان سے کہا جائے گا) بہشت کے اندر داخل ہو جاؤ، نہ تو تم کو کوئی خوف ہوگا، اور نہ تم غمگین ہوگے۔

تفسیر

اعراف، جنت کی طرف ایک اہم گزرگاہ

پچھلی آیات میں دوزخیوں اور جنتیوں کی مختصر سرگزشت بیان کرنے کے بعد ان آیات میں "اعراف" کا

ذکر فرمایا گیا ہے۔ "اعراف" جنّت اور دوزخ کے درمیان کا وہ علاقہ ہے جو دونوں مقاموں کے درمیان حدِ فاصل کا کام کرتا ہے۔ اس مقام کی خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں۔

سب سے پہلے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان جو پردہ ہوگا اس کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا (وبینھما حجاب)۔

بعد والی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حجاب - "اعراف" ہی ہے جو ایک بلند جگہ ہوگی ان دونوں گروہوں کے درمیان، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں گے۔ لیکن یہ جگہ ایک دوسرے کی آواز سننے سے مانع نہ ہوگی جیسا کہ گذشتہ آیات میں گذرا ہے، کیونکہ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ ہمسایہ کے لوگ ایک دوسرے سے پس دیوار بات کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے ہیں۔ جبکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ البتہ وہ افراد جو اعراف کے اوپر ہیں یعنی اس بلند مانع کے اوپر والے حصّہ پر واقع ہیں، وہ دونوں گروہوں کو دیکھ سکتے ہیں (اچھی طرح سے غور کریں)۔

اگرچہ بعض آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہلِ جنت کو اتنا موقع ملے گا کہ وہ گاہ بگاہ اپنے مقام سے اپنا سر باہر نکال کر دوزخیوں کو دیکھیں گے (جیسا کہ سورۂ صافات کی آیت ۵۵ میں ہے) لیکن اس طرح کا استثناء دوزخ و جنت کی اصلی وضعیت کے منافی نہیں ہے۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس میں جنت اور دوزخ کی اصلی وضعیت کو بیان کیا گیا ہے اگرچہ یہ قانون استثناء پذیر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حالات میں بعض بہشتی افراد دوزخیوں کو دیکھ سکیں۔

"اعراف" کی کیفیت بیان کرنے سے پہلے جو بات تاکیدی طور پر یہاں بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ روزِ قیامت اور جہانِ آخرت کے متعلق جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جس طرح کی تعبیریں استعمال کی گئی ہیں ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ حقائق اُخروی کا پورے طور پر اور تمام خصوصیات کے ساتھ نقشہ کھینچ سکیں، اس لیے بعض اوقات ان الفاظ میں صرف تشبیہ اور مثال کا رنگ ہوتا ہے اور کبھی اس کا صرف ایک سایہ اور خاکہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کیونکہ آخرت کے جہان کی زندگی بہت بلند ہے اور وہ اس دنیا کی نسبت بہت وسیع ہے۔ جیسے اس دنیا کی زندگی رحمِ مادر اور عالمِ جنین کی نسبت سے بہت زیادہ وسیع ہے، لہٰذا جو الفاظ و معانی اس دُنیا کے لیے وضع کیے گئے ہیں اگر ان سے جہانِ آخرت کے حقائق کی ترجمانی نہ ہو تو یہ کوئی جائے تعجب نہ ہوگی۔

بعد ازاں قرآن بیان کرتا ہے کہ: اعراف پر کچھ مرد کھڑے ہوں گے جو دوزخ والوں اور جنت والوں میں سے ہر ایک کو ان کے ٹھکانوں میں دیکھ رہے ہوں گے اور ان کی علامتوں سے انہیں پہچانیں گے (و علی

الاعراف رجال یعرفون کلا بسیماھم)۔

۔ اعراف ۔ لغت میں جمع ہے "عرف" (بروزن گفت) کی، جس کے معنی اونچی جگہ کے ہیں۔ اسی وجہ سے گھوڑے کی گردن کے بالوں کو اور مرغے کی گردن کے پروں کو بھی ۔عرف الفرس۔ یا ۔ عرف الدیک۔ کہتے ہیں کیونکہ یہ بال و پر ان کے جسم کی اونچی جگہ پر ہوتے ہیں (سرزمین اعراف کی خصوصیات کے بارے میں اس آیت کی تفسیر کے بعد روشنی ڈالی جائے گی)۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ ۔ جو مرد اعراف پر کھڑے ہوں گے وہ اہل بہشت کو ندا کریں گے اور کہیں گے کہ تم پر سلام ہو لیکن وہ خود جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے، اگرچہ ان کا دل بہت چاہتا ہوگا (ونادوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون)۔

لیکن جس وقت وہ دوسری طرف نظر ڈالیں گے اور دوزخیوں کو دوزخ کے اندر دیکھیں گے تو خدا کی بارگاہ میں التماس کریں گے کہ پروردگارا! ہم کو ستمگاروں کی جماعت میں قرار نہ دینا (واذا صرفت ابصارھم تلقآء اصحاب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین)۔ [1]

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ دوزخیوں کے دیکھنے کے متعلق مذکورہ بالا آیت میں " اذا صرفت ابصارھم" کا جملہ آیا ہے، یعنی جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پلٹائی جائیں گی۔ یہ فی الحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعراف والوں کو دوزخیوں کے دیکھنے سے نفرت ہوگی اور وہ انہیں ایک طرح کی مجبوری کی بناء پر دیکھیں گے۔

اس کے بعد کی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: اصحاب اعراف بعض دوزخیوں کو ان کے چہرے مہرے سے پہچان کر انہیں پکاریں گے اور انہیں اپنی ملامت اور سرزنش کا نشانہ بنائیں گے کہ آخر تم نے دیکھا کہ دنیا میں تمہارے مال جمع کرنے، افرادی قوت جمع کرنے اور تکبر کے باعث قبول حق سے گریز کرنے کا کیا نتیجہ نکلا۔ وہ سب مال کہاں گیا اور وہ لوگ کیا ہوئے جو تمہارے چاروں طرف اکٹھے تھے اور جو تکبّر اور خودپرستی تم نے اختیار کی تھی اس سے تمہیں سوائے جہنم کے کیا حاصل ہوا (ونادیٰ اصحاب الاعراف رجالاً یعرفونھم بسیماھم قالوا مآ اغنیٰ عنکم جمعکم وماکنتم تستکبرون)۔

دوبارہ اسی ملامت و سرزنش کے لہجے میں جبکہ وہ ان ضعیف الحال مومنین کی طرف اشارہ کرتے

[1] بعض مفسّرین اور اہل ادب کے نزدیک ۔ تلقاء ۔ در اصل مصدر ہے اور مقابلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن بعد میں طرف مکان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، یعنی مقابلہ کی جگہ اور سامنے کی سمت۔

ہوں گے جو اعراف پر ہوں گے، یہ کہیں گے: آیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسم کھاتے تھے کہ خدا ان پر کبھی رحمت نہ کرے گا (اھٰؤلاء الذین اقسمتم لاینالھم اللہ برحمۃ)۔

آخرکار اللہ کی رحمت ان لوگوں کے بھی شامل حال ہوگی اور ان سے خطاب ہوگا کہ ـ جنت میں چلے جاؤ نہ تمہارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہاں تمہیں کوئی غم و اندوہ ہوگا" (ادخلوا الجنۃ لاخوف علیکم ولآ انتم تحزنون)۔

جو کچھ ہم نے کہا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ضعیف الحال مؤمنین سے مراد وہ افراد ہیں جو ایمان رکھتے تھے اور نیک اعمال بھی بجالاتے تھے، لیکن بعض گناہوں اور بد اعمالیوں کی وجہ سے دشمنوں کی جانب سے ہمیشہ ان کی تحقیر و توہین ہوا کرتی تھی اور وہ ان کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ (بھلا جنت میں کیا جائیں گے اور) رحمتِ الٰہی کے سایہ میں کیسے آئیں گے! لیکن آخرکار اپنی روح ایمانی اور نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہو جائے گی اور ان کا انجام بخیر ہوگا۔

اصحابِ اعراف کون لوگ ہیں ؟

جیسا کہ ہم نے سابقاً کہا کہ ـ اعراف ـ نمایاں اور اٹھی ہوئی زمین کو کہتے ہیں، اگر ان قرائن پر نظر کی جائے جو آیہ مذکورہ بالا میں پائے جاتے ہیں، نیز روایات کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کے دو مراکز (جنت و دوزخ) کے درمیان ایک اونچا مقام ہوگا جو دونوں مقاموں کے درمیان مانع ، فاصل اور پردے کا کام دے گا۔ اس کی وجہ سے جنت و دوزخ کے درمیان فاصلہ ہوگا، اس کا نام "اعراف" ہے جس پر سے یہ لوگ دونوں طرف کے افراد کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے نورانی یا سیاہ چہروں کی وجہ سے انہیں پہچان لیں گے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ ـ اصحابِ اعراف ـ کون لوگ ہیں اور اس مقام پر کن افراد کو جگہ ملے گی ؟۔

اوپر کی چار آیتوں کو اگر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان افراد کے لیے دو طرح کی مختلف و متضاد صفتیں ذکر کی گئی ہیں :

پہلی اور دوسری آیت میں اعراف والوں کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ انہیں آرزو ہے کہ جنت میں جائیں لیکن کچھ موانع ایسے درپیش ہیں جن کی وجہ سے وہ جنت میں نہیں جا سکتے جب وہ بہشت والوں کو دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی ان کے ساتھ ہوتے لیکن وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے اور جب ان کی نظر دوزخیوں پر پڑے گی تو ان کے دردناک انجام کو دیکھ کر وحشت زدہ ہوں گے اور خدا سے پناہ مانگیں گے۔

لیکن تیسری اور چوتھی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ با اثر اور قدرت مند افراد ہیں جو دوزخ والوں کی سرزنش کریں گے اور جو بندے مقام اعراف میں رہ گئے ہیں ان کی مدد کریں گے تاکہ وہ اس سے گزر کر منزل سعادت تک پہنچ جائیں۔

اعراف اور اصحاب اعراف کے متعلق جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی دو متضاد گروہوں کی مظہر ہیں اور بہت سی روایات جو اہلبیت طاہرینؑ سے منقول ہیں ان میں ہمیں ملتا ہے:

"نحن الاعراف"

ہم اعراف ہیں۔[1]

یا یہ کہ:

"آل محمد هو الاعراف"

آل محمدؐ اعراف ہیں[2]

اسی طرح کی دوسری حدیثیں بھی ہیں۔

دیگر روایات میں ہے:

"هو اکرم الخلق علی الله تبارك وتعالیٰ"

وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محترم بندے ہیں[3]

یا یہ کہ:

"هو الشهدآء علی الناس والنبیون شهدآئهم"

وہ لوگوں پر گواہ ہیں اور پیغمبران خدا ان کے اوپر گواہ ہیں[4]

نیز اسی طرح کی دیگر روایات ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ یہ افراد انبیاء، آئمہ اور صالحین ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں دیگر روایات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ پسماندہ بندے ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی یا وہ گنہگار ہوں گے جنہوں نے اعمال نیک بھی کیے ہوں گے۔ جیسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث ہے:

هم قوم استوت حسناتهم وسیئاتهم فان ادخلهم النار فبذنوبهم وان ادخلهم الجنة فبرحمته۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنات و سیئات مساوی ہیں، اگر خدا نے انہیں دوزخ میں بھیج دیا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور اگر جنت میں داخل کر دیا تو اپنی رحمت کی وجہ سے۔[5]

---

[1] [2] [3] تفسیر برہان جلد دوم ص ١٧، ١٨، ١٩

[4] نور الثقلین جلد دوم صفحہ ٣٣، ٣٤

[5] تفسیر برہان جلد دوم صفحہ ١٧

اس طرح کی متعدد روایات اہل سُنّت کی تفاسیر میں حذیفہ عبداللہ بن عباس اور سعید بن جبیر وغیرہ سے مروی ہیں جن کا مضمون بھی یہی کچھ ہے۔[1]

انہی تفاسیر میں کچھ مدارک اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اہل اعراف صلحاء، فقہاء اور علماء ہوں گے یا اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہوں گے۔

ان آیات و روایات کا ظاہری مفہوم ابتدائی نظر میں متضاد معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہی بات باعث بنی کہ مختلف مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات و روایات میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ یہ سب ایک ہی حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ جس طرح ہم نے سابقاً بھی کہا ہے کہ تمام آیات و روایات کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعراف ایک سخت و صعب العبور راستہ ہے، جو محل سعادت جاودانی یعنی بہشت سے پہلے پڑتا ہے یہ بات فطری ہے کہ قوی لوگ یعنی صالح و پاک افراد تو بہت جلدی سے اس گذرگاہ سے گزر جائیں گے لیکن کچھ کمزور بندے، یعنی جنہوں نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے وہ اس راستہ پر تھک کر بیٹھ جائیں گے۔

نیز یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ گروہوں کے سرپرست اور پیشوایان قوم، ان قائدین لشکر کی طرح جو سخت و خطرناک راستوں پر لشکر کے آخر میں چلتے ہیں تاکہ کوئی سپاہی اگر آگے بڑھنے سے رہ جائے تو اس کی مدد کر کے اسے خطرے سے باہر نکال دیں، بالکل اسی طرح یہ پیشوا اور امام اعراف میں ٹھہر جائیں گے تاکہ مؤمنین میں جو ضعیف افراد ہیں ان کی مدد کر سکیں اور وہ بندے جن میں نجات حاصل کرنے کی صلاحیت ہے وہ ان کی مدد کے زیر سایہ نجات پا سکیں۔

بنا بریں "اعراف" میں دو طرح کے لوگ پائے جائیں گے، ایک تو وہ ضعیف گناہگار افراد جو رحمتِ الٰہی میں جگہ پائیں گے، دوسرے وہ رہبرانِ قوم اور عظیم پیشوا جو ہر جگہ اپنے ضعیف الحال تابعین کی مدد کریں گے، اس بنا پر ان آیات کے اگلے حصہ میں انہی ضعیف الحال بندوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جبکہ بعد والے حصہ میں بزرگانِ قوم، انبیاء، ائمہ و صلحاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض روایات میں بھی اس مطلب کی تائید ملتی ہے جیسے تفسیر علی بن ابراہیم میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الاعراف كثبان بين الجنة والنار، والرجال الائمة، يقفون على الاعراف مع شيعتهم وقد سبق المؤمنون الى الجنة بلا حساب...

اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان میں کچھ ٹیلے ہوں گے، اور "رجال" سے مراد آئمہ طاہرین ہیں جو اپنے شیعوں کے ساتھ اعراف پر کھڑے ہوں گے اس حالت میں کہ مؤمنین

---

[1] تفسیر طبری جلد، صفحہ ۱۳۷ و ۱۳۸ مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل کیے جا چکے ہوں گے ۔

اس کے بعد مزید یہ بھی ہے کہ : آئمہ طاہرین اور پیشوایان برحق اس موقع پر اپنے گنہگار پیروکاروں سے کہیں گے کہ اچھی طرح سے دیکھو کہ تمہارے نیک اعمال بھائی کس طرح جنت میں بغیر حساب کتاب کے جلدی سے چلے گئے ہیں اور یہ وہی موقع ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے : سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون (یعنی وہ بہشتیوں پر سلام کریں گے درانحالیکہ ابھی خود بہشت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اگرچہ اس کے آرزو مند ہوں گے) ۔

بعد ازاں ان سے کہا جائے گا کہ ذرا دشمنان حق کو بھی دیکھ لو کہ کس طرح آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جل رہے ہیں اور یہ وہی حال ہے جس کا اللہ نے اظہار فرمایا ہے :- واذا صرفت ابصارھم تلقآء اصحاب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین ...- اس کے بعد دوزخیوں سے کہیں گے کہ دیکھو یہ بندے (یعنی یہ پیروکار اور شیعہ جو گنہگار ہیں) وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ کی رحمت ہرگز نہ ہوگی (حالانکہ اب اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہو چکی ہے) اس کے بعد ان بندوں کو جو گنہگار تو ہیں لیکن اپنے ایمان اور بعض اعمال نیک کی وجہ سے اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ انہیں بخش دیا جائے، آئمہ ہدیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جائے گا کہ تم بھی بہشت کی طرف روانہ ہو جاؤ کسی قسم کے خوف اور غم کی ضرورت نہیں ہے[1]

اسی طرح کا مضمون اہل سنت کی تفسیروں میں بھی حذیفہ کی روایت سے حضرت پیغمبرؐ سے منقول ہوا ہے[2]

ہم ایک مرتبہ اور تکرار کرتے ہیں کہ حشر و نشر کی تمام جزئیات و تفاصیل جو احادیث و آیات میں بیان ہوئی ہیں وہ بعینہٖ اس طرح سے ہیں جیسے ہم دُور سے ایک سایہ دیکھیں اور پھر اس کی کیفیت بیان کریں حالانکہ وہ سایہ ہماری زندگی سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور ہم اپنے نارسا اور کوتاہ الفاظ کے ذریعے اس کی حکایت کرتے ہیں ۔

ایک قابل توجہ نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ جہان آخرت کی زندگی ان نمونوں اور معیاروں کی بنیاد ہے جو اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں، اعراف کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ اس دنیا میں لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہیں :

ایک تو وہ سچے مومن بندے جو اپنے ایمان و عمل کی وجہ سے اَبدی سکون کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ۔

دوسرے وہ معاند اور ضدی دشمنان حق جو کسی طرح سے راہ حق پر آنا گوارا نہیں کرتے ۔

تیسرا وہ گروہ ہے جو ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک سخت گذرگاہ پر ہے ۔ پیشوایان حق کی زیادہ تر

---

[1] تفسیر برہان جلد دوم ص ۱۹ ، ۲۰ ۔
[2] تفسیر طبری جلد ۸ صفحہ ۱۴۲ ، ۱۴۳ ۔

توجہ انہی پر ہے وہ ان کے پہلو میں رہیں گے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اعراف کے مرحلہ سے انہیں نجات دے دیں گے اور مومنین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیں گے ۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قیامت کے روز انبیاء کرام اور ائمہ طاہرینؑ کا ان بندوں کے معاملات میں دخل دینا اور انہیں اس طرح سے جنّت میں لے جانا خداوند کریم کی قدرتِ مطلقہ اور اس کی حاکمیت کے منافی نہیں ہے ، کیونکہ یہ حضرات جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ خدا ہی کے اذن اور فرمان سے کرتے ہیں ۔

(۵۰) وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ‌ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۙ‏

(۵۱) الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا‌ ۚ فَالۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ يَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ‏ ○

ترجمہ

(۵۰) دوزخ والے جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ تھوڑا پانی ، یا خدا نے تمہیں جو روزی بخشی ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دو ۔ تو وہ (جنّت والے اس کے جواب میں) کہیں گے کہ خدا نے اس کو کافروں پر حرام قرار دیا ہے ۔

(۵۱) (ایسے کافر) جو خدا کے دین اور قانون کو کھیل تماشا سمجھتے تھے اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکا دیا تھا ۔ پس آج کے روز ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور ہماری نشانیوں کا انکار کرتے تھے ۔

تفسیر

جنت کی نعمتیں دوزخیوں پر حرام ہیں

جب جنتی اور دوزخی لوگ سب کے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے تو ان کے درمیان گفتگو شروع ہوگی جس کا مقصد یہ ہوگا کہ اہل دوزخ کو ان کے اعمال کی وجہ سے روحانی اور معنوی سزا دی جائے۔

پہلے دوزخی لوگ جو بہت بُری حالت میں ہوں گے جنت والوں سے پکار کر جنت کے پانی اور کھانے کی تمنا کریں گے۔ تاکہ ان کی جلا دینے والی تشنگی اور دیگر آلام میں کچھ کمی واقع ہو (ونادیٰ اصحاب النار اصحاب الجنة ان افیضوا علینا من المآء او ممارزقکم اللہ)۔

لیکن فوراً اہل بہشت ان کے اس سوال کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ: یہ چیزیں اللہ نے کافروں پر حرام کر دی ہیں (قالوآ ان اللہ حرمھما علی الکفرین)۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآن نے یہاں پر لفظ "نادیٰ" استعمال کیا ہے جو دُور سے پکارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے پتہ چلتا ہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان کافی فاصلہ ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہ فاصلہ لاکھوں میل دُوری کا ہو لیکن بقدرتِ الٰہی دونوں گروہ ایک دوسرے کی بات سن سکیں گے بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے کو اتنے فاصلے کے باوجود دیکھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ یہ بات گذشتہ زمانے میں بعض لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اب تو وہ زمانہ آگیا ہے جس میں دُور کی صدا سننا یا دوسرے کسی کو دیکھنا ممکن ہوگیا ہے لہٰذا اس زمانہ میں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۔ اہل دوزخ کی سب سے پہلی تمنا یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے پانی طلب کیا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو شخص بھی آگ میں جلتا ہے اسے سب سے پہلے پانی کی طلب ہوتی ہے تاکہ اپنی سوزش کو تسکین پہنچا سکے۔

۳۔ مما رزقکم اللہ (جو کچھ اللہ نے تم کو روزی دی ہے اس میں سے)، یہ جملہ ایک سربستہ جملہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخیوں کو یہ تک پتہ نہ چلے گا کہ اہلِ جنت کو کیا کیا نعمتیں ملی ہیں اور ان کی ماہیت کیا ہے۔ یہ مطلب بعض احادیث کے بالکل مطابق ہے جن میں وارد ہوا ہے کہ جنت میں ایسی نعمتیں ہوں گی جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا۔ بلکہ کسی کے ذہن میں بھی ایسی نعمتیں نہ آئی ہوں گی۔

ضمنی طور سے ایک مطلب اور بھی لفظ "او" میں مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت کی دیگر نعمتیں خاص طور پر جنت کے میوے پانی کا بدل ہو سکتے ہیں اور ان سے انسان کی بھڑکتی ہوئی پیاس بھی بجھ سکتی ہے۔

۴۔ ان اللہ حرمھما علی الکافرین (خدا نے انہیں کافروں کے لیے حرام قرار دیا ہے)، یہ جملہ اس امر

کی طرف اشارہ ہے کہ اہل بہشت کو یہ چیزیں دینے میں تو کوئی عذر نہ ہوگا کیونکہ ان کے دینے سے نہ تو کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی ان کے دلوں میں کسی کی طرف سے کینہ ہوگا یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی وہ کوئی بغض و حسد نہ رکھتے ہوں گے لیکن دوزخیوں کی وضعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ان نعماتِ الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے یہ تحریم فی الحقیقت ایک طرح کی "تحریم تکوینی" ہے جیسے بہت سے بیمار لذیذ اور رنگا رنگ کھانوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیت ان کی محرومی کا سبب بیان کر رہی ہے اور اہلِ دوزخ کے صفات کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اس امر کی وضاحت کر رہی ہے کہ ان لوگوں نے یہ اپنا انجام بدخود اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین و مذہب کو کھیل تماشا بنا رکھا تھا (الذین اتخذوا دینهم لهوًا و لعبًا)۔

اور دُنیا کی زندگی نے انہیں دھوکا دیا تھا (وغرتهم الحیاة الدنیا)۔

یہ امور اس بات کا سبب بنے کہ وہ اپنی خواہشات کی دلدل میں اتر جائیں اور تمام چیزوں کو یہاں تک کہ روزِ معاد کو بھی بھلا بیٹھیں اور انبیاء کے فرامین اور اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیں لہٰذا اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کو بھلا دیا تھا اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا تھا (فالیوم ننساهم کما نسوا لقآء یومهم هٰذا وما کانوا بأیاتنا یجحدون)۔

یہ بات بدیہی ہے کہ یہاں پر "نسیان اور فراموشی" کی نسبت جو اللہ کی طرف دی گئی ہے اس سے اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا جیسا معاملہ کوئی فراموش کر دینے والا کرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نہ بھولنے والا شخص اپنے بھول جانے والے دوست سے یہ کہتا ہے کہ اب جبکہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے تو میں بھی تمہیں بھلا دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کروں گا جو بھول جانے والا کرتا ہے۔

ضمنی طور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گمراہی اور بھٹکنے کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی قسمت بنانے والے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دے اور انہیں کھیل تماشہ سمجھ کر ٹال دے۔ یہ حرکت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ آخر کار اس سے کفرِ مطلق سرزد ہوتا ہے اور وہ تمام حقائق کا انکار کر بیٹھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

(۵۲) وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(۵۳) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

ع ۷

ترجمہ

(۵۲) ہم ان کے لیے ایک ایسی کتاب لائے جس کی ہم نے علم کے ساتھ شرح کی (ایک ایسی کتاب) جو ان لوگوں کے لیے سرمایۂ ہدایت و رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

(۵۳) کیا انہیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ آخر میں اللہ کی تہدیدوں کو دیکھیں گے[1] جب یہ امر ظاہر ہو گا تو اس وقت (عبرت حاصل کرنے کا وقت گزر چکا ہو گا) وہ لوگ جو اس سے قبل اسے بھول چکے ہوں گے کہیں گے کہ ہمارے رب کے فرستادہ رسول برحق آئے تھے، آیا آج کے روز ہمارے لیے کچھ ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں؟ یا (اس بات کا امکان ہے کہ) ہم دوبارہ پلٹا دیئے جائیں؟ اور وہ اعمال بجا

---

[1] یہاں پر تاویل کے معنی مترجم نے "تہدید" سے کیے ہیں، حالانکہ "تاویل" کے معنی "معنائے عام" کے ہیں یہ لفظ "تنزیل" کے مقابلہ میں ہے جس کے معنی "معنائے خاص" کے ہیں، اسی سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ اے علی: تم قرآن کی تاویل پر جنگ کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ ایک روز ایسا آئے گا جب قرآن کا مفہوم عام ہی ہر ہو گا تفسیر قمی میں ہے کہ ایسا حضرت حجتؑ کے ظہور کے وقت اور قیامت کے روز ہو گا۔ (مترجم)

لائیں جو ہم بجا نہ لائے تھے (لیکن) انہوں نے اپنے وجود کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے اور جو جھوٹے معبود انہوں نے بنائے تھے وہ سب گم ہوگئے ہیں (اب نہ توان کیلئے پلٹنے کی کوئی راہ ہے' اور نہ کوئی ان کی شفاعت کرنے والا موجود ہے) ۔

تفسیر

پہلی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفار کی محرومیت اور ان کا انجام بد، خود انہی کی کوتاہیوں اور ان کی غلطیوں کا نتیجہ ہے ۔ ورنہ خداوند کریم کی جانب سے ان کی ہدایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی تھی ۔ اسی بنا پر خدا فرماتا ہے : ہم نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ان کے لیے ایک ایسی کتاب بھیجی جس کے تمام اسرار و رموز کی پوری آگاہی کے ساتھ تشریح کر دی (ولقد جئناھم بکتاب فصّلناہ علیٰ علم) ۔

ایسی کتاب جو سرمایۂ ہدایت اور موجب رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے" اگرچہ ہٹ دھرم اور ضدی انسان اس سے بے بہرہ رہ گئے (ھدی ورحمۃ لقوم یومنون) ۔

اس کے بعد کی آیت میں تباہ کاروں اور بے راہ رووں کے ہدایت الٰہی کے بارے میں غلط طرزِ تفکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : گویا ان لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ خدا کے دعووں اور تہدیدوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں اپنی آنکھ سے دیکھ لیں) تاکہ اس وقت ایمان قبول کریں (ھل ینظرون الا تأویلہٗ) ۔

لیکن یہ کیسا غلط انتظار اور کیسی بے جا توقع ہے کیونکہ جب وہ وقت آپہنچے گا کہ وہ اپنی آنکھوں سے ان الٰہی وعدوں کے نتیجوں کو دیکھیں گے تو فرصت کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوگا اور پلٹنے کا راستہ بند ہو چکا ہوگا ۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے کتابِ خدا اور آسمانی قوانین کو دنیا میں پس پشت ڈال دیا تھا اعتراف کریں گے کہ خدا کے تمام فرستادہ بندے (رسول) حق کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور ان کی تمام باتیں بھی برحق تھیں (یوم یأتی تأویلہٗ یقول الذین نسوہ من قبل قد جآءت رسل ربنا بالحق) ۔

لیکن اس وقت وہ خوف اور اضطراب کے دریا میں ڈوب جائیں گے اور اپنی نجات کی فکر میں پڑ جائیں گے اور کہیں گے : آیا کچھ شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں (فھل لنا من شفعآء فیشفعوا لنا) ۔

یا اگر ہماری قسمت میں شفیع (بخشوانے والے) نہیں، اور اصولی طور سے ہم قابل شفاعت نہیں ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دنیا میں دوبارہ پلٹ دیئے جائیں اور جو اعمال ہم بجا لائے ہیں ان سے مختلف دوسرے اعمال بجا لائیں اور حق و حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیں" (او نرد فنعمل غیرالذی کنا نعمل)۔

لیکن افسوس کہ یہ بیداری بہت دیر میں اور بعد از وقت ہوگی۔ نہ تو اس وقت کوئی لوٹ آنے کی راہ ہو گی اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی ہستی کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہوگا اور " وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے، ایسا گھاٹا جو ان کے وجود کو ہر طرف سے گھیرے گا (قد خسروا انفسہم)

اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ بُت اور ان کے خود ساختہ معبود اس عالم میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے اور درحقیقت "سب کے سب ان کی نظروں سے گم ہو جائیں گے" (وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

گویا آخر آیت کے دو جملے ان کی درخواست کا جواب ہے یعنی اگر وہ شفاعت چاہیئے ہیں تو انہی بتوں کے دامن کو تھامیں جن کے آگے دنیا میں سجدہ کرتے تھے۔

یہ اس صورت میں دُنیا میں پلٹ سکتے تھے کہ ان کے پاس سرمایہ وجود ہو لیکن اسے تو انہوں نے دنیا میں تلف کر دیا۔

اس آیت سے پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد و خود مختار ہے، ورنہ دوبارہ دنیا میں جانے کی تمنا نہ کرتا تاکہ اپنے اعمال بد کی تلافی اور تدارک کرے۔

دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ جہان آخرت جائے عمل اور فضیلت حاصل کرنے کا مقام نہیں ہے۔

(۵۴) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ

(۵۴) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز (چھ دوروں) میں پیدا کیا، اس کے بعد وہ جہان کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا، وہ رات (کے تاریک

پردہ) سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے اور رات دن کے پیچھے پیچھے رواں دواں ہے اور اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا کیا اس حال میں کہ یہ سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ (جہان کا) پیدا کرنا اور اس کا انتظام کرنا اللہ کے لیے اور اسی کے حکم سے ہے۔ برکت والا (اور لازوال) ہے وہ خدا جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

تفسیر

ہم نے پچھلی آیتوں میں پڑھا کہ قیامت کے روز مشرکوں کو پتہ چلے گا کہ انہوں نے اپنے معبود کے انتخاب میں سخت دھوکا کھایا تھا۔ اب اس آیت میں حقیقی معبود اور اس کی خاص صفات سے متعلق بحث ہے تاکہ وہ لوگ جو حق کے متلاشی ہیں قبل اس کے کہ قیامت کا دن آپہنچے اسی دنیا میں اچھی طرح سے پہچان لیں۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہ معبود ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ "معبود" سوائے "پیدا کرنے والے" کے اور کوئی نہیں ہوسکتا (ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام)۔

کیا جہان چھ روز میں پیدا ہوا ہے؟

یہ بحث کہ جہان کو اللہ نے چھ روز میں خلق کیا، قرآن کریم میں سات جگہ پر آئی ہے[1] لیکن ان میں سے تین مقامات پر "آسمانوں اور زمین" کے علاوہ "مابینہما" بھی ہے (جس کے معنی یہ ہیں "اور جو کچھ بھی ان دونوں کے درمیان ہے") یہ اضافہ فی الحقیقت مزید توضیح کے لیے ہے ورنہ فی الحقیقت زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اگر اوپر کی جہت میں ہے تو لفظ "آسمان" میں داخل ہے، اور اگر نیچے کی جہت میں ہے تو "زمین" کے مفہوم میں داخل ہے۔

یہاں پر سب سے پہلے جو سوال ذہن انسانی میں آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی خلقت سے پہلے دن اور رات کا تو کوئی وجود نہ تھا لہٰذا چھ روز کیسے بنے؟ کیونکہ دن رات تو اپنے محور پر زمین کی گردش کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں تمام کائنات میں چھ روز میں یعنی ایک ہفتہ سے بھی کم عرصے میں پیدا ہونا بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آج کا علم یہ کہتا ہے کہ: لاکھوں سال گزرے جب جا کے زمین و آسمان نے یہ موجودہ

---

[1] ایک تو یہی آیت، اس کے علاوہ سورۂ یونس ۳، ہود ۷، فرقان ۵۹، سجدہ ۴، ق ۳۸ اور حدید ۴ میں اس بات کا تذکرہ ہے۔

شکل اختیار کی ۔

ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ظاہر ہوگا جب لفظ "یوم" اور اس کے ہم معنی الفاظ جو دوسری زبانوں میں رائج ہیں، پر توجہ کی جائے ۔ کیونکہ بسا اوقات "یوم" ایک دوران اور زمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چاہے یہ دوران ایک سال کا ہو، ایک ملین سال کا، یا کئی کروڑ سال کا ۔ اس امر کے کئی شواہد ہیں کہ "یوم" دوران کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہوں :

۱۔ قرآن میں لفظ "یوم" بارہا استعمال ہوا ہے ۔ اس میں سے بہت سے مقامات پر عام شب و روز کے معنی میں نہیں آیا مثلاً عالم محشر کو "یوم القیامۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ روزِ قیامت ایک طولانی مدت ہوگی جو بنصِ قرآنی پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی (سورۂ معارج آیت ۴) ۔

۲۔ کتبِ لغت میں بھی اس کی تائید ملتی ہے کہ "یوم" کبھی تو آفتاب کے طلوع اور غروب کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں اور کبھی زمانے کے ایک حصّے کو کہتے ہیں ۔ اس کی مقدار جتنی بھی ہو[1]

۳۔ روایات اور ہادیانِ دین کے ارشادات میں بھی لفظ "یوم" دوران کے معنی میں بہت آیا ہے، جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

"الدھر یومان یوم لک ویوم علیک"

تیری دنیا کے دو روز ہیں ایک روز وہ جو تیرے لیے فائدہ بخش ہے، دوسرا روز وہ جو تیرے لیے زیان بخش ہے ۔

تفسیر برہان میں بھی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر علی بن ابراہیم قمی سے نقل کیا گیا ہے کہ امامؑ نے فرمایا :

"فی ستۃ ایام یعنی فی ستۃ اوقات"

چھ روز یعنی چھ دوران ۔

۴۔ روزمرہ کی گفتگو اور شعراء کے اشعار میں بھی لفظ "یوم" دوران کے معنی میں بولا جاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ایک روز وہ تھا جب کرۂ زمین آگ کا ایک گولہ تھا پھر ایک روز وہ آیا جب وہ ٹھنڈا ہوگیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے، جبکہ زمین کی شعلہ ور حالت کئی کروڑ سالوں تک باقی رہی ۔

یا یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ ایک روز بنی امیہ نے خلافتِ اسلام کو غصب کیا دوسرے روز بنی عباس نے بھی یہی عمل کیا، حالانکہ ان دونوں کا دورانِ حکومت بیسیوں یا سینکڑوں سال کا تھا ۔

یہاں پر کلیم کاشانی کے دو پُرلطف اور پُرمعنی شعر بھی ملاحظہ ہوں :

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش   آن ہم کلیم با تو بگویم چسان گذشت

---

[1] راغب نے اپنی کتاب مفردات میں کہا ہے کہ لفظ "یوم" کا اطلاق کبھی تو طلوعِ آفتاب سے غروب کی درمیانی مدت پر ہوتا ہے اور کبھی زمانہ کی ایک مدت پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، وہ مدت جتنی بھی ہو ۔

یک دو زصرف بستن دل شد باین و آن روز دگر بہ کندن دل زین و آن گذشت

یعنی زندگی کی بدنامی صرف دو روز کے لیے تھی، وہ بھی اے کلیم تجھ سے کیا بیان ہو کہ کس طرح گذرے ایک دن تو دنیا کی لذتوں کے ساتھ دل باندھنے میں گزر گیا اور دوسرا دن دنیا کی لذتوں سے دل توڑنے میں کٹ گیا۔

اس تمام بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ خداوندِ عالم نے زمین و آسمان کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان ادوار میں سے ہر دَور کئی ملین سال کا ہو اور اس طرح سے ہونا آج کے علم سے کسی طرح نہیں ٹکراتا۔

یہ چھ ادوار ہوسکتا ہے کہ اس طرح پر ہوں:

۱۔ وہ روز جس میں سارا جہان گیس کے ایک مجموعہ کی شکل میں تھا، جو سُرعت کے ساتھ گھومنے کے سبب سرگردان ہوگیا اور اس سے یہ الگ الگ ٹکڑے وجود میں آئے۔

۲۔ یہ ٹکڑے تدریجی طور پر پگھلے ہوئے اور نورانی یا ٹھنڈے اور قابلِ سکونت کُرّوں کی شکل میں بن گئے۔

۳۔ پھر ایک دن نظامِ شمسی بنا۔ اور زمین سورج سے الگ ہوگئی۔

۴۔ پھر ایک دن زمین ٹھنڈی ہوکر قابلِ سکونت بنی اور اس لائق ہوئی کہ اس میں جاندار رہ سکیں۔

۵۔ پھر ایک دن سبزہ اور درخت اس میں نمودار ہوئے۔

۶۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ حیوان اور حضرت انسان بھی اس میں نمودار ہوئے۔

یہاں پر جو کچھ اس جہان کے چھ ادوار کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ سورۂ فصلت کی آیات ۸ تا ۱۱ سے قابلِ تطبیق ہے جس کی مفصل شرح انشاء اللہ انہی آیات کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

اللہ نے دُنیا کو ایک لحظہ میں کیوں پیدا نہ کیا؟

یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ خداوند کریم اپنی بے انتہا قدرت کی وجہ سے سارے آسمانوں اور زمینوں کو ایک لحظہ میں پیدا کرسکتا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس نے اس جہان کو ایک طولانی مدت میں پیدا کیا؟۔

اس سوال کا جواب صرف ایک نکتہ کے سمجھنے سے مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ خلقتِ جہاں اگر ایک لحظہ میں ہو جاتی تو پروردگار کی عظمت، قدرت اور علم کی کمتر حکایت کرتی لیکن اگر یہ خلقت مختلف مرحلوں میں، مختلف شکلوں میں بچے تُلے حساب شدہ پروگرام کے ماتحت عمل میں آئی ہے تو اس طرح پر خالقِ اکبر کے وجود کی واضح تر دلیل بنتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر انسان کا نطفہ ایک سیکنڈ میں ایک مکمل بچہ بن جاتا، تو وہ اس قدر اس خلقت کی عظمت کا مظہر نہ بنتا لیکن جس وقت اس کی خلقت نو مہینوں میں ہوئی ہر دن اس نے ایک ایک مرحلہ طے کیا، اور ہر مہینہ ایک نئی شکل اختیار کی تو اس طرح سے ان مراحل کی تعداد کے مطابق پیدا دنے

والے کی عظمت و قدرت کی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو نشانیاں ملتی چلی گئیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالٰے نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد ان کی رہبری اپنے دستِ قدرت میں سنبھالی، یعنی یہ کہ نہ صرف سارے جہانوں کی خلقت اس نے کی بلکہ ان کا نظام اور ان کی رہبری بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (ثمواستوٰی علی العرش)۔
یہ فی الحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جو اللہ کو صرف خلقتِ کائنات کی علّت جانتے ہیں اور اس کی بقاء کی علت نہیں جانتے۔

عرش کیا ہے ؟

لغت میں "عرش" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں چھت لگی ہوئی ہو اور بعض اوقات خود چھت کو بھی عرش کہتے ہیں. جیسا کہ قرآن میں آیا ہے :

"اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّعَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا"

یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی کے پاس سے گزرا جبکہ وہ آبادی برباد پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ (بقرہ۔ ۲۵۹)۔

کبھی یہ لفظ اونچے تخت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بادشاہوں کے تخت، جس طرح ہم حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں پڑھتے ہیں :

"اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا"

تم میں سے کون اس (بلقیس) کا تخت یہاں لا سکتا ہے (النمل۔ ۳۸)۔

نیز ان پاڑوں کو بھی "عرش" کہتے ہیں جو درختوں کی بیلوں کو اوپر چڑھانے کے لیے باندھی جاتی ہیں، قرآن کریم میں "عرش" کا یہ استعمال بھی موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :

"وھو الذی انشأ جنّات معروشات و غیر معروشات"

وہ خدا وہ ہے جس نے پاڑوں پر چڑھنے والے اور نہ چڑھنے والے درختوں کے باغ پیدا کیے (انعام۔ ۱۴۱)۔

لیکن جس وقت یہ لفظ خداوند کریم کی نسبت بولا جائے اور یہ کہا جائے کہ "عرش خدا" تو اس سے اس جہان ہستی کا سارا مجموعہ مراد ہے جو فی الحقیقت تختِ حکومتِ الٰہی ہے۔

اگر یہ جملہ "استوٰی علی العرش" بولا جائے تو یہ اس امر کے لیے کنایہ ہے کہ "ایک حکمران اور زماندار اپنی سلطنت کے امور پر مسلط و غالب ہوگیا" اس کے برعکس یہ جملہ "ثل عرشہ" (اس کا تخت برباد ہوگیا)

اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی بادشاہ کی حکومت الٹ جائے ، فارسی[1] میں بھی یہ تعبیر کنائی بہت استعمال ہوتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں ملک میں لوگوں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے وہاں کے حکمران کو تخت سے نیچے اتار لیا، حالانکہ ممکن ہے کہ وہاں کسی تخت کا سرے سے وجود نہ ہو ، یا یہ محاورہ کہ کچھ لوگ فلاں شخص کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اس کو تخت پر بٹھا دیا ، یہ سب محاورے قدرت دحکومت پانے یا اس کے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔

بنا بریں زیر بحث آیت میں " استوٰی علی العرش " کا جملہ اس بات کا کنایہ ہے کہ پروردگار عالم آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد ان پر ہر حیثیت سے مسلط و غالب ہوا اور اس نے ان کا نظم ونسق اپنے دست قدرت میں سنبھالا ۔

یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ : جن لوگوں نے مذکورہ بالا آیت کو " تجسم خدا " کی دلیل بنایا ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں کی جو ہم نے یہاں پر بیان کیے ہیں ۔

" عرش " کے ایک معنی اور بھی ہیں ۔ یہ معنی اس جگہ لیے جاتے ہیں جہاں یہ لفظ " کرسی " کے مقابلے میں بولا جائے ۔ اس طرح کے مواقع پر لفظ " کرسی " (جس کے معنی غالباً اس چھوٹے تخت کے ہیں جس کے چھوٹے پائے ہوتے ہیں) سے ممکن ہے " مادی دنیا " مراد ہو اور " عرش " سے مراد وہ جہان مراد ہو جو " ماورائے مادّہ " ہے جیسے عالم ارواح اور ملائکہ ، جیسا کہ آیت " وسع کرسیہ السمٰوات والارض " کی تفسیر میں سورۂ بقرہ میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں ۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ (وہ خدا) وہ ہے جو رات کو مثل ایک پردہ اور پوشش کے دن کے اوپر ڈال دیتا ہے اور دن کی روشنی کو رات کے تاریک پردوں سے ڈھانپ دیتا ہے (یغشی الیل النھار) ۔

یہاں پر قابل توجہ یہ بات ہے کہ تعبیر مذکورہ بالا صرف رات کے لیے استعمال ہوئی ہے ۔ یہ نہیں فرمایا کہ " دن کے ذریعے رات کو ڈھانپ لیتا ہے " کیونکہ پوشش صرف تاریکی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ روشنی کے ساتھ ۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے : " رات تیزی کے ساتھ دن کے پیچھے پیچھے رواں دواں ہے جیسے ایک قرضخواہ اپنے قرضدار کے پیچھے بھاگتا ہے (یطلبہ حثیثا) ۔

کرۂ زمین میں دن اور رات کی جو کیفیت ہے یہ تعبیر اس کے عین مناسب ہے ۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر جا کر یہ دیکھے کہ کس طرح زمین اپنے محور پر بڑی تیزی سے محو گردش ہے (تقریباً ۳۰ کلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے) اور آفتاب کی جہت مخالف میں ایک مخروطی الشکل سایہ ایک پُراسرار دیوپیکر ہیولے

---

[1] اُردو میں بھی اسی طرح کے جملے استعمال ہوتے ہیں ۔ (مترجم)

کی طرح روشنی کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہے تو اسے (یطلبه حثیثا) کی تعبیر کا صحیح لطف حاصل ہوگا اور یہ سمجھ میں آئے گا کہ دن کے متعلق یہ کیوں نہ کہا کیونکہ سورج کا نور تو نصف کرۂ زمین پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی کوئی شکل نہیں بنتی۔

اس کے بعد مزید فرمایا ہے: وہ ہے جس نے سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا کیا۔ اس حال میں کہ سب اس کے فرمانبردار ہیں (والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ)۔

(شمس و قمر اور ستاروں کی تسخیر کے بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں انشاء اللہ ہم آئندہ گفتگو کریں گے)۔

جہانِ ہستی اور نظامِ شب و روز کی پیدائش اور چاند، سورج اور ستاروں کی خلقت کے ذکر کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: آگاہ ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اور جہانِ ہستی کا انتظام کرنا صرف اس کے ہاتھ میں ہے (الا له الخلق والامر)۔

"خلق" و "امر" سے کیا مراد ہے؟

"خلق" و "امر" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کے درمیان کافی بحث ہوئی ہے لیکن اس آیت میں جو قرائن ہیں نیز دیگر آیات کے قرائن پر اگر نظر کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خلق" سے مراد آفرینش اوّل ہے، اور "امر" سے مراد وہ قوانین و نظام ہے جو عالمِ ہستی پر حکومت کرتا ہے اور جس کی وجہ سے سارا نظامِ جہان چل رہا ہے۔

یہ تعبیر درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا نے اس جہان کو پیدا کرنے کے بعد اپنے حال پر چھوڑ دیا اور خود کنارے بیٹھ گیا اور اب وہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عالمِ ہستی اپنی ایجاد میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن اپنی بقا میں اسے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ آیت کہتی ہے: جس طرح کائنات اپنی آفرینش میں اس کی محتاج ہے اسی طرح تدبیر، دوامِ حیات اور اس کے چلانے میں بھی اسی کی ذات سے وابستہ ہے، اگر ایک لحظہ کے لیے لطفِ خدا اس کا ساتھ چھوڑ دے تو پورا نظامِ عالم تباہ و برباد ہو جائے۔

بعض فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ عالم "خلق" سے عالم "مادہ" اور عالم "امر" سے عالم "ارواح" مقصود ہے، کیونکہ عالمِ خلق تدریجی پہلو رکھتا ہے اور یہ جہانِ مادّہ کی خصوصیت ہے اور عالمِ امر فوری و دفعۃً پہلو رکھتا ہے اور یہ ماوراء مادّہ کی خصوصیت ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

"اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ"

جب خدا کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ تُو ہو جا! تب وہ ہو جاتی ہے (یٰسین- ۸۲)

لیکن اگر لفظ "امر" کے قرآن میں مواردِ استعمال پر نظر کی جائے یہاں تک کہ اگر جملہ "والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ" پر نظر کی جائے جو زیرِ بحث آیت میں ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "امر" کے معنی ہر طرح کے فرمانِ الٰہی کے ہیں، چاہے وہ مادّی دنیا سے متعلق ہو یا ماورائے مادّہ سے (غور کریں)۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: برکت والا ہے وہ خدا جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے (تبارک اللہ رب العالمین)۔

درحقیقت یہ جملہ ارض و سما، ماہ و خورشید اور ستاروں کی خلقت اور ان کی تدبیر کے ذکر کے بعد مقامِ مقدسِ الٰہی کی ایک طرح کی ستائش ہے، جو بندوں کو تعلیم دینے کی غرض سے کی گئی ہے۔

"تبارك" برکت کے مصدر سے ہے، اس کی بھی اصل "برك" (بروزن درک) ہے، جس کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں اور چونکہ اونٹ جب یہ چاہتا ہے کہ کسی جگہ جم کر بیٹھے، اپنا سینہ زمین سے چسپاں کر دیتا ہے، اس بنا پر اس لفظ کے معنی میں "ثابت رہنا" شامل ہو گیا، پھر اس کے بعد جو نعمت بھی پائیدار اور ثابت رہنے والی ہوئی اسے برکت کہا جانے لگا۔ بعد ازاں ہر اس موجود کو جو عمر طولانی رکھتی ہو یا اس کے آثار مستمر و مسلسل ہوں "موجود مبارک" یا "پُر برکت" کہا گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ تالاب کو بھی "برکہ" کہتے ہیں یہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ اس میں پانی دیر تک ٹھہرا رہتا ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک "پُر برکت" سرمایہ وہ ہے جو جلدی زوال پذیر نہ ہو۔ اسی طرح ایک "مبارک" موجود وہ ہے جس کے فیض کے آثار ایک طولانی مدت تک برقرار رہیں۔ لہٰذا یہ بات بدیہی ہے کہ اس مفہوم کا بہترین مصداق خداوندِ عالم کی ذات بابرکت ہے۔ وہ ایک وجودِ مبارک ازلی و ابدی ہے جو تمام برکتوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ جس کی خیر و برکت ہمیشہ جاری و ساری رہنے والی ہے۔ تبارک اللہ رب العالمین۔ (سورۂ انعام کی آیت ۹۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر آئے ہیں ملاحظہ ہو)۔

(۵۵) اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾

(۵۶) وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ

(۵۵) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور تنہائی میں پکارو اور (زیادتی سے ہاتھ اٹھا لو کیونکہ) وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۵۶) اور زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اور خدا کو خوف و امید کی حالت میں پکارو (خوف ذمہ داریوں کا، امید اس کی رحمت کی)، کیونکہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے نزدیک ہے۔

تفسیر

قبولیتِ دُعا کی شرائط

گذشتہ آیات سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ عبودیت اور بندگی کا تنہا سزاوار خدا ہے۔ اسی کے ذیل میں یہاں حکم دیتا ہے کہ "دعا و مناجات" جو روحِ عبادت ہے صرف خدا کے سامنے ہونا چاہیئے "اپنے پروردگار کو گڑگڑا کے اور تنہائی میں پکارو" (ادعوا ربکم تضرعًا و خفیة)۔

"تضرع" اصل میں مادّہ "ضرع" (بروزن فرع) بمعنی پستان سے لیا گیا ہے، اس بنا پر فعل "تضرع" کے معنی پستان سے دودھ دوہنے کے ہیں۔ چونکہ دودھ دوہتے وقت انگلیاں پستان کی مختلف جہتوں پر پڑتی رہتی ہیں، لہٰذا یہ لفظ اس کے لیے بولا جاتا ہے جو مختلف طریقوں سے کسی بڑے کے سامنے (اس کی خبر لینے کے لیے) خضوع و خشوع اور عجز و فروتنی کا اظہار کرے۔

بنا بریں اگر آیت مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا کو تضرع سے (گڑگڑا کے) پکارو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے بڑے خضوع و خشوع اور تواضع کے ساتھ پکارو، کیونکہ دعا کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ خدا کو صرف زبان سے پکارا جائے بلکہ دُعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا دل کی گہرائیوں میں اتر کر اوپر جائے، بلکہ دعا کرنیوالے کے روئیں روئیں میں دعا کا مفہوم اتر جائے اور زبان تمام اعضائے بدن کی نمائندگی میں دعا کے الفاظ کو ادا کرے۔

اس آیت میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کو "خفیہ" طور سے یعنی تنہائی میں پکارو اور اکیلے میں اس سے دعا کرو یہ اس لیے ہے کہ دعا کے وقت ریا نہ آنے پائے اور اخلاص پیدا ہوجائے، دل و دماغ خدا کے

حضور میں پوری طرح سے متوجہ ہو جائیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوہ میں تھے، سپاہیان اسلام ایک درہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے "لآ الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یاآیہا الناس اربعوا علیٰ انفسکم اما انکم لاتدعون اصم ولاغائبا انکم تدعون سمیعا قریبا انہ معکم۔

اے لوگو! کچھ آہستہ سے خدا کو پکارو (آہستگی کے ساتھ دعا کرو) تم کسی بہرے اور غیر حاضر کو تو نہیں پکار رہے ہو تم اس ہستی کو پکار رہے ہو جو بڑا سننے والا اور تم سے قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے[1]

اس آیت میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "تضرع" سے مراد ہے آشکارا طور پر دعا کرنا، اور "خفیۃ" سے تنہائی میں دعا کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے، کبھی کھل کر اور بلند دُعا کرنا ہوتی ہے اور کبھی چھپ کر اور چپکے چپکے دعا کی جاتی ہے۔ اس آیت کے ذیل میں جو روایت علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہے وہ اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔

آخر آیت میں فرماتا ہے: خدا تجاوز کرنے والوں (حد سے گزرنے والوں) کو دوست نہیں رکھتا (انہ لا یحب المعتدین)۔

یہ جملہ اپنے دامن میں ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کے تجاوز پر محیط ہے، چاہے وہ دعا کے وقت چیخنے پکارنے کی بات ہو یا تظاہر اور ریاکاری کا معاملہ ہو یا ہنگام دعا غیر خدا کی طرف توجہ کرنا ہو، لفظ "معتدی" ان سب کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک حکم کی طرف اشارہ ہوا ہے جو فی الحقیقت شرائطِ دعا میں سے ایک شرط ہے۔ فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے (ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا اس وقت خدا کے حضور میں درجۂ اجابت تک پہنچتی ہے جبکہ اس میں ضروری شرائط کا لحاظ کیا جائے۔ منجملہ ان شرائط کے ایک بات یہ ہے کہ دعا میں حق المقدور تعمیری پہلو کا لحاظ کیا جائے، لوگوں کے حقوق کا پاس ہو اور ایسی دعا کا پرتو اپنے تعمیری پہلو کے ساتھ تمام انسانی وجود کے اوپر ضوفگن ہو، بنابریں کبھی بھی مفسد اور تباہ کار افراد کی دعا درجۂ اجابت تک

---

[1] مجمع البیان جلد ۴ ص ۴۲۹۔

نہیں پہنچ سکتی۔

"اصلاح کے بعد فساد" سے ممکن ہے ظلم یا کفر یا دونوں مراد ہوں۔ امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک روایت میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان الارض کانت فاسدة فاصلحها الله بنبیہٖ

زمین فاسد تھی خدا نے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعے اس کی اصلاح فرمائی [1]

بعد ازاں دوبارہ مسئلہ دعا کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور اس کی شرائط میں سے ایک اور شرط کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: خدا کو خوف و رجا کے ساتھ پکارو (وادعوه خوفًا وطمعًا)۔

نہ تو اپنے اعمال پر ایسا گھمنڈ ہو کہ یہ گمان ہو کہ تمہاری زندگی میں کوئی تاریک گوشہ موجود نہیں ہے، ایسا خیال کرنا خود سقوط و انحطاط کا ایک بڑا سبب ہے اور نہ اس طرح سے مایوس ہو جاؤ کہ اپنے آپ کو خدا کی رحمت اور دعا کی قبولیت کا مستحق نہ جانو، احساس بھی انسان کو ہر قسم کی کوشش کرنے سے روک دیتا ہے، بلکہ "خوف و رجا" کے دو پروں کے ذریعہ مقامِ قربِ الٰہی کی طرف محوِ پرواز رہو، امید ہو تو اس کی رحمت کی امید ہو، اور خوف ہو تو اپنی ذمہ داریوں اور لغزشوں کا خوف ہو۔

اس کے بعد آخر آیت میں رحمتِ خدا کے اسباب کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے نزدیک ہے (ان رحمت الله قریب من المحسنین)۔

ممکن ہے یہ جملہ دعا کی ایک اور شرط ہو یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دعا ایک لفظی دعا اور اندر سے خالی نہ ہو تو ایسا کرو کہ اسے اعمالِ نیک کے ساتھ ادا کرو، تاکہ ان اعمال کی مدد سے اللہ کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو جائے اور تمہاری دعا اجابت کی منزل تک پہنچ جائے۔

اس طرح سے اس آیۂ شریفہ میں قبولیتِ دعا کی پانچ شرطیں بیان کی گئی ہیں:

اوّل: یہ کہ تضرع کے ساتھ تنہائی میں دعا مانگو۔

دوم: یہ کہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرو۔

سوم: یہ کہ تمہاری دعا فساد اور تباہ کاری کے ساتھ نہ ہو۔

چہارم: یہ کہ دعا میں خوف و امید کے پہلو برابر کے ہوں۔

پنجم: یہ کہ دعا نیک اعمال کے ہمدوش ہو۔

۞ ۞ ۞

---

[1] مجمع البیان جلد ۴ ص ۴۲۹

(۵۷) وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

(۵۸) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ○ ع ۱۴

ترجمہ

(۵۷) وہ خدا وہ ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (کی بارش) کے آگے آگے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھالیتی ہیں، ہم انہیں مُردہ زمین کی طرف ہنکا دیتے ہیں، پھر ان سے پانی برساتے ہیں، پھر اس کے ذریعے ہر طرح کے پھل اگاتے ہیں (تم جان لو کہ) اسی طرح ہم مُردوں کو بھی (قیامت کے روز زندہ کر کے زمین سے) نکالیں گے' (یہ مثال ہم نے اس لیے دی ہے) تاکہ تم (آخرت کو) یاد کرو۔

(۵۸) پاکیزہ سرزمین کی زراعت اللہ کے حکم سے (خوب) اُگتی ہے' اور خبیث (اور شور زدہ) زمین میں سوائے معمولی گھاس پھونس کے اور کچھ نہیں اُگتا، ہم اسی طرح سے آیتوں کو ادل بدل کے ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔

تفسیر

مربی اور قابلیت دونوں چیزوں کی ضرورت ہے

گذشتہ آیات میں مسئلہ "مبدأ" یعنی توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس ضمن میں اسرار جہاں کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں بعض نعماتِ الٰہی بیان کرکے مسئلہ "معاد" کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ تاکہ یہ دونوں بحثیں متقابل طور پر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ قرآن کریم کا ایک طریقہ ہے کہ بہت سے مقامات پر وہ "مبدأ" اور "معاد" کو ایک دوسرے کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ خدا کے پہچاننے کے سلسلے میں بھی، اور مسئلہ معاد کو جاننے کے لیے بھی دونوں مقامات پر خلقت کائنات کے اسرار کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا وہ ہے جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت کے آگے آگے اس طرح بھیجتا ہے جیسے کوئی خوشخبری سنانے والا آگے آگے دوڑ کر کسی مبارک مسافر کے آنے کی خبر دے (وھو الذی یرسل الریاح بشراً بین یدی رحمتہ)۔

وہ ہوائیں جو بحر اوقیانوس سے اٹھتی ہیں اور وہ بھاری بادلوں کو جو پانی کے ذخیرے سے لدے ہوئے ہوتے ہیں اپنے دوش پر اٹھائے ہوتی ہیں (حتیٰ اذآ اقلت سحاباً ثقالاً)۔

اور اس موقع پر ہم انہیں مردہ اور خشک زمینوں کی طرف ہنکاتے ہیں اور انہیں سیراب کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپ دیتے ہیں (سقناہ لبلد میت)۔

اور ان کے ذریعے حیات بخش پانی کی چھاگلیں ہر جگہ لٹاتے ہیں (فانزلنا بہ الماء)۔

اور اس پانی کے ذریعے طرح طرح کے خوش رنگ، خوشبو اور خوش مزہ میووں کو اس گل تاریک سے اگاتے ہیں (و اخرجنا بہ من کل الثمرات)۔

جی ہاں، آفتاب بحرِ اوقیانوس پر چمکتا ہے اور اپنی تمازت سے ان کے بخارات اوپر بھیجتا ہے۔ یہ بخارات اکٹھا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بادل کے دل بادل بن جاتے ہیں، پھر ہواؤں کی موجیں ان بادلوں کے پہاڑوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر اُدھر چل پڑتی ہیں جہاں ان کے برسنے کا حکم ہوتا ہے۔ ان میں کچھ ہلکی پھلکی ہوائیں جن میں ٹھنڈی رطوبت کی آمیزش بھی ہوتی ہے، وہ اس خزانۂ رحمت کی آمد آمد کا مژدہ سنانے کے لیے نسیم جانفزا بن کر آگے آگے چلتی ہیں، ان کے دامن سے اس بارانِ حیات بخش کی خوشبو آتی ہے، اس کے بعد بادلوں کے عظیم الشان تودے، بارش کے موٹے موٹے قطروں کو اپنے سے جدا کرکے زمین کی طرف روانہ کرتے ہیں، وہ قطرے نہ تو اتنے موٹے ہوتے ہیں کہ کھیتوں کو ویران کردیں اور زمین کو بالکل دھو ڈالیں اور نہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ فضا ہی میں بھٹک کر رہ جائیں، بلکہ بڑی مناسب مقدار و رفتار کے

ساتھ زمین پر اس طرح اترتے ہیں کہ اس کے اندر نفوذ کر جاتے ہیں اور بوئے ہوئے دانہ کے ماحول کو اس کی نشوونما کے لیے آمادہ کر دیتے ہیں ۔ اب وہ زمین جو اپنی خشکی اور حدت کی وجہ سے گورستان ہی ہوتی تھی، اس پانی کی وجہ سے ایک لہکتی ہوئی کھیتی یا مہکتے ہوئے باغ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے : ہم اسی طرح مُردوں کو زمین سے باہر نکالیں گے (کذالک نخرج الموتیٰ) ۔

ہم نے اس مثال کو اس لیے بیان کیا کہ روزِ معاد کا نمونہ تمہیں دکھلا دیں جو تمام سال بار بار تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتے رہتے ہیں تاکہ تم (آخرت کو) یاد کرو (لعلکم تذکرون)[1]

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ چونکہ بارش غالباً ایک جیسی اور ایک حالت میں سب جگہ برستی ہے اس لیے تمام زمینیں یکساں طور پر زندہ ہوسکتی ہیں، اس کا جواب آنے والی آیت میں دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ زمینوں کی صلاحیت کا مختلف ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ زمینیں اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیضانِ الٰہی سے استفادہ کریں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : شیریں اور پاکیزہ زمین پُر برکت اور فائدہ بخش نباتات کو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر نکالتی ہے (والبلد الطیّب یخرج نباتہ باذن ربہ) ۔

لیکن جو زمینیں شور زدہ ، خبیث وخراب ہیں ان میں سوائے ناچیز اور کم قیمت گھاس پھونس کے کچھ نہ اُگے گا (والذی خبث لا یخرج الا نکدا)[2]

اسی طرح بروزِ محشر جی اٹھنے کا حکم اگرچہ سب کو یکساں ملے گا، لیکن تمام انسان یکساں اور ایک مرتبہ واردِ محشر نہ ہوں گے ۔ لوگ بھی صحیح سالم اور شور زمین کی طرح متفاوت اور مختلف ہیں، یہ تفاوت ان کے عقائد، نیتوں اور اعمال کے لحاظ سے ہے ۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے : ان آیتوں کو ہم ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکر بجا لانے والے ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور راہِ ہدایت پر قدم بڑھاتے ہیں (کذالک نصرف الاٰیات لقوم یشکرون) ۔

مذکورہ آیت سے درحقیقت ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا ظہور اس دنیا میں ، نیز دنیائے آخرت میں دونوں جگہ ہے ، اور وہ یہ ہے کہ صرف " کسی فاعل کی فاعلیت " کسی چیز کے باثمر ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ استعداد اور " قابلیّت قابل " بھی ضروری ہے ، بارش کے قطروں سے

---

[1] اس سلسلہ میں مزید توضیح کے لیے کتاب " معاد و جہان پس از مرگ " کا مطالعہ فرمائیں جس میں مختلف آیات کے ذیل میں زندہ مثالیں دے کر مسئلہ معاد پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

[2] " نکد " کے معنی بخیل آدمی کے ہیں جو کسی کو کوئی چیز آسانی سے نہ دے اور اگر کبھی بھولے سے کوئی چیز دے بھی دے تو نہایت کم مقدار اور کم قیمت ہو ۔ آیہ مذکورہ میں شور زدہ زمین کو ایسے آدمی سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

حیات بخش تر اور لطیف تر کوئی شے متصور نہیں ہو سکتی، لیکن یہی آب باراں جس کی لطافت طبع میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، ایک جگہ تو سبزہ اور پھول اُگاتا ہے تو دوسری جگہ اس کی وجہ سے صرف خس و خاشاک نمودار ہوتے ہیں۔

(۵۹) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

(۶۰) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۶۱) قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۶۲) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(۶۳) اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(۶۴) فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝ ع ۱۵

ترجمہ

(۵۹) ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے اس (قوم) سے کہا کہ اے

میری قوم ! صرف خدائے یگانہ کی پرستش کرو ، کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو گے تو) میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔

(۶۰) (لیکن) ان کی قوم کے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں ۔

(۶۱) (نوحؑ نے) کہا اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے لیکن میں سارے جہانوں کے رب کا فرستادہ ہوں ۔

(۶۲) میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی جانب سے میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔

(۶۳) کیا تم کو یہ تعجب ہے کہ تمہارے رب کی جانب سے یاد دہانی کے لیے تمہارے پاس آنے والا فرمان ایک ایسے شخص پر نازل ہوا ہے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور تم ڈرو اور اس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے ۔

(۶۴) پس ان لوگوں نے اس (نوح) کی تکذیب کی ، پس ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ بیشک وہ لوگ ایک اندھی (اور کور باطن) قوم تھے ۔

تفسیر

حضرت نوحؑ — پہلے اولوا العزم پیغمبر

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں بیان کیا کہ خداوندِ عالم نے شروع میں بعض بنیادی مسائل جیسے خداشناسی ، معاد ، ہدایت بشر اور احساس مسئولیت بیان کرنے کے بعد کچھ بڑے پیغمبروں جیسے نوحؑ ، ہودؑ ، صالحؑ ، لوطؑ ، شعیبؑ اور آخر میں موسیٰ بن عمرانؑ کا تذکرہ کیا ہے ، تاکہ ان بحثوں کے زندہ اور عملی نمونوں

کو ان کی ولولہ انگیز اور سبق آموز سیرتوں کے ساتھ پیش کیا جائے ۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے ۔ جو گفتگو ان کے اور ان کی سرکش، بُت پرست اور شریر قوم کے درمیان ہوئی تھی اسے نقل کیا گیا ہے ۔

حضرت نوحؑ کا قصہ قرآن کریم میں کئی جگہ آیا ہے جیسے سورۂ ہود، سورۂ انبیاء، سورۂ مومنون، سورۂ شعراء نیز قرآن میں ایک چھوٹا سورہ بنام ۔ نوح ۔ بھی ہے جو قرآن کا ۷۱ واں سورہ ہے ۔

اس جلیل القدر پیغمبرِ خدا کے مفصل حالات کشتی کا بنانا، وحشتناک طوفان کی سرگزشت اور خود خواہ فاسد اور بُت پرست لوگوں کا اس طوفان میں غرق ہونا مذکورہ سورتوں میں انشاء اللہ سپرد قلم کیا جائے گا ان چھ آیتوں میں ان تمام واقعات کو صرف فہرست وار بیان کرنا مقصود ہے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (لقد ارسلنا نوحًا الی قومه) ۔

سب سے پہلی چیز جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو یاد دلائی وہی توحید اور ہر قسم کی بُت پرستی سے نہی تھی، انہوں نے اپنی قوم سے کہا : اے میری قوم ! خدا کی پرستش کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (فقال یقوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره) ۔

توحید کا نعرہ نہ صرف حضرت نوحؑ کا پہلا نعرہ تھا بلکہ جتنے بھی انبیاء آئے سب نے سب سے پہلے لوگوں کو اسی بات کی دعوت دی ۔ بنا بریں اس سورہ کی متعدد آیات نیز دیگر قرآنی سورتوں میں بہت سے پیغمبروں کی دعوت کے آغاز میں یہی جملہ ملتا ہے : یا قوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره (اس سورہ کی آیات ۶۵ - ۷۳ - ۸۵ ملاحظہ فرمائیں) ۔

اس جملے سے اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ بُت پرستی انسان کی سعادت کے راستے میں ایک زبردست خار کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے گلزارِ توحید کے تمام باغبان (انبیاء) استعداد بشری کی سرزمین پر طرح طرح کے پھول اور درخت لگانے سے پہلے اپنی کمرہمت کو اس اہم کام کے لیے باندھتے تھے کہ ان شرک و بت پرستی کے خاروں کو صاف کر دیں ۔

خاص طور سے سورۂ نوح کی آیت ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں لوگ متعدد بتوں کی پرستش کرتے تھے جن کا نام ۔ ود ۔، ۔ سواع ۔، ۔ یغوث ۔ اور ۔ نسر ۔ تھا ۔ ان سب کی تفصیل انشاءاللہ آئندہ پیش کی جائے گی ۔

حضرت نوحؑ نے ان کی فطرتِ خوابیدہ کو بیدار کرنے کے بعد انہیں بُت پرستی کے انجام بد سے خبردار کیا اور فرمایا : مَیں تمہارے اوپر روزِ عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم) ۔

عظیم دن کے عذاب سے ممکن ہے کہ وہی طوفانِ نوح مراد ہو جس سے کمتر عذاب و سزا نہیں دیکھی

گئی۔ نیز ممکن ہے کہ اس سے مراد عذابِ روزِ قیامت ہو کیونکہ قرآن کریم میں یہ تعبیر دونوں معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ سورۂ شعراء کی آیت ۱۸۹ میں ہے۔

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔

یہ آیت اس عذاب کے تذکرہ میں ہے جو قوم شعیب پر ان کی تباہ کاریوں کے نتیجہ میں اسی دنیا میں نازل ہوا تھا، پھر سورۂ مطففین کی آیت ۴، ۵ میں ہے :

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔

آیا ان کو اس بات کا گمان نہیں ہے کہ وہ روزِ عظیم میں اٹھائے جائیں گے[1]

مسئلہ شرک کے بعد لفظ "اخاف" (مجھے ڈر ہے کہ اس سزا میں گرفتار نہ ہو جاؤ) کے ساتھ تعبیر کرنا شاید اس وجہ سے ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام ان سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں شرک کرنے کی پاداش میں ایسی سزا کا یقین نہ بھی ہو تو کم از کم اس کا خوف تو کرو کیونکہ عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ جس راستے میں ایسے زبردست خطرے کا احتمال بھی ہو وہ راستہ اختیار کیا جائے۔

لیکن قوم نوح بجائے اس کے کہ اس عظیم پیغمبر کی اصلاحی دعوت کو قبول کرتی جو ہر طرح سے ان کی خیر خواہی پر مشتمل تھی اور آئینِ توحید کو جان و دل سے مان لیتی، ظلم و ستم سے اپنا ہاتھ اٹھا لیتی، اس کے برعکس ان کی قوم کے سرداروں اور ثروت مندوں نے جب لوگوں کی بیداری کی وجہ سے اپنے مفادات کو خطرے میں دیکھا اور نوحؑ کے مذہب کو اپنی عیاشیوں اور ہوس رانیوں کے سدِ راہ پایا، تو ان کے جواب میں صاف صاف یہ کہہ دیا : کہ ہم تو تجھے کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں (قال الملأ من قومه انا لنراك في ضلال مبين)۔

"ملاء" عام طور سے اس گروہ کو کہتے ہیں جو اپنے لیے ایک مخصوص خیال اور عقیدہ اختیار کرتا ہے اور اس کی جتھہ بندی اور شکوہ ظاہری آنکھوں کو پُر کر دیتی ہے (کیونکہ اس لفظ کا مصدر "ملاء" ہے اور اس کے معنی پُر کرنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ غالباً انسانوں کے اس گروہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو خود پرست ہو، ظاہری طور سے مہذب ہو لیکن اندر سے گندہ ہو اور محیط کے مختلف زاویوں کو اپنے وجود سے پُر کرنے والا ہو۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے سخت اور توہین آمیز رویّہ کے جواب میں نہایت متانت اور محبت کے ساتھ کہا : میں نہ صرف یہ کہ گمراہ نہیں ہوں بلکہ گمراہی کی کوئی نشانی بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی، بلکہ میں

[1] زیرِ نظر آیت میں کلمہ "عظیم" "یوم" کی صفت ہے، نہ کہ "عذاب" کی۔

پروردگار عالم کا بھیجا ہوا رسول ہوں (قال یا قوم لیس بی ضلالة ولکنی رسول من رب العالین)۔
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مختلف خدا جو تم مانتے ہو اور ان کی الگ الگ حکومتیں تم نے بنا رکھی ہیں جیسے سمندروں کا خدا، آسمانوں کا خدا، صلح اور جنگ کا خدا وغیرہ وغیرہ یہ سب بے بنیاد باتیں اور خرافات ہیں۔ حقیقی پروردگار اور سارے جہانوں کا رب صرف وہ خدائے یگانہ و توانا ہے جو ان سب کا خالق و صانع ہے۔

(حضرت نوحؑ نے کہا) میری غرض تو صرف یہ ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پیغام اور اس کے فرامین تم تک پہنچا دوں (ابلغکم رسالات ربی)۔
- اور اس راہ میں، میں کسی قسم کی خیرخواہی کو تم سے نہ روکوں" (وانصح لکم)۔
- انصح - مادّہ - نصح - (بروزن قفل) سے ہے، جس کے معنی خلوص کے ہیں، اسی بنا پر - ناصح العسل" کے معنی خالص شہد کے ہیں، بعد میں یہ لفظ اس گفتگو کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں خلوص ہو، خلوص ہو کسی قسم کی غرض اور فریب کاری نہ ہو۔
آخر میں ارشاد ہوتا ہے: میں خدا کی جانب سے ان چیزوں کو جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (واعلم من الله مالا تعلمون)۔
ممکن ہے یہ جملہ ان لوگوں کی مخالفتوں اور روگردانیوں کے مقابلے میں تہدید کا پہلو لیے ہوئے ہو۔ یعنی مجھے اللہ کی طرف سے ایسی دردناک سزاؤں اور خوفناک عذابوں کا علم ہے جن کا علم تم کو نہیں ہے۔ یا ہوسکتا ہے اس سے خداوند کریم کے لطف وکرم کی طرف اشارہ مقصود ہو یعنی اگر تم توبہ کرلو اور اللہ کی طرف پلٹ آؤ تو مجھے اس کے ایسے انعاموں اور ثوابوں کا علم ہے جس کی تم کو خبر نہیں ہے۔ یا پھر ممکن ہے مراد یہ ہو کہ میں اللہ کی طرف سے تمہاری ہدایت کا منصب لے کر آیا ہوں تو میں خدا کے بارے میں اور اس کے فرامین و قوانین کے بارے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے، اس بنا پر میری پیروی تم پر لازم ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب باتیں اس جملے میں مضمر ہوں۔

اس کے بعد والی آیت میں حضرت نوحؑ کی ایک اور گفتگو ملتی ہے جو ان کی قوم کے اس تعجب کے جواب میں ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان حامل رسالتِ الٰہی بن جائے۔ اس پر حضرت نوحؑ نے کہا: آیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ کوئی انسان رسالتِ پروردگار کے پہنچانے پر مامور ہو اور اللہ کی طرف سے بیدار کرنے والے فرامین اس پر نازل ہوں تاکہ وہ تمہیں تمہارے بُرے انجام سے ڈرائے اور پرہیزگاری کے طور طریقے کی طرف تمہیں دعوت دے تاکہ تم رحمتِ الٰہی کے مستحق بن جاؤ (او عجبتم ان جاءکم ذکر

من ربکم علیٰ رجل منکم لینذرکم ولتتقوا ولعلکم ترحمون)۔
یعنی اس بات میں کونسا تعجب ہے؟ کیونکہ ایک لائق و شائستہ انسان میں ہر موجود سے زیادہ اس بات کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اللہ کی رسالت کا حامل بن جائے، علاوہ بریں یہ کہ انسان ہی انسانوں کا رہبر بن سکتا ہے نہ کہ جن اور فرشتے۔

لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ ایسے ہمدرد اور خیر خواہ رہبر کی بات دل سے پسند کرتے الٹا انہوں نے اس کی بات کی تکذیب کی اور اس کی دعوت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، بلکہ ہوا یہ کہ جتنا بھی حضرت نوحؑ زیادہ تبلیغ کرتے جاتے تھے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی بڑھتی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ خدا نے صرف حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو جو کشتی میں سوار تھے نجات دے دی اور جو بھی اس کی آیتوں کو جھٹلانے والے تھے انہیں ڈبو کر غرق کر دیا (فکذبوہ فانجیناہ والذین معہٗ فی الفلك واغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا)۔
اس آیت کے آخر میں اس سخت سزا کی دلیل اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: وہ لوگ ایک اندھا گروہ تھے۔ یعنی ایسے لوگ تھے جو کور دل اور کور باطن تھے اور حقیقت کا چہرہ دیکھنے سے محروم ہو گئے تھے (انہم کانوا قومًا عمین)[1]
ان کی یہ کور دلی اور ان کے اعمال شوم اور پیہم ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی انسان ایک طویل مدت تک تاریکی میں رہے یا کسی اور وجہ سے اپنی آنکھیں بند رکھے اور روشنی کی جانب نگاہ کرنے سے اجتناب کرے تو وہ تدریجاً اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہی حال دیگر اعضائے بدن کا ہے اگر وہ ایک بڑی مدت تک کام نہ کریں تو وہ خشک ہو کر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جائیں گے۔
انسان کی باطنی نگاہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ حقائق سے مسلسل چشم پوشی کرتے رہنا اور عقل و خرد سے کام نہ لینا اور واقعات و حقائق سے عقل کو الگ رکھنا تدریجی طور سے عقل کی تیز بین نگاہ کو ضعیف سے ضعیف تر کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر میں یہ نگاہ عقل بھی بالکل اندھی ہو جاتی ہے۔
حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کی باقی سرگزشت ان سورتوں میں جن کا پچھلے صفحات میں ذکر ہوا ہے انشاء اللہ آئندہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

---

[1] "عمین" جمع ہے "عمیٰ" (بر وزن دلو) کی یہ بالعموم اسے کہتے ہیں جس کی بصیرت اور چشم باطن ختم ہو گئی ہو، لیکن "اعمی" اسے بھی کہتے ہیں جس کی ظاہری آنکھیں ختم ہو گئی ہوں اور اسے بھی جس کی باطنی بینائی ختم ہو گئی ہو (یہ بھی توجہ رہے کہ لفظ "عمی" پر اگر اعراب آجائے تو "عم" رہ جاتا ہے)۔

(۶۵) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

(۶۶) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ○

(۶۷) قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاھَۃٌ وَّلٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

(۶۸) اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ○

(۶۹) اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ ؕ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَۃً ۚ فَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

(۷۰) قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○

(۷۱) قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ○

(۶۴) فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۠

ترجمہ

(۶۵) اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، تم کیوں نہیں ڈرتے ہو۔

(۶۶) ان کی قوم کے ایک گروہ نے جو کافر تھے یہ کہا کہ (اے ہود) ہم تم کو نادانی میں دیکھتے ہیں اور ہم تم کو یقیناً جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔

(۶۷) انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! مجھ میں کسی قسم کی نادانی نہیں ہے، لیکن میں تمام جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں۔

(۶۸) مَیں اپنے رب کے پیغاموں کو تم تک پہنچاتا ہوں، اور مَیں تمہارے لیے ایک امانت دار نصیحت کرنے والا ہوں۔

(۶۹) کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے یاد دہانی آئے ایک ایسے مرد کے ذریعہ جو تم میں سے ہے، تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تم یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم کو قوم نوح کا جانشین بنایا اور تم کو از روئے خلقت کشادگی دی (بدنی حیثیت سے قوی بنایا) پس اللہ کی نعمتوں کو دھیان میں لاؤ تاکہ تم فلاح پاجاؤ (کامیاب ہوجاؤ)۔

(۷۰) انہوں نے کہا کہ کیا تم اس واسطہ آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی پرستش کریں،

اور ان (کئی خداؤں) کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد عبادت کرتے چلے آ رہے ہیں؟ (ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا) لہٰذا تم جس (عذاب) سے ہم کو ڈرا رہے ہو اس کو لے آؤ اگر تم واقعاً سچوں میں سے ہو۔

(۷۱) (حضرت ہودؑ نے) کہا کہ پلیدگی اور غضب تمہارے رب کی طرف سے تم کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے، کیا تم مجھ سے کچھ ناموں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے (بطور معبود کے) گھڑ رکھے ہیں، اللہ نے ان کی حقانیت کی کوئی دلیل بھی نہیں اتاری ہے، اچھا تو انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوتا ہوں۔

(۷۲) پس ہم نے ان (ہودؑ) کو اور جو اُن کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے نجات دی، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی اور وہ ایمان نہیں لائے تھے اُنہیں جڑ سے نابود کر دیا۔

تفسیر

قوم ھود کی سرگزشت کا ایک گوشہ

حضرت نوحؑ کی رسالت کی سرگزشت اور جو عبرت و حکمت کے درس اس میں موجود تھے انہیں بیان کرنے کے بعد ایک اور نبی یعنی حضرت ہودؑ کی سرگزشت بیان کی جاتی ہے۔

یہ قصہ قرآن کریم کی دیگر سورتوں میں بھی ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جیسے سورہ "شعراء" یا خود "سورۂ ہود" زیر بحث آیات میں صرف حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان جو گفتگو اور مباحثہ ہوا ہے اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا (و الی عاد اخاھم ھودًا)۔

قوم عاد کے لوگ سرزمین "یمن" میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جسمانی حیثیت سے اور ثروت کے اعتبار سے جو انہیں زراعت اور گلہ داری کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی وہ ایک قوی اور خوشحال قوم تھے لیکن عقیدے کی رُو سے بہت پسماندہ تھے۔

"ہودؑ" اسی قوم کے ایک فرد تھے اور ان لوگوں سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ انہیں اللہ کی طرف سے حکم ملا کہ اپنی قوم کی ہدایت کریں اور انہیں تباہی سے بچائیں، عذابِ الٰہی سے ڈرائیں اور جو فساد ان میں پھیلا ہوا ہے اس سے نبرد آزما ہوں۔ شاید "اخاھم" (ان کے بھائی) سے اسی قرابتداری کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان تھی۔

نیز یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "بھائی" جو اس سورۃ میں حضرت ہودؑ کے لیے استعمال ہوا ہے اور بعض دیگر انبیاء کے لیے بھی دوسری سورتوں میں استعمال ہوا ہے جیسے حضرت نوحؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۰۶ میں) حضرت صالحؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۴۲ میں)، حضرت لوطؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۶۱ میں) اور حضرت شعیبؑ کیلئے (اعراف ۸۵ میں)، یہ اس وجہ سے ہے کہ ان انبیاء نے بڑی جانسوزی، ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ایک بھائی کی طرح قوم میں تبلیغ کی اور انہیں ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ تعبیر ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی کو سمجھانے کے لیے بڑی کوشش اور کد و کاوش کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس تعبیر میں ایک طرح کی برابری اور مساوات بھی ہے اور تفوق و امتیاز اور ریاست طلبی کی نفی بھی۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی دعوت میں کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتے تھے اور نہ کوئی ریاست و حکومت چاہتے تھے بلکہ ان کی انتہائی غرض یہ تھی کہ اپنی اپنی قوموں کو بدبختی و تباہی کے گرداب سے نجات دلا دیں۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ "اخاھم" سے دینی اور مذہبی برادری مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ قومیں عام طور سے مشرک تھیں اور انبیائے الٰہی کی بار بار کی کوششوں کے باوجود انہوں نے مذہبِ حق کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت "ہودؑ" نے اپنی دعوت کو مسئلہ توحید، رسم و رواج، شرک، بُت پرستی سے اپنی بیزاری کے ساتھ شروع کیا، اور "ان سے یہ کہا کہ اے میری قوم! خدائے یگانہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، آیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے (قال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ افلا تتقون)۔

لیکن اس خود خواہ اور متکبر گروہ نے، خاص کر ان میں سے مالدار لوگوں نے جنہیں خدا نے "ملاء" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ہودؑ سے وہی کچھ کہا جو قوم نوح نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا، بلکہ نادانی اور حماقت کی نسبت ان کی طرف دی "انہوں نے کہا کہ ہم تمہیں نادانی میں دیکھتے ہیں اور ہمیں گمان یہ ہے کہ تم جھوٹوں میں سے ایک شخص ہو (یعنی جہاں اور لوگ جھوٹ بولتے ہیں تم بھی بولتے ہو" قال الملأ الذین کفروا من قومہٖ انا لنراک فی سفاھۃ و انا لنظنک من الکاذبین)۔

"سفاہت" اور "نادانی" ان کے خیال کے مطابق یہ تھی کہ انسان اپنے ماحول اور اکثریت

کے رسم و رواج کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کرے چاہے وہ رسم و رواج کیسے ہی غلط اور جاہلانہ کیوں نہ ہوں، یہاں تک کہ اپنی جان خطرہ میں ڈال دے۔ ان کی منطق کی بنا پر حضرت ہودؑ کی نادانی یہ تھی کہ کوئی انسان اپنے ماحول کے ساتھ نہ گھل مل سکے اور ابن الوقتی سے کام نہ لے اور پرانے طور طریقوں کو توڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور اس وجہ سے ہر طرح کی پریشانیوں اور جنجال کو مفت میں بیٹھے بٹھائے خرید لے۔

لیکن حضرت ہودؑ نے اپنے اس مخصوص سکون و وقار کے ساتھ جو ہر پاک و برحق نبی کا شیوہ ہے بغیر کسی غصہ، دلتنگی اور مایوسی کے - ان سے کہا: اے قوم! میرے اندر کسی قسم کی نادانی نہیں پائی جاتی، میری گفتار و رفتار میرے سلامتی ہوش و حواس کی بیّن دلیل ہے، مَیں تمام جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں" (قال یا قوم لیس بی سفاھۃ ولکنی رسول من رب العالمین)۔

حضرت ہودؑ نے اپنے کلام میں اس بات کا بھی اضافہ کیا: مجھ پر اللہ کی طرف سے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اپنے رب کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دوں اور ان احکام کو بھی تم تک پہنچا دوں جو تمہاری سعادت کے ضامن اور تمہیں شرک و فساد سے نجات دینے والے ہیں اور وہ بھی انتہائی خلوص، ہمدردی اور امانت کے ساتھ (ابلغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین)۔

اس کے بعد حضرت ہودؑ ان لوگوں کے سامنے جو اس بات پر متعجب تھے کہ خدا نے خود ان لوگوں میں سے ایک اپنا رسول کیسے بھیج دیا، یہ کہتے ہیں کہ یہ بات حضرت نوحؑ نے بھی اپنی قوم سے کہی تھی کہ: "آیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ پروردگار کی جانب سے ایک ایسے شخص پر وحی ہوئی ہے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ اس عذاب سے تم کو ڈرائے جو تمہارے اعمال بد کی وجہ سے تم کو درپیش ہے؟" (او عجبتم ان جآءکم ذکر من ربکم علیٰ رجل منکم لینذرکم)۔

اس کے بعد ان کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اور ان کی روح کے اندر احساس شکر گذاری کو برانگیختہ کرنے کے لیے خدا کی بعض نعمتوں کی یاد دہانی کراتے ہیں: "اس بات کو دھیان میں لاؤ کہ خداوند کریم نے تمہیں قوم نوحؑ کا جانشین بنایا اور جب وہ لوگ اپنی سرکشی کے باعث تباہ و برباد ہو گئے ان کی تمام وسیع زمینوں کا مالک و وارث تمہیں بنا دیا، ایسی زمینیں جو طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال تھیں" (واذکروآ اذ جعلکم خلفآء من بعد قوم نوح)۔

اس کے علاوہ - تم کو غیر معمولی قوتِ جسمانی عطا کی" (و زادکم فی الخلق بصطۃ)۔

یہ جملہ - زادکم فی الخلق بصطۃ - (تم کو خلقت کے لحاظ سے وسعت عطا کی) جیسا کہ ہم نے سابقاً کہا ممکن ہے اس سے قوم عاد کی جسمانی قوت کی طرف اشارہ مقصود ہو، کیونکہ قرآن کی مختلف آیات اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط ہڈیوں والے قوی ہیکل لوگ تھے - چنانچہ سورہ - حٰم السجدہ - کی آیت ۱۵ میں ہے :

"مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً"

ہم سے کون زیادہ قوی ہے -

اور سورہ حاقہ میں آیت ۷ میں ان کی اس سزا کے بارے میں ہے جو ان کے اعمال کے نتیجہ میں ان کو دی گئی :

"فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ"

تم قوم عاد کو دیکھتے کہ وہ لوگ طوفانِ ہوا کے نتیجے میں اس طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے گویا درخت خرما کے تنے کٹے پڑے ہیں -

نیز ممکن ہے کہ اس (بصطۃ) سے ان کی افزائش ثروت، مالی قدرت، ان کا ظاہری ترقی یافتہ تمدن مراد ہو جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات اور تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - لیکن پہلا احتمال ظاہر آیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے -

آخر میں حضرت ہودؑ اپنی خود غرض قوم سے فرماتے ہیں کہ : خدا کی طرح طرح کی نعمتوں کو دھیان میں لاؤ تاکہ تمہارا احساسِ شکرگزاری بیدار ہو اور اس کے فرمان کے سامنے سرتسلیم خم کر کے نجات پا جاؤ (فاذکروا آلاء الله لعلکم تفلحون) -

لیکن حضرت ہودؑ کی ان تمام نصیحتوں، ہدایتوں اور یاد دہانیوں سے انہوں نے کوئی اثر نہ لیا بلکہ اپنے مادی مفادات کو خطرہ میں پڑتا دیکھ کر الٹا مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور انہوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ :- کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمیں خدائے یگانہ کی طرف دعوت دو اور ان تمام معبودوں کو ہم چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد سالہا سال سے پرستش کرتے چلے آئے ہیں اور ان کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے ؟! ایسا ہرگز نہ ہوگا" (قالوا اجئتنا لنعبد الله وحدہٗ ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا) -

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ ان کے افکار کی سطح اس قدر گری ہوئی تھی کہ وہ خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش سے سخت ہراساں تھے اور جدا جدا اور متعدد خداؤں کی پرستش کو اپنا سرمایۂ افتخار خیال کرتے تھے - لطیفہ یہ کہ ان کی ساری دلیل اپنے اس خلافِ عقل فعل پر صرف یہی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کو ایسا

کرتے دیکھ چکے ہیں، ورنہ ان کے پاس اور کونسی معقول دلیل ہوسکتی تھی جس کی بنا پر وہ چند پتھر یا لکڑی کے ٹکڑوں کی تعظیم کرنے کی توجیہ کرسکیں۔

حضرت ہودؑ کی امید کو کلی طور سے اپنے سے قطع کرنے کے لیے حرف آخر کے طور پر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ: "اگر تم واقعاً سچ کہتے ہو اور اس عذاب کی کچھ حقیقت ہے جس سے تم ڈراتے رہے ہو تو جتنا بھی جلدی تم سے ہوسکے یہ عذاب ہماری طرف لے آؤ اور ہم کو بالکل نیست و نابود کردو۔ (یعنی ہم کو تمہاری ان دھمکیوں کا ذرہ برابر خیال نہیں ہے) (فأتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین)۔

جب بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے اپنی آخری بات بھی کہہ دی جو اس بات کی علامت تھی کہ انہوں نے ہدایت قبول کرنے سے قطعاً اعراض کر لیا ہے اور حضرت ہودؑ بھی ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے ہیں تو حضرت ہودؑ نے کہا کہ اچھا جب ایسا ہے تو جان لو۔ عذاب الٰہی اور غضب خدا یقینی طور پر تمہارے اوپر نازل ہوگا" (قال قد وقع علیکم من ربکم رجس وغضب)۔

"رجس" کے معنی درحقیقت ہر ناپاک چیز کے ہیں۔ بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ اس لفظ کے مصدر "ر ج س" کے معنی زیادہ وسیع ہیں یعنی "ہر وہ چیز جو لوگوں کی دوری اور نفرت کا سبب بنے" لہٰذا ہر طرح کی ناپاکی، نجاست اور سزا کو "رجس" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب امور انسان کی دوری اور نفرت کا سبب بنتے ہیں۔ بہرصورت یہ لفظ آیت مذکورہ میں ممکن ہے سزائے الٰہی اور عذاب الٰہی کے معنی میں مستعمل ہو۔ اس کا ذکر لفظ "قد وقع" (ماضی کے صیغہ) کے ساتھ اس لیے ہے کہ یقینی طور پر تم عذاب کے مستحق ہو گئے ہو، اب یہ عذاب تمہیں دامنگیر ضرور ہوگا۔

نیز ممکن ہے کہ "رجس" "روح کی پلیدی اور آلائش" کے معنی میں ہو، یعنی تم گمراہی اور فساد کے گرداب میں اس قدر غرق ہو گئے ہوں کہ تمہاری روح طرح طرح کی آلائشوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے؟ اس بنا پر خدا کے عذاب کے مستحق بن گئے ہو۔

اس کے بعد ایک جملے کا اور اضافہ کیا گیا ہے تاکہ بتوں کے بارے میں ان کی منطق بغیر جواب کے نہ رہ جائے وہ جملہ یہ ہے: کیا تم ان چیزوں کے بارے میں جن کا صرف نام ہی خدا ہے اور یہ نام تمہارے بزرگوں نے ان کے لیے گھڑا ہے، اور وہ جھوٹ موٹ کچھ خاصیتیں اور کرامتیں ان سے منسوب کرتے چلے آئے ہیں، مجھ سے جھگڑا کرتے ہو، جبکہ خدا کی جانب سے ان کی حمایت میں کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی ہے (اتجادلوننی فی اسماء سمیتموها انتم و اٰباؤکم ما نزل اللّٰہ بها من سلطان)۔

واقعہ یہ ہے کہ تمہارے بُت صرف الوہیت کا اسم بدون مسمّیٰ رکھتے ہیں۔ اسم بھی وہ جو تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا ساختہ پرداختہ اور خیال خام ہے ورنہ یہ لکڑی کے کچھ ٹکڑے جنگل کے دیگر ٹکڑوں سے مختلف نہیں ہیں۔

اس کے بعد کہا : اب جبکہ ایسا ہے تو پھر تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا. تم یہ انتظار کرو کہ آنے والی مصیبت میں یہ بُت تمہاری مدد کریں گے اور میں اس انتظار میں رہوں گا کہ خدا کا دردناک عذاب تمہارے اوپر نازل ہو. آئندہ پتہ چلے گا کہ ان دونوں انتظاروں میں کونسا انتظار حقیقت سے نزدیک تھا (فانتظروا انی معکم من المنتظرین)۔

زیر بحث آیت کے آخر میں اس ضدی اور ہٹ دھرم قوم کا انجام مختصر لفظوں میں اس طرح بیان ہوا ہے : ہم نے ہودؑ کو اور جو لوگ ان کے ہمراہ تھے ان کو اپنے لطف و رحمت کے ذریعے نجات دے دی اور ان لوگوں کی بیخ کنی کر دی جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے اور آمادہ نہ ہوئے کہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، ہم نے ان کو تہس نہس کر دیا (فانجیناہ والذین معہ برحمۃ منا و قطعنا دابر الذین کذبوا بآیاتنا وما کانوا مؤمنین)۔

"دابر" لغت میں دراصل ہر چیز کے اختتام اور آخری حصے کو کہتے ہیں، بنا بریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس قوم کو آخر تک نابود کر دیا اور ان کی جڑ تک کو اکھاڑ پھینکا۔

(قوم "عاد" کا بقیہ قصہ، ان کی خصوصیاتِ زندگی اور عادتیں، ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کیفیت انشاء اللہ آنے والے صفحات میں سورۂ "ہود" کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ پیش کی جائے گی)۔

(۷۳) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

(۷۴) وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝

(٧٥) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○

(٧٦) قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○

(٧٧) فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ○

(٧٨) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○

(٧٩) فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ○

ترجمہ

(٧٣) اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! خدا کی پرستش کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ ایک روشن دلیل تمہارے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ یہ اللہ کا ناقہ تمہارے لیے معجزہ ہے۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ خدا کی زمین میں (جنگلی گھاس پھوس میں سے) چرے، اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمہیں درد ناک عذاب آلے گا۔

(٧٤) اور اس چیز کو اپنے دھیان میں لاؤ کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کا جانشین بنایا اور (ان کی) زمین میں تمہیں بسایا تاکہ اس کے ہموار خطہ میں تم اپنے لیے قصر بناؤ اور پہاڑوں میں بھی) اپنے واسطے گھر تراشو لہٰذا اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو، اور زمین میں فساد نہ کرو۔

(٧٥) لیکن ان (صالحؑ) کی قوم کے متکبر سرداروں نے ان مستضعف (غریب لوگوں) سے پوچھا کیا (واقعی) تم کو یہ یقین ہے کہ صالح اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس چیز پر (اچھی طرح سے) ایمان لائے ہیں جس کا ان کو (اللہ کی جانب سے) حکم دیا گیا ہے۔

(٧٦) متکبّر افراد نے کہا کہ (مگر) ہم تو اس چیز کے کافر ہیں جس پر تم لوگ ایمان لائے ہو۔

(٧٧) اس کے بعد انہوں نے ناقہ کی کوچیں کاٹ دیں اور اپنے پروردگار کے حکم سے روگردانی کی اور کہا کہ اے صالح! اگر تم (واقعاً) خدا کے فرستادہ ہو تو جس (عذاب) سے ڈراتے ہو اس کو لے آؤ۔

(٧٨) آخر کار انہیں زلزلہ نے آلیا اور وہ صبح کے وقت اپنے گھروں میں جسم بے جان ہو کر رہ گئے۔

(٧٩) پس (صالح نے) ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: اے میری قوم! مَیں نے اپنے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا اور جو خیر خواہی کا حق تھا وہ ادا کر دیا، مگر مَیں کیا کروں کہ تم اپنے خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

⁂ ⁂ ⁂

تفسیر

قوم ثمود کی عبرت انگیز سرگزشت

ان آیات میں خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت صالحؑ کے اس جہاد کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنی قوم ثمود کے خلاف کیا۔ قوم ثمود شام اور حجاز کے درمیان ایک کوہستانی علاقے میں رہتی تھی۔ اس سلسلے میں قرآن نے جو عبرت انگیز واقعات نوحؑ اور ہودؑ کی قوموں کے متعلق بیان کیے ہیں ان آیات میں بھی انہی کا تذکرہ ہوا ہے اور حضرت صالحؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سورہ ہائے "ہود"، "شعراء"، "قمر" اور "شمس" میں بھی اس سرگزشت کا ذکر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تفصیل سے سورۂ ہود میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ ان آیات میں حضرت صالح اور ان کی قوم کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور ان کے انجام بد کا ذکر ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا (و الی ثمود اخاھم صالحا)۔

ان پیغمبروں کو بھائی کیوں کہا گیا اس کی وجہ اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں ہم حضرت ہودؑ کے واقعے میں بیان کر آئے ہیں۔

اس قوم کے پیغمبر حضرت صالحؑ نے بھی دیگر پیغمبروں کی طرح اپنی قوم کی اصلاح کے لیے پہلا قدم مسئلہ توحید اور یکتا پرستی سے اٹھایا اور ان سے کہا: اے میری قوم! خدائے یگانہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ)۔

اس کے بعد اس جملے کا اضافہ فرمایا کہ میں بغیر کسی دلیل کے کوئی بات نہیں کہتا۔ بینہ اور روشن دلیل تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے آچکی ہے اور یہ وہی اونٹنی ہے جس کو خدا نے تمہارے لیے معجزہ قرار دیا ہے" (قد جاءتکم بینۃ من ربکم ھذہ ناقۃ اللہ لکم اٰیۃ)۔

"ناقہ" کے اصلی معنی لغت میں اونٹنی کے ہیں، قرآن میں سات جگہ ناقۂ صالح کا ذکر آیا ہے۔[1] یہ اونٹنی کیسی تھی؟ اور کس طرح اللہ نے اسے قوم صالح کے لیے معجزہ اور دندان شکن دلیل قرار دیا؟ ان تمام باتوں کی تفصیل انشاء اللہ ہم سورۂ ہود کی تفسیر میں پیش کریں گے۔

---

[1] علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں فرمایا ہے:

ناقہ دراصل ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدمت کے لیے مطیع اور آمادہ ہو۔ اس کا اطلاق شتر مادہ پر شاید اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ بہ نسبت نر اونٹ کے بہتر طور سے سواری کا کام دیتی ہے۔

ضمنی طور سے یہ وضاحت بھی کر دینا چاہیئے کہ ناقہ کی اضافت اللہ کی طرف - اضافت تشریفی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہ اونٹنی کوئی معمولی اونٹنی نہ تھی بلکہ اس میں امتیاز پایا جاتا تھا ۔

بعد ازاں ان سے فرمایا : اس ناقہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا ، اس کو خدا کی زمین میں چرنے دینا اور اسے اذیت نہ دینا ورنہ دردناک عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے (فذروھا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیأخذکم عذاب الیم) ۔

" ارض " پر لفظ " اللہ " کا اضافہ اس وجہ سے ہے کہ یہ اونٹنی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے کیونکہ اس کی غذا جنگل کی گھاس پھوس ہے ، لہٰذا تم اسے کیوں نقصان پہنچاؤ ۔

اس کے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : یہ دھیان میں رہے کہ خدا نے قوم " عاد " کے بعد تمہیں ان کا جانشین اور خلیفہ قرار دیا ہے اور زمین میں تمہیں جگہ دی ہے ۔ یعنی ایک طرف تو تم کو اللہ کی نعمتوں کا خیال رہنا چاہیئے ، دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ تم سے پہلے جو قوم تھی وہ اپنی سرکشی اور طغیان کے باعث عذاب الٰہی سے تباہ و برباد ہو چکی ہے (واذکروآ اذجعلکم خلفآء من بعد عاد وبوّأکم فی الارض) ۔

پھر اس کے بعد انہیں عطا کی گئی کچھ نعمتوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے : تم ایک ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتے ہو جس میں ہموار میدان بھی ہیں جن کے اوپر تم عالیشان قصر اور آرام دہ مکانات بنا سکتے ہو نیز اس میں پہاڑی علاقے بھی ہیں جن کے دامن میں تم مضبوط مکانات تراش سکتے ہو (جو سخت موسم میں ، سردیوں کے زمانے میں تمہارے کام آسکتے ہیں (تتخذون من سھولھا قصورًا وتنحتون الجبال بیوتا) ۔

اس تعبیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ (قوم عاد) سردی اور گرمی میں اپنی سکونت کی جگہ بدل دیتے تھے ۔ فصل بہار اور گرمیوں میں وسیع اور پُر برکت میدانوں میں زراعت کرتے تھے اور پرندے اور چوپائے پالنے میں مشغول رہا کرتے تھے اس وجہ سے وہ وہاں خوبصورت اور آرام دہ مکانات بناتے تھے اور جب موسم سرما آجاتا تھا اور اناج کاٹ لیتے تھے ، تو اپنے ان گھروں میں چلے جاتے تھے جو انہوں نے پہاڑوں پر تراش کر بنائے تھے اور یہ مکانات انہیں سیلابوں اور طوفانوں سے محفوظ رکھتے تھے ۔ یہاں وہ اطمینان سے سردی کے دن گزار دیتے تھے [1]

---

[1] یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پہاڑی علاقوں میں گرمیوں کے زمانہ میں جایا جاتا ہے ، سیلاب بھی زیادہ تر گرمیوں میں ہی آتے ہیں ، معلوم نہیں اس تقسیم بندی کی کیا ضرورت درپیش ہوئی کہ گرمیوں میں وہ میدانوں میں اور سردیوں میں پہاڑوں پر رہیں جبکہ آیت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں ہے ، آیت کا مفاد تو یہ ہے کہ وہ دونوں طرح کے مکانات رکھتے تھے جب چاہتے میدانی قصروں میں رہتے تھے اور جب چاہتے تھے پہاڑوں میں چلے جاتے تھے ۔ (مترجم)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خداوندکریم کی ان سب نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو (فاذکروا آلآء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔[1]

یہاں پر ہمیں پھر یہ ملتا ہے کہ سردار اور ثروتمند، خوش ظاہر اور بد باطن لوگ جنہیں لفظ "ملاء" (آنکھوں میں سما جانے والے) سے تعبیر کیا گیا ہے، انہوں نے اس عظیم پیغمبر کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کے خلاف ایک اچھا خاصا گروہ ان لوگوں کا تھا جو خوش فکر و پاک دل تھے اور ہمیشہ مذکورہ سرداروں کی اسیری میں تھے (یعنی ان کے مزدور تھے)، اور انہوں نے حضرت "صالح" کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اور وہ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرداروں کی مخالفت شروع کر دی، لہٰذا جیسا کہ قرآن کہتا ہے ان سرداروں اور متکبّر افراد نے ان غریب لوگوں (مستضعفین) سے جو ایمان لا چکے تھے یہ کہا: آیا واقعاً تمہیں یہ علم ہے کہ صالح خدا کی جانب سے ہماری ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں (قال الملأ الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم اتعلمون ان صالحا مرسل من ربہ)۔

اس سوال سے ان کا منشا کوئی حق کی جستجو نہ تھا بلکہ دراصل وہ اس طرح مومنین کے دلوں میں شک و شبہ ڈالنا چاہتے تھے اور ان کی قوت ارادی کو کمزور کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح وہ پہلے سرمایہ داروں کے مطیع اور فرمانبردار تھے اسی طرح رہیں اور حضرت صالحؑ کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیں۔

لیکن جلد ہی انہیں ایسا قطعی جواب ملا جو تابعین حضرت صالحؑ کے قوی ارادہ کی حکایت کرتا ہے، انہوں نے کہا: صرف یہی نہیں کہ ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالحؑ خدا کے فرستادہ ہیں بلکہ ہم تو ان کی پیغمبری پر ایمان بھی لا چکے ہیں (قالوآ انا بمآ ارسل بہ مؤمنون)۔

یہ جواب سُن کر بھی متکبّر اور مغرور افراد خاموش نہ ہوئے بلکہ مومنین کے ارادے کو متزلزل کرنے کے لیے انہوں نے دوبارہ کہا: ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو (قال الذین استکبروآ انا بالذی اٰمنتم بہ کافرون)۔

چونکہ وہ لوگ (متکبّرین) اپنی ظاہری قوت و شوکت کی وجہ سے عام لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے لیے نمونۂ عمل تھے، لہٰذا انہوں نے خیال کیا کہ اس مرتبہ بھی لوگ ان کی

---

[1] "تعثوا" کا مادہ "عثی" ہے جس کے معنی ہیں فساد پیدا کرنا مگر مادہ فساد، زیادہ تر فساد اخلاقی کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ مادہ "عیث" مفاسدِ حسّی و ظاہری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں جملہ "لا تعثوا" کے بعد "مفسدین" تاکید کے لیے ہے کیونکہ دونوں کلمے ہم معنی ہیں۔

پیروی کریں گے اور اس اظہار کفر و بے ایمانی میں ان کا ساتھ دیں گے، مگر جلد ہی ان کو پتہ چل گیا کہ وہ کس خام خیالی میں مبتلا ہیں انہوں نے دیکھا کہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے لوگوں کی شخصیت میں انقلاب آگیا ہے اور اب وہ استقلالِ فکری اور قوی ارادہ کے مالک بن گئے ہیں۔

یہاں پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ آیات میں بے ایمان لوگوں کو "مستکبرین" کے عنوان سے اور زحمت کش، محنتی اور با ایمان طبقہ کو "مستضعفین" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلی قسم کے لوگ اپنے کو سب سے بہتر خیال کرتے تھے اور اپنے زیردست افراد کے انہوں نے حقوق غصب کر لیے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا استیصال کر کے وہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ان کو آج کی اصطلاح میں طبقۂ "استثمار گر" (وسائل لوٹنے والا) کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے طبقہ کو "استثمار شوندہ" (جس کے وسائل اور صلاحیتوں کا استحصال کیا گیا ہو) کہا جا سکتا ہے۔

جب خود خواہ و متکبر تُرد تند لوگ مومن افراد کے پائے استقلال کو نہ ڈگمگا سکے اور ان کو اس معاملہ میں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، دوسری طرف انہوں نے یہ دیکھا کہ اس اونٹنی کی وجہ سے جو حضرت صالحؑ کا معجزہ شمار ہوتی تھی، ان کی سم پاشیاں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں، تو انہوں نے اس ناقہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا اور اسے قتل کرنے سے پہلے "انہوں نے اس کو پے کر دیا اس کے بعد اسے جان سے مار ڈالا اس طرح انہوں نے خدا کے فرمان سے سرکشی کی" (فعقروا الناقۃ وعتوا عن امر ربھم)[1]

انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس کے بعد وہ حضرت "صالحؑ" کے پاس آئے اور اعلانیہ ان سے کہنے لگے: اگر تم واقعاً خدا کے فرستادہ ہو تو جتنی جلد ہو سکے عذاب الٰہی لے آؤ (وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین)۔

یعنی ہم کو ذرا بھی تمہارے ڈرانے سے خوف لاحق نہیں ہوا ہے کیونکہ تمہاری یہ سب دھمکیاں بے بنیاد ہیں ان باتوں سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت صالحؑ اور دیگر مومنین کی قوتِ ارادی کمزور پڑ جائے۔

جب انہوں نے اپنی سرکشی اور نافرمانی کو آخری حد تک پہنچا دیا اور ایمان قبول کرنے کی آخری کرن بھی ان کے وجود میں خاموش ہو گئی تو اللہ نے اس قانون کے مطابق کہ وہ ہمیشہ انتخاب کرتا رہتا ہے اور فاسد و مفسد کو فنا کر کے ان کی جگہ بہتر افراد کو دیتا ہے، اللہ کی سزا نے ان کو آ لیا اور "ایک ایسا زلزلہ رونما ہوا جس نے ان کے تمام قصروں اور پتھر کے بنے ہوئے مکانوں کو ہلا کر مسمار کر دیا۔ چشم زدن میں ان کی زرق

---

[1] اونٹ یا گھوڑے کو "پے کرنے" سے مطلب یہ ہے کہ اس کے پیر کے پیچھے جو پٹھا ہوتا ہے اس کو کاٹ دیا جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا اور زمین پر گر جاتا ہے، پھر کسی قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔

برق زندگی کے چراغ بجھ گئے۔ صبح کے وقت صرف ان کے بے جان جسم ان کے مکانوں میں باقی رہ گئے تھے (فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جاثمین)۔

"جاثم" دراصل مادہ "جثم" (بروزن خشم) سے ہے، جس کے معنی دو زانو بیٹھنے اور ایک ہی جگہ کھڑے رہنے کے ہیں۔ بعید نہیں کہ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ وہ لوگ زلزلہ کے وقت خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے، زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس کرتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، پھر اس کے بعد حادثے نے انہیں اٹھنے کی بھی مہلت نہ دی اور خوف کی وجہ سے یا دیواروں کے گرنے کی وجہ سے یا بجلی گرنے سے جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

قوم ثمود کو کس طرح موت آئی؟

یہاں پر ایک سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت میں ہے کہ ان کی فنا کا سبب زلزلہ تھا لیکن سورہ حٰم السجدہ کی آیت ۱۳ میں ہے کہ بجلی کی وجہ سے وہ نابود ہوئے۔ جبکہ سورہ حاقہ کی آیت ۵ میں ہم پڑھتے ہیں :

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ؕ

یعنی قوم ثمود ایک تباہ کن آفت کی وجہ سے ہلاک ہوئی۔

کیا ان تعبیروں میں کوئی تنافی یا تضاد پایا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ کہ تینوں اسباب کی بازگشت ایک چیز کی طرف ہے، یا یہ کہا جائے کہ تینوں آپس میں لازم ملزوم ہیں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خطہ میں زلزلہ بجلی گرنے کی وجہ سے آتا ہے، یعنی بجلی گرتی ہے اس کے بعد زلزلہ آجاتا ہے، لیکن "طاغیۃ" اس موجود کے معنی میں ہے جو اپنی حد سے تجاوز کرے، یہ زلزلہ کے لیے بھی صحیح ہے اور بجلی کے لیے بھی۔ بنابریں ان آیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اس کے بعد صالحؑ نے ان سے منہ پھیر لیا اور ان سے کہا: میں نے اپنے پروردگار کی رسالت (پیغام رسانی) کا حق ادا کر دیا، اور جو کہنا چاہیئے تھا وہ تم سے کہہ دیا، میں نے تمہاری نصیحت اور خیر خواہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، لیکن (بات یہ ہے کہ) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے" (فتولٰی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالۃ ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین)۔

یہاں پھر ایک سوال پیش آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت صالحؑ نے یہ گفتگو جو کی ہے وہ ان (قوم ثمود) کی نابودی کے بعد تھی یا یہ گفتگو ان کے انجام سے قبل اتمام حجت کے طور پر تھی، اگرچہ قرآن میں اس کا ذکر ان کے مرنے کو بیان کرنے کے بعد کیا گیا ہے؟

دوسرا احتمال اس خطاب کے ظاہر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس وقت زندہ تھے لیکن پہلا احتمال بھی زیادہ بعید نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے افراد کی عبرت کے لیے اس قسم کی گفتگو مرنے والوں کی روح کو مخاطب کرکے کی جاتی ہے۔ جیساکہ حضرت علی علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ آپؑ نے جنگِ جمل کے بعد طلحہ کے لاشہ کے پاس کھڑے ہوکر فرمایا:

اے طلحہ! تم نے اسلام میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں لیکن افسوس یہ کہ تم نے ان کو اپنے لیے محفوظ نہ کیا۔

نیز نہج البلاغہ کے آخر میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جب جنگِ صفین سے پلٹ رہے تھے تو آپؑ نے دروازہ کوفہ کی پُشت پر قبرستان کی طرف منہ کرکے پہلے ارواح رفتگان پر سلام کیا بعد ازاں ان سے فرمایا:

تم اس قافلہ کے آگے آگے چلے گئے ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔

(۸۰) وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○

(۸۱) اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○

(۸۲) وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○

(۸۳) فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖؗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○

(۸۴) وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ

عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۰۔ اور (یاد کرو کہ) جب لوط نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بُری بات کرتے ہو جس کو تمام جہانوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔

۸۱۔ کیا تم تسکینِ شہوت کے لیے مَردوں کی طرف جاتے ہو، نہ کہ عورتوں کی طرف ؟ تم تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

۸۲۔ لیکن ان کی قوم کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ ان (لُوط اور ان کے ماننے والوں) کو اپنی آبادی سے باہر نکال دو، یہ لوگ اپنے کو پاک ظاہر کرنے والے ہیں۔

۸۳۔ (جب بات یہاں تک پہنچی تو) ہم نے ان (لوطؑ) کو اور ان کے خاندان کو نجات دی سوائے ان کی زوجہ کے کہ وہ باقی ماندہ افراد میں سے تھی۔

۸۴۔ (پھر اس کے بعد) ہم نے ان پر خوب بارش کی (پتھروں کی بارش تاکہ وہ ان کو نیست و نابود کر دے) اب دیکھو مجرموں کا انجام کیا ہوا۔

تفسیر

قومِ لُوط کا دردناک انجام

ان آیاتِ قرآنی میں ایک منظر ایک اور پیغمبر کی سرگزشت کا پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ آیات کا مقصد ہے اس کی مزید تکمیل کی گئی ہے۔ یہ حضرت "لوط" علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت ہے۔ یہ ماجرا قرآن کی چند سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ ہائے "ہود"، "حجر"، "شعراء"، "انبیاء"، "نمل" اور "عنکبوت"۔

اس جگہ پانچ آیتوں میں حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی گفتگو کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ " اعراف " میں ان داستانوں کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انبیاء اور ان کی قوموں کے مابین جو مخالفتیں رہیں اور جو ان میں گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ پیش کیا جائے ۔ لیکن ان قصّوں کی تفصیل کو دوسری سُورتوں کی تفصیل کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے (ہم بھی انشاء اللہ ان لوگوں کا مفصّل قصّہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بیان کریں گے) ۔

اب زیر بحث آیات کی تفسیر کی جانب توجہ مبذول کرتے ہیں ۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : یاد کرو پیغمبر لُوط کو جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا : کیا تم ایسا ننگین اور شرمناک فعل انجام دیتے ہو کہ جہانوں میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا (اتأتون الفاحشة ما سبقکم بھا من احد من العالمین) ۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عمل بذاتِ خود ایک انتہائی بُرا اور شرمناک فعل تو ہے ہی ، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ وہ بُرا کام ہے جو تم سے پہلے کسی قوم و ملت نے نہیں کیا ، اس وجہ سے اس کی بُرائی کئی گُنا بڑھ گئی ہے کیونکہ کسی بُرے طریقے کی بنیاد رکھنا قریب کے زمانے میں اور دُور کے زمانے میں آنے والے افراد کو اس بُرے طریقے پر چلنے کی دعوت دینے کے مترادف ہے ۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عملِ بد تاریخی حیثیت سے قوم لوط تک منتہی ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ پیسے والے تھے جو اپنی زندگی ہُوا پرستی اور شہوت رانی میں گزارتے تھے جس کی تفصیل انشاء اللہ مذکورہ بالا سورتوں کی تفسیر میں بیان کی جائے گی ۔

اس کے بعد والی آیت میں اس گناہ کی تشریح کی گئی ہے جس کو اب تک سربستہ طور سے بیان کیا گیا تھا ، ارشاد ہوتا ہے : تم لوگ شہوت کے ساتھ مردوں کی طرف جاتے ہو اور عورتوں کو تم نے چھوڑ رکھا ہے (انکم لتأتون الرجال شھوة من دون النساء) ۔

بھلا اس سے بدتر اور کونسا کام ہو سکتا ہے کہ توالد و تناسل کا واحد ذریعہ یعنی ۔ مرد عورت کا ملاپ اس کو انسان ترک کر دے ، اور " جنس موافق " کے پیچھے پڑ جائے ، یہ ایسا کام ہے جو اصولی طور پر نادرست خلاف عقل اور بدن انسانی کی ساخت کے منافی اور روح کے خلاف ہے' نیز انسان کی اس فطرتِ اولیٰ کے خلاف ہے جس میں ابھی کوئی تغیّر واقع نہیں ہُوا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کی جو غرض و غایت ہے وہ فوت ہو کر رہ جائے گی دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اس فعل کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہش کو جھوٹے طریقے سے پورا کرے اور نسلِ انسانی کو قطع کرنے کا سبب بن جائے ۔ اس کے بعد آیت میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : تم لوگ اسراف کرنے والی قوم ہو (یعنی تم نے حدود

الٰہی سے اپنے قدم آگے بڑھا لیے ہیں اور گمراہی و سرکشی کے میدان میں فطرت کے حدود حدود کو چھوڑ کر بھٹک گئے ہو (بل انتم قوم مسرفون)۔

ممکن ہے لفظ "مسرفون" سے اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ وہ لوگ نہ صرف جنس کے بارے میں مسرف تھے بلکہ دیگر چیزوں میں بھی ان کی یہی حالت تھی۔

یہاں پر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ پہلی آیت میں مطلب کو سربستہ بیان کیا تھا، اس کے بعد اس آیت میں اسے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ علم بلاغت کے فنون میں سے ایک فن ہے کہ جب بھی کسی اہم بات کو بیان کرنا ہوتا ہے اسے اسی طرح بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی طرف ذہنِ انسانی اچھی طرح متوجہ ہو جائے مثلاً "کوئی شخص بہت بُرا کام انجام دے تو پہلے اس کا بیدار مغز اور آگاہ سرپرست معاملے کی اہمیت جتلانے کے لیے کہتا ہے۔ "تُونے بہت بُری بات کی" پھر آخر میں جا کر اس پر سے پردہ اٹھائے گا اور اس کام کی تشریح کرے گا۔ اس طرح کا طرزِ بیان دراصل طرفِ مقابل کے ذہن کو تدریجاً اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ معاملے کی اہمیت کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی سمجھ میں یہ آجائے کہ جو بُرا کام اس نے کیا ہے وہ کتنا سنگین ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں قومِ لُوط کی غیر منطقی اور ضد آمیز گفتگو کا جواب دیا گیا ہے: ان لوگوں کے پاس اس ہمدرد، خیر خواہ اور مصلح پیغمبر کی بات کا کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے بڑی بدتمیزی اور غصے سے کہا کہ لوطؑ اور ان کے پیروؤں کو اپنے شہر سے باہر نکال دو، ان کا گناہ کیا ہے؟ ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ یہ پاک لوگ ہیں اور گناہ نہیں کرتے (وما کان جواب قومہٖ الآ ان قالوآ اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون)۔

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک کثیف اور گنہگار گروہ نے پاکدامن افراد کو ان کی پاکدامنی کے جُرم میں اپنی سوسائٹی سے نکال دینے کی کوشش کی۔ یہ لوگ ایسے پاک افراد کو اپنی ہوس رانی اور شہوت پرستی کے لیے سدِ راہ دیکھتے تھے اس بنا پر ان کی پاکدامانی اس گروہ کے لیے بجائے خوبی کے ان کی کمزوری شمار ہوتی تھی۔

"انھم اناس یتطھرون" اس جملے میں ایک یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ قومِ لُوط کا منشا یہ تھا کہ حضرت لُوط اور ان کے پیروکاروں کو تظاہر اور ریاکاری کے ساتھ متہم کریں، جیسا کہ ہم نے اکثر اشعار وغیرہ میں سُنا ہے کہ بعض گنہگار اور شرابخوار افراد مقدس اور پاک بندوں کو دکھاوے اور ریاکاری کے ساتھ متہم کرتے ہیں اور بزعم خود اپنے "شراب آلودہ چیتھڑوں" کو "زاہد کے مصلیٰ" سے بہتر خیال

کرتے ہیں، اور یہ ایک جھوٹا برائت نامہ ہے جو وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے لیے لکھ لیتے ہیں۔

اگر مذکورہ بالا تین آیات پر نظر ڈالی جائے تو ہر انصاف پرور شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ قوم لوط کے افراد بہت بگڑے ہوئے لوگ تھے جنھوں نے ایک مصلح بزرگ کی تمام نصیحتوں اور منطقی دلیلوں اور جملہ خیر خواہیوں کو نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ ان کا جواب اپنی دھمکیوں اور زور نمائی اور تہمتوں سے دیا۔ لہٰذا خدا نے بعد والی آیت میں فرمایا: جب بات یہاں تک پہنچی تو ہم نے لُوطؑ، ان کے پیرؤوں اور ان کے خاندان میں جو واقعی پاکدامن تھے کو نجات دے دی سوائے ان کی بیوی کے کہ اس کو تباہ ہونے والی قوم میں عذاب کا مزا چکھنے کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ وہ عورت بھی عقیدہ اور مذہب کے لحاظ سے ان لوگوں کی ہم خیال تھی (فانجیناہ واھلہٗ الا امرأتہ کانت من الغابرین[1])۔

بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ لفظ "اہل" اگرچہ زیادہ تر نزدیک کے عزیزوں پر بولا جاتا ہے مگر آیت مذکورہ میں حضرت لوطؑ کے حقیقی پیرؤوں پر اس کا اطلاق ہے یعنی وہ بھی آپ کے خاندان اور اہل میں محسوب ہوتے تھے، لیکن سورہ "ذاریات" کی آیت ۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے آپکے خاندان والوں اور نزدیک کے عزیزوں کے اور کوئی شخص آپ پر ایمان نہیں لایا تھا، بنا بریں لفظ "اہل" اپنے اسی حقیقی معنی یعنی خاندان والوں پر ہی استعمال ہوا ہے۔

سورہ "تحریم" کی آیت ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت "لوطؑ" کی یہ زوجہ ابتدا میں ایک اچھی عورت تھی لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور اس نے حضرت لوطؑ کے ساتھ خیانت کرکے قوم لوطؑ کی جرأت بڑھائی۔

اس آیت کے آخر میں بہت مختصر لیکن ایک معنی خیز اشارہ اس قوم کے لیے وحشتناک عذاب کی طرف کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے اوپر بارش برسائی (لیکن کیسی بارش؟! پتھروں کی بارش جس نے ان کو کچل کر تہس نہس کردیا) (وامطرنا علیھم مطرًا)۔

اگرچہ آیت مذکورہ میں اس بارش کی نوعیت بیان نہیں کی گئی لیکن چونکہ اس کو لفظ "مطرا" (ایک بارش) سے تعبیر کیا گیا ہے جو ایک سربستہ لفظ ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی اور عام بارش نہ تھی بلکہ پتھروں کی بارش تھی جیساکہ سورۂ ہود کی آیت ۸۲ میں بیان ہوا ہے۔

"اب دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا! (فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین)۔

---

[1] "غابر" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ساتھی چلے جائیں اور وہ پیچھے رہ جائے جیساکہ حضرت لوطؑ کا خاندان ان کے ہمراہ چلا گیا اور ان کی بدبخت زوجہ عذاب کا مزہ چکھنے کے لیے شہر میں باقی رہ گئی۔

اگر چہ اس آیت میں روئے سخن پیغمبر (حضرت لوطؑ) کی طرف ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مقصد یہ ہے کہ تمام انسان اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

اس قوم کا مفصل احوال، اسی طرح لواطہ اور ہم جنس پرستی کے گوناگوں مضرات اور شریعت کی رُو سے اس عمل شنیع کی سزا انشاء اللہ سورہ ہُود اور حجر میں بیان کی جائے گی۔

(۸۵) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ

(۸۶) وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○

(۸۷) وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ○

ترجمہ

(۸۵) اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم خدا کی پرستش کرو کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے پروردگار

کی جانب سے روشن دلیل آچکی ہے۔ بنا بریں جو پیمانہ اور ترازو کا حق ہے اسے ادا کرو، اور لوگوں کے مالوں میں سے کچھ کم نہ کرو اور جبکہ (ایمان اور دعوتِ انبیاء کی وجہ سے) روئے زمین پر اصلاح ہوچکی ہے، اس میں فساد نہ کرو۔ یہ تمہارے واسطے بہتر ہے اگر تم باایمان ہو۔

(۸۶) اور ہر راستے پر نہ بیٹھو تاکہ (باایمان لوگوں کو) دھمکیاں دو اور مومنوں کو راہِ راست سے روکو اور (طرح طرح کے شبہے ڈال کر) اس راہ کو ٹیڑھا دکھلاؤ، اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم بہت تھوڑے تھے اس نے تم کو کثرت عطا کی اور دیکھو کہ مفسدوں کا کیا انجام ہوا!۔

(۸۷) اور جو کچھ ہم نے بھیجا ہے اس پر اگر ایک گروہ ایمان لایا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لایا تو اس پر صبر کرو تاکہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر

مدین میں حضرت شعیبؑ کی رسالت

ان آیات میں اقوام گزشتہ کی سرگزشت اور انبیائے الٰہی کی ان سے کشمکش کا پانچواں حصہ یعنی شعیب علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شعیبؑ جن کا سلسلہ نسب تاریخ کی بنا پر چند واسطوں سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے، شہر "مدین" والوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ "مدین" شام کا ایک شہر تھا جس میں تجارت پیشہ اور مالدار لوگ رہتے تھے، لیکن ان کے درمیان بُت پرستی، کم ناپنا تولنا رائج تھا۔

اس عظیم پیغمبر نے اپنی قوم کے خلاف جو جہاد کیا ہے اس کی روئیداد قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں آئی ہے خاص کر سورۂ ہود اور سورۂ شعراء میں اس کا تذکرہ مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہم بھی قرآن

کی پیروی کرتے ہوئے انشاء اللہ سورۂ "ہود" کے ذیل میں حضرت شعیبؑ کے قصہ کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس جگہ پر اس قصّے کا صرف ایک خلاصہ مندرجہ بالا آیات کے مطابق پیش کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں خدا فرماتا ہے: ہم نے اہلِ "مدین" کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا (والی مدین اخاھم شعیبًا)۔

بعض مفسرین جیسے علّامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں بیان کیا ہے کہ "مدین" دراصل حضرت ابراہیمؑ کے ایک فرزند کا نام تھا، چونکہ آپ کی اولاد پوتے نواسے ایک سرزمین میں جو شام کے راستہ میں تھی رہتے تھے اس لیے اس زمین کا نام بھی "مدین" پڑ گیا۔

اب رہا یہ کہ حضرت شعیبؑ کو "اخاھم" (بھائی) کے لفظ سے کیوں ذکر کیا، اس کی وجہ ہم نے اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں بیان کی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ حضرت "شعیبؑ" نے اپنی دعوت کو دیگر پیغمبروں کی طرح مسئلہ توحید سے شروع کیا اور "وہ پکارے اے میری قوم! خدائے یکتا کی پرستش کرو کہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے" (قال یٰقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ)۔

انہوں نے کہا کہ یہ حکم علاوہ براین کہ عقل کا فیصلہ ہے، "اس کی حقانیت پر خدا کی طرف سے روشن دلیل بھی آچکی ہیں" (قد جاءتکم بینۃ من ربکم)۔

اگرچہ آیاتِ مذکورہ میں اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے کہ یہ بیّنہ (روشن دلیل) کیا تھی مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضرت شعیبؑ کے معجزات ہیں۔

توحید کی طرف دعوت دینے کے بعد، حضرت شعیبؑ نے ان کی اجتماعی، اخلاقی اور اقتصادی برائیوں سے ٹکر لی۔ سب سے پہلے انہوں نے چاہا کہ انہیں کم ناپ تول، دھوکا دہی اور دیگر خیانتوں سے روکیں جن میں وہ مبتلا تھے، چنانچہ انہوں نے کہا: اب جبکہ خدا کا راستہ تمہارے سامنے آشکار ہو چکا ہے تو "پیمانہ اور وزن کا حق ادا کرو اور لوگوں کے حقوق میں سے کم نہ کرو" (فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءھم)[1]

یہ بات واضح ہے کہ ہر طرح کی خیانت اور ہیرا پھیری اگر باہمی معاملات میں سرایت کر جائے تو اس سے وہ باہمی اعتماد و اطمینان متزلزل ہو جاتا ہے جس پر اقتصاد کی پوری عمارت قائم و برقرار ہے اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں ایسے نقصانات مرتب ہوتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان کے اس بڑے عیب پر انگلی رکھی اور اسے دُور کرنا چاہا۔

اس کے بعد ان کے ایک اور عیب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: روئے زمین پر جبکہ

---

[1] "بخس" کے معنی حقوق کو کم کرنے اور اعتدال سے اس طرح نیچے آنے کے ہیں کہ ظلم و ستم کا موجب بن جائے۔

ایمان اور انبیائے الٰہی کی کوششوں سے اصلاح ہو چکی ہے، فساد برپا نہ کرو (ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا)۔

یہ بات مسلّم ہے کہ فساد پھیلانے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، چاہے وہ فساد اخلاقی ہو یا بے ایمانی ہو یا بے امنی ہو بلکہ اس سے الٹا تباہی پھیلتی ہے، لہٰذا آیت کے آخر میں اس جملے کا اضافہ فرمایا گیا ہے:

یہ تمہارے نفع کی بات ہے اگر تم صاحبانِ ایمان ہو (ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین)۔

گویا اس جملہ - ان کنتم مؤمنین - کے اضافہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اجتماعی اور اخلاقی فرامین تمہارے حق میں اس وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ تمہارے دل نورِ ایمان سے روشن و منور ہو جائیں، لیکن اگر تمہارے دل ایمان سے خالی ہوں اور ان فرامین کو محض دنیاوی مصالح کی بنا پر مان لو تو اس سے کوئی دوام و ثبات میسر نہ ہو گا۔

اس کے بعد کی آیت میں حضرت - شعیب - کی چوتھی نصیحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: تم لوگوں کے راستے پر مت بیٹھو اور نہ ڈراؤ دھمکاؤ اور خدا کے راستے میں سدِّ راہ نہ بنو، اور ان کے دلوں میں شبہ ڈال کر حق کی صراطِ مستقیم کو ان کی نگاہ میں ٹیڑھی اور کج ظاہر نہ کرو (ولا تقعدوا بکل صراط توعدون وتصدون عن سبیل اللہ من اٰمن بہ وتبغونھا عوجًا)۔

جو لوگ ایمان قبول کرنا چاہتے تھے انہیں قومِ شعیب کے گمراہ لوگ کس طرح ڈراتے دھمکاتے تھے؟ مفسّرین نے اس بارے میں متعدد احتمال پیش کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کو قتل کی دھمکی دیتے تھے، بعض نے کہا ہے کہ وہ باایمان افراد کا مال لُوٹ لیتے تھے، لیکن آیت کے بقیہ جملے سے پہلے معنی مطابقت رکھتے ہیں۔

پانچویں آیت کے آخر میں حضرت شعیب کی اس نصیحت کا ذکر ہے جس میں انہوں نے چاہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو یاد کریں کہ تاکہ ان میں شکرگزاری کا جذبہ بیدار ہو، ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، خدا نے تمہاری جمعیت کو زائد کیا اور تم کو "مین پاور" (افرادی قوت) عطا کی (واذکروا اذ کنتم قلیلًا فکثرکم)۔

اس کے بعد خوب اچھی طرح سے دیکھو کہ مفسدوں کا انجام کیا ہوا، لہٰذا ان کے نقشِ قدم پر نہ چلو (وانظروا کیف کان عاقبۃ المفسدین)۔

یہاں پر ایک بات اور ضمنی طور پر یہ معلوم ہوئی کہ آبادی کی کثرت کسی معاشرے کی عظمت، قدرت اور ترقی کا سبب بھی ہو سکتی، بشرطیکہ ایک سوچے سمجھے نظام کے ماتحت مادّی و معنوی حیثیت سے ان کی زندگی استوار ہو، جبکہ موجودہ زمانے میں بہت زیادہ پراپیگنڈا کے ذریعہ اس بات کو لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے نسل اور تعداد کو کم کریں۔

❁ ❁ ❁

آخری آیت در اصل قوم شعیب کے بعض مومنین اور بعض کافروں کی ایک بات کا جواب ہے کیونکہ بعض مومن افراد جبکہ ان پر کافروں کا دباؤ پڑتا تھا تو وہ فطری طور پر اپنے وقت کے پیغمبروں سے یہ کہہ اٹھتے تھے کہ ہم کب تک ان کافروں کا ظلم سہتے رہیں گے؟ اس کے ساتھ ہی جو لوگ مخالف تھے ان کی جرأتیں بھی بڑھتی جاتی تھیں یہاں تک کہ وہ بھی یہ کہہ دیتے تھے کہ "اگر تم واقعی خدا کے فرستادہ نبی ہو تو ہماری اتنی مخالفت کے باوجود ہم کو اللہ کی طرف سے کسی قسم کا گزند کیوں نہیں پہنچتا"۔

حضرت شعیبؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: اگر تم میں سے کچھ لوگ اس چیز پر ایمان لے آئے ہیں جو میں اللہ کی طرف سے لایا ہوں اور کچھ ایمان نہیں لائے تو اس سے نہ تو کافروں کو غرور لاحق ہو اور نہ مومنوں کو مایوسی، تم صبر سے کام لو تاکہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے یعنی وہ آئندہ اپنا آخری فیصلہ سنا دے گا کہ کون لوگ حق پر ہیں اور کون باطل پر (وان کان طآئفة منکم اٰمنوا بالذی ارسلت بہ وطآئفة لم یؤمنوا فاصبروا حتّٰی یحکم اللہ بیننا وھو خیر الحاکمین)۔

(۸۸) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لَنُخْرِجَنَّکَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَکَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ کُنَّا کٰرِھِیْنَ ۝

(۸۹) قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنْھَا ؕ وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْھَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ۝

ترجمہ

(۸۸) اس (شعیبؑ) کی قوم کے طاقتور اور متکبر لوگوں نے کہا: اے شعیب ہم قسم

کھاتے ہیں کہ تم کو اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں ان کو ہم اپنی آبادی سے باہر نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہمارے مذہب کی طرف پلٹ آؤ، (اس پر) انہوں نے کہا: (تم چاہتے ہو کہ ہم کو پلٹاؤ) چاہے ہم اسے ناپسند بھی کرتے ہوں؟

(۸۹) اگر ہم تمہارے مذہب کی طرف پلٹ آئیں، جبکہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے، تو گویا ہم نے اللہ پر بہتان باندھا ہے، اور ہمارے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ ہم اس مذہب کی طرف دوبارہ پلٹ آئیں اِلاّ یہ کہ خود ہمارا رب یہ چاہے، ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز پر محیط ہے، ہم نے صرف اللہ پر توکل کیا ہے، اے ہمارے پروردگار! تُو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر کہ تُو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت "شعیبؑ" کے منطقی استدلال کے مقابلے میں ان کی قوم کے ردِّ عمل کو بیان کیا گیا ہے اور چونکہ ان کی قوم کے طاقتور اور متکبّر افراد ظاہری حیثیت سے بہت با اثر تھے، اس بنا پر ان کا ردِّ عمل بھی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ شدید تھا۔ لہٰذا انہوں نے دُنیا کے دوسرے زوردار متکبّر افراد کی طرح اپنی قوت و جماعت کے بل بوتے پر حضرت شعیبؑ اور ان کے پیروؤں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ان (شعیبؑ) کی قوم کے طاقتور اور مغرور افراد نے ان سے کہا کہ ہم قسم کھا کر یہ بات کہتے ہیں کہ ہم تم کو اور تمہارے ماننے والوں کو اپنی سوسائٹی سے باہر نکال دیں گے، اِلاّ یہ کہ جتنا بھی جلد ممکن ہو ہمارے مذہب کی جانب پلٹ آؤ (قال الملا الذین استکبروا من قومہٖ لنخرجنك یاشعیب والذین اٰمنوا معك من قریتنآ اولتعودن فی ملتنا)۔

ممکن ہے اس آیت کے ظاہر سے کسی کو یہ توہّم ہو کہ شاید حضرت شعیبؑ بھی قبلاً بُت پرستوں کی صف میں شامل تھے، جب ہی تو کفّار نے یہ کہا کہ ہماری ملّت کی طرف پلٹ آؤ۔ جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ حضرت شعیبؑ دعوت و تبلیغ سے ان کی بُت پرستی کے بارے میں خاموش تھے

کیونکہ ابھی ان کو تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا، اس سے وہ (کفار) یہ خیال کرتے تھے کہ شعیبؑ بھی ان کی ملت پر ہیں حالانکہ پیغمبروں میں سے کوئی بھی بُت پرست نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر پیغمبر کی عقل اس کی پیغمبری سے قبل ہی اتنی کامل ہوتی ہے کہ وہ بُت پرستی جیسے احمقانہ اعمال ناشائستہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ کفار کا روئے سخن صرف حضرت شعیبؑ ہی کی طرف نہ تھا بلکہ یہ خطاب ان کے پیروؤں کے لیے بھی تھا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر انہی کے لحاظ سے ہو۔

مخالفین کی تہدید یہی نہ تھی بلکہ انہوں نے اس کے علاوہ دوسری دھمکیاں بھی دی تھیں جو حضرت شعیبؑ سے متعلق دیگر آیات میں مذکور ہیں اور ان سے متعلق جو بحث ہے وہ انشاء اللہ آگے آئے گی۔

حضرت شعیبؑ نے ان تمام باتوں اور تمام دھمکیوں کا جواب ایک بہت ہی مختصر، سہل اور سادہ لیکن منطقی جملے سے دیا، انہوں نے کہا: کیا تم ہم کو اپنے مذہب کی طرف اس حال میں لوٹانا چاہتے ہو کہ ہم اس کی طرف مائل نہ بھی ہوں (قال اولو کنّا کارھین)۔[1]

درحقیقت حضرت شعیبؑ یہ کہنا چاہتے تھے کہ آیا یہ مناسب ہے کہ تم اپنا عقیدہ زبردستی ہمارے اوپر ٹھونسو، اور وہ قانون جس کا بطلان ہم پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے اس کو طاقت کے زور سے ہم پر سوار کرو؟ پھر یہ کہ اگر ہم نے ایسا کیا بھی تو اس کا تم کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

اس کے بعد کی آیت میں حضرت شعیبؑ اپنی بات کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں: اگر ہم دوبارہ آئینِ بُت پرستی کی طرف پلٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے اور ہم اپنے کو دوبارہ اس تباہی کے گڑھے میں گرا دیں تو ہم نے گویا خدا پر افترا باندھا ہے (قد افترینا علی اللّٰہ کذبًا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجّٰنا اللّٰہ منھا)۔

یہ جملہ دراصل اس جملہ کی توضیح ہے جو قبل کی آیت میں حضرت شعیبؑ کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے بُت پرستی کے آئین کو جو چھوڑا ہے وہ از روئے ہوا و ہوس نہیں ہے اور نہ ہم نے اس معاملے میں کسی کی اندھی پیروی کی ہے بلکہ ہم نے اس عقیدہ کے بطلان کو دلائل سے سمجھا ہے اور توحید کے معاملے میں الٰہی فرمان کو جان و دل سے قبول کیا ہے، لہٰذا اگر اس حال میں ہم اس مسلکِ حق کو چھوڑ کر دوبارہ مشرک بن جائیں تو ایسا ہے کہ ہم نے دیدہ و دانستہ خدا پر بہتان باندھا ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ خدا ہم کو اس کی سزا دے گا۔

---

[1] اس جملے میں درحقیقت ایک محذوف مقدر ہے کیونکہ یہ جملہ اس طرح تھا: اترید وننا فی ملتکم ولو کنا کارھین؟

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں : یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہارے آئین کی طرف پلٹ آئیں اِلّا یہ کہ خدا خود یہ چاہے (وما یکون لنا ان نعود فیھا الّا ان یشاء اللہ ربنا)۔

حضرت شعیبؑ کا مقصد در حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر حال میں خدا کے فرمان کے تابع ہیں اور اس کے حکم سے ہم ذرہ برابر بھی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اب ہمارا تمہاری طرف پلٹنا کسی حالت میں ممکن نہیں ہے اِلّا یہ کہ خدا ہم کو پلٹنے کا حکم دے (اور وہ ایسا حکم کبھی نہیں دے سکتا کیونکہ) وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے لہٰذا ہرگز یہ ممکن نہیں کہ وہ اس چیز سے پلٹ جائے جس کا وہ ہم کو سختی سے حکم دے چکا ہے، کیونکہ حکم دے کر پشیمان وہ ہوتا ہے جس کا دائرۂ معلومات محدود ہو اور وہ دھوکا کھا جائے لیکن وہ کہ جس کا علم لامحدود ہے، کبھی غلطی نہیں کرتا، وہ اپنے فیصلہ پر تجدید نظر بھی نہیں کرتا (وسع ربنا کل شیء علمًا)۔

اس کے بعد ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ان کی دھمکیوں سے بالکل ہراساں نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے مؤقف پر مضبوطی سے قائم ہیں، حضرت شعیبؑ نے کہا : ہمارا بھروسہ صرف خدا پر ہے (علی اللہ توکلنا)۔

آخرکار، اپنا حُسنِ نیت ظاہر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ ان کی حقیقت پسندی اور صلح جوئی کا رُخ بھی اچھی طرح سے نمایاں ہو جائے تاکہ دشمن ان کے خلاف یہ الزام نہ لگائیں کہ وہ ہنگامہ پسند اور خواہ مخواہ انقلاب پرور انسان ہیں، انہوں نے کہا : اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان تُو ہی حق کے ساتھ فیصلہ کر، اور ہماری مشکلات کو دُور کر اور درِ رحمت ہم پر کھول دے کہ تو بہترین کھولنے والا ہے (ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین)۔

ابنِ عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں :

> مَیں اس آیت میں "فتح" کے معنی نہیں جانتا تھا، یہاں تک کہ مَیں نے ایک روز ایک عورت کو اپنے شوہر سے یہ کہتے سنا کہ وہ کہہ رہی تھی "افاتحک بالقاضی" یعنی تجھ کو فیصلہ کے لیے قاضی کے پاس لے چلوں گی، اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اس قسم کے مواقع پر "فتح" کے معنی فیصلہ اور حکومت کے ہیں (کیونکہ قاضی طرفین کے سلسلے کی گرہ کو کھول دیتا ہے)۔[1]

(۹۰) وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

---

[1] تفسیر منہج الصادقین۔

(۹۱) فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۚۖ

(۹۲) الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ۛۚ اَلَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِيۡنَ ○

(۹۳) فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ ۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ۠

ع

ترجمہ

(۹۰) ان (شعیبؑ) کی قوم کے اس گروہ نے کہا جو کافر ہو گئے تھے : اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم گھاٹے میں رہو گے ۔

(۹۱) پس زلزلے نے ان کو آلیا اور انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ ان کے بے جان بدن ان کے گھروں میں پڑے ہوئے تھے ۔

(۹۲) جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی (اس طرح نابود ہو گئے کہ) گویا ہرگز ان (گھروں) میں آباد نہ تھے جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی وہی گھاٹا اٹھانے والے تھے ۔

(۹۳) پس اس (شعیبؑ) نے ان لوگوں سے رُخ پھیر لیا اور کہا کہ اے میری قوم ! مَیں نے تم کو اپنے رب کی رسالت پہنچا دی تھی اور تم کو نصیحت (بھی) کی تھی ، پس (اس حال میں)، مَیں کافر قوم پر کیسے افسوس کروں !

تفسیر

حضرت شعیبؑ کے مخالفین نے ان کے تابعین کو بہکانے کے لیے جو کوششیں کیں پہلی آیت

میں ان کو بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے: قومِ شعیبؑ کے متکبر اور خود خواہ افراد، جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا، نے ان لوگوں سے کہا جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ شعیب کی تبلیغ سے متاثر ہو گئے ہیں کہ تم نے اگر شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً گھاٹے میں رہو گے (وقال الملأ الذین کفروا من قومہ لئن اتبعتم شعیبا انکم اذا لخاسرون)۔

گھاٹے سے ان کی مراد وہی دنیاوی اور مادّی گھاٹا تھا جو مومنوں کو حضرت شعیبؑ کی دعوت قبول کرنے کی وجہ سے ملنے والا تھا کیونکہ وہ ہرگز بُت پرستی کی طرف پلٹنے والے نہ تھے، لہٰذا ان کو زبردستی اس شہر اور آبادی سے نکال دیا جانا تھا، اس طرح ان کی املاک گھر بار سب چھٹ جاتے۔

نیز یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ خسارہ (گھاٹے) سے ان کا مقصد مادّی گھاٹے کے علاوہ معنوی گھاٹا بھی ہو، کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ ان کا آئینِ بُت پرستی ہی باعثِ نجات ہے نہ کہ شعیب کا آئین۔

جب ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا تو اپنی گمراہی کے علاوہ، دوسروں کو گمراہ کرنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ان کے ایمان لانے کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی، لہٰذا برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا قانونِ الٰہی حرکت میں آیا اور عذابِ الٰہی ان تک آ پہنچا، "ایک زبردست اور وحشتناک زلزلہ نے ان کو آلیا، جس کے نتیجے میں صبح کے وقت ان کے بے جان جسم ان کے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے" (فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جاثمین)۔

اسی سورہ کی آیت ۸۰ میں "جاثمین" کی تفسیر گذر چکی ہے نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان کی نابودی کے مختلف اسباب و علل جو بیان کیے گئے ہیں ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مثلاً حضرت شعیبؑ کی قوم کے بارے میں اس آیت میں ہے کہ "زلزلہ" سے ہلاک ہوئی، ہود ۹۴ میں ہے کہ "صیحہ آسمانی" (آسمانی آواز) سے ہلاک ہوئی۔ شعراء ۱۸۹ میں ہے کہ "ایک ہلاکت آفرین ابر کے سائبان کے ذریعہ ہلاک ہوئی۔ حالانکہ سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے، اور وہ یہ کہ ایک وحشتناک صاعقہ (بجلی) ایک تاریک ابر سے ان کی آبادی پر آگری، جس کے نتیجے میں (جیسا کہ اس موقع پر عام طور سے ہوا کرتا ہے) زمین میں زبردست زلزلہ آگیا جس کی وجہ سے ان کی ساری زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔

اس کے بعد اس وحشتناک زلزلہ کی تباہ کاریوں کو بعد والی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:-
جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا اس طرح نیست و نابود ہو گئے گویا کبھی ان گھروں میں زندگی بسر نہیں کرتے تھے! (الذین کذبوا شعیبا کان لم یغنوا فیھا)[1]

---

[1] "یغنوا" مادّہ "غنی" سے ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پذیر ہونے کے ہیں اور جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں فرمایا ہے کہ
(باقی اگلے صفحہ پر)

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ گھاٹا اٹھانے والے تھے مومن نہ تھے (الذین کذبوا شعیبا کانوا ھم الخاسرین)۔

گویا یہ دو جملے حضرت شعیبؑ کے مخالفوں کے اعتراض کا جواب ہیں کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ حضرت شعیبؑ کے ماننے والے اگر اپنے پہلے دین پر نہ لوٹے تو وہ ان کو اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ان کو اس طرح نابود کر دیا جیسے وہ وہاں پر آباد ہی نہ تھے، نکالنے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

نیز یہ کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ حضرت شعیبؑ کے ماننے والے گھاٹا اٹھائیں گے اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ اب دیکھو کون زیاں کار ہے تم یا تابعین شعیبؑ!

اس کے بعد آخری آیت میں حضرت "شعیبؑ" کی آخری بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ "انہوں نے گنہگار قوم سے منہ پھیر لیا اور کہا کہ میں نے اپنے پروردگار کی رسالت پہنچا دی اور کافی نصیحت بھی کی اور کسی قسم کی خیر خواہی سے دریغ نہیں کیا" (فتولی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالات ربی ونصحت لکم)۔

جب حالات یہ ہوں تو اس کافر قوم کے انجام بد پر مجھے کوئی افسوس نہیں کیونکہ ان کی ہدایت کے لیے میں نے اپنی آخری کوشش بھی کر لی لیکن انہوں نے کسی طرح حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ لہٰذا ان کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا (فکیف اٰسیٰ علی قوم کافرین)۔

یہ جملہ حضرت "شعیبؑ" نے ان لوگوں کی ہلاکت کے بعد کہا تھا یا اس سے قبل؟ دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ جملہ ان کی نابودی سے پہلے کہا ہو، لیکن جس وقت قرآن نے اس واقعہ کو بیان کیا تو اس کا ذکر آخر میں کیا گیا۔

لیکن اگر آخری جملے پر نظر کی جائے جس میں کہا گیا ہے: اس کافر قوم کے دردناک انجام پر کوئی جائے تأسف نہیں ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام نزول عذاب کے بعد کا ہے اور جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۷۹ میں اشارہ کیا گیا ہے، اس طرح کی باتیں مُردوں سے اکثر کی جاتی ہیں (اس کے شواہد بھی اسی جگہ بیان کیے گئے ہیں ملاحظہ ہو)۔

(۹۴) وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ

بقیہ حاشیہ سابقہ: بعید نہیں کہ یہ "غنی" کے مفہوم اصلی یعنی "بے نیازی" سے ماخوذ ہو کیونکہ جس کے پاس رہنے کو اپنا مکان ہوتا ہے وہ دوسرے مکانات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○

(۹۵) ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

(۹۴) ہم نے کسی شہر اور آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، الّا یہ کہ اس کے رہنے والوں کو سختیوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ (ہوش میں آئیں اور خدا کی طرف) پلٹیں۔

(۹۵) اس کے بعد (جس وقت کسی تنبیہ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا تو) ہم نے نیکی (اور نعمت کی فراوانی) کو بجائے بدی (اور تکلیف و اذیّت) کے قرار دیا، اس طرح کہ ان میں ہر طرح کی (نعمت میں) زیادتی ہوگئی (اور نعمتوں میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ وہ مغرور ہو گئے اور) کہنے لگے ہمارے آباؤ اجداد کو تکلیفیں اور راحتیں پہنچی تھیں، پس ہم نے ان کو یکایک پکڑ لیا ایسی حالت میں کہ ان کو اس کا (پہلے سے) احساس نہ ہو۔

تفسیر

اگر بار بار کی تنبیہ کارگر نہ ہو

یہ آیات، بعض پیغمبروں کی سرگزشت، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کے بعد اور حضرت موسیٰؑ بن عمران کی سرگذشت بیان کرنے سے پہلے آئی ہیں۔ ان میں چند ایسے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے قصّوں میں پائے جاتے ہیں، یہ ایسے اصول ہیں کہ اگر ہم ان کا بغور مطالعہ کریں تو ایسے حقائق آشکار ہوں گے جن کا براہِ راست تعلق ہم سب سے ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے کسی شہر اور آبادی میں پیغمبر نہیں بھیجا الّا یہ کہ وہاں کے لوگوں کو تکلیفوں

اور بلاؤں میں گرفتار کیا، تاکہ تھوڑا بیدار ہوں، اور اپنے طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھالیں اور اس کی طرف رجوع کریں جو ہر طرح کی نعمتوں کا سرچشمہ ہے (وما ارسلنا فی قریة من نبیّ الآ اخذنآ اھلھا بالبأسآء والضرآء لعلھم یضرعون)۔

اور یہ اس لیے تھا کہ انسان کی طبیعت ہے کہ جب تک وہ ناز و نعمت میں رہتا ہے تو اس میں گوش شنوا اور حق قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ مگر جس وقت وہ گرداب بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بے اختیار یادِ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا دل بھی نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن یہ بیداری جو عام طور پر سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے، بہت سے افراد میں زود گزر اور ناپائیدار ہوتی ہے، کیونکہ جونہی مشکلات برطرف ہو جاتے ہیں وہ دوبارہ خوابِ غفلت میں غرق ہو جاتے ہیں، جبکہ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی کے لیے یہ مشکلات ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مصائب کے بعد ان کی رفتار و کردار کا رُخ بدل جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے حق کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، گذشتہ آیات میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا شمار پہلے طبقہ میں تھا۔

اس بنا پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: جب ان لوگوں نے حوادثِ روزگار کے تھپیڑوں میں اور مشکلات کے گردابوں میں بھی اپنا راستہ نہ بدلا اور اسی طرح گمراہی میں پڑے رہے تو ہم نے ان پر سے مشکلات کو ہٹا لیا اور اس کی جگہ فراخی اور نعمتیں عطا کیں یہاں تک کہ دوبارہ ان کی زندگی پُر رونق ہو گئی اور ان کی زندگی میں جو کمیاں تھیں دُور ہو گئیں، مال و دولت اور افرادی قوت میں اضافہ ہوتا گیا (ثم بدلنا مکان السیئة الحسنة حتّٰی عفوا)۔

۔ عفوا۔ مادّہ ۔عفو۔ سے ہے جو کبھی تو کثرت و زیادتی کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ترک کرنے اور کسی چیز سے رد گردانی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی کسی چیز کے آثار محو کرنے کے لیے آتا ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ سب کی اصل ترک کرنا ہو۔ اب یہ ترک کرنا کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ کسی چیز کو ترک کر دیا جائے تاکہ وہ توالد و تناسل کرے اور بڑھ جائے اور کبھی ترک کرنا یہ ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اس کی نگہداشت بھی نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ وہ تدریجاً محو و نابود ہو جائے، اس بنا پر یہ لفظ افزائش یا نابودی کے معنی میں بھی آیا ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی مفسرین نے تین احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ ہم نے ان کو مہلت دی تاکہ وہ "افزائش" پا جائیں اور سختی کے زمانے میں جو نقصانات اٹھا چکے تھے ان کی تلافی ہو جائے۔

دوسرا: یہ کہ ہم نے اس طرح ان کو نعمتیں دیں کہ وہ مغرور ہو گئے اور خدا کو انہوں نے

بھلا دیا اور اس کے شکر کو ترک کر دیا۔
تیسرا : یہ کہ ہم نے نعمتیں دیں تاکہ وہ ان کے ذریعے نکبت و افلاس کے آثار ۔ محو ۔ کر دیں۔
اگرچہ ان تفسیروں کا مفہوم آپس میں مختلف ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ان میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔
اس کے بعد فرماتا ہے کہ جب ان لوگوں سے مشکلات برطرف ہوگئیں تو بجائے اس کے کہ اس حقیقت کی جانب توجہ کریں کہ "نعمت" و "نقمت" سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کی طرف رجوع کریں، خود اپنے کو دھوکا دینے کے لیے اس طرح باتیں کرنے لگے کہ اگر ہمیں مصائب و آلام اور مشکلات پیش آئی ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسی مشکلات سے دو چار ہو چکے ہیں دنیا میں اس طرح کے نشیب و فراز ہر ایک کو پیش آتے رہتے ہیں،، سختیاں اور تکلیفیں ہر ایک کو پیش آتی ہی رہتی ہیں جو زود گزر ہوتی ہیں (و قالوا قد مس اٰبآئنا الضرآء والسرآء)۔
آخر میں قرآن کہتا ہے : جس وقت بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے تربیت کے مختلف طریقوں میں سے کسی سے کوئی اثر نہ لیا بلکہ روز بروز ان کے غرور و استکبار میں اضافہ ہوتا گیا تو .. ناگاہ ہم نے ان کو اپنی سزا کے پنجے میں جکڑ لیا، اس حالت میں کہ ان کو پہلے سے اس کا کوئی سان و گمان نہ تھا۔ اسی لیے یہ سزا ان کے لیے بہت زیادہ دردناک ثابت ہوئی (فاخذناهم بغتة وهم لا يشعرون)۔

(۹۶) وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

(۹۷) اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ؕ

(۹۸) اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝

(۹۹) اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(۱۰۰) اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

ترجمہ

(۹۶) اگر وہ لوگ جو شہروں اور آبادیوں میں رہتے ہیں خدا پر ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیں گے، لیکن انہوں نے (حقائق کی) تکذیب کی تو ہم نے بھی انہیں ان کے اعمال کی سزا دی۔

(۹۷) کیا ان آبادیوں کے رہنے والے اس بات سے مطمئن و محفوظ ہیں کہ ہمارا عذاب رات کے وقت ان پر نازل ہو جائے جبکہ وہ (میٹھی) نیند کے مزے لے رہے ہوں ؟

(۹۸) کیا ان آبادیوں کے رہنے والے اس بات سے مطمئن و محفوظ ہیں کہ ہمارا عذاب دن کے وقت ان پر نازل ہو جائے جبکہ وہ کھیل میں مشغول ہوں۔

(۹۹) آیا وہ اللہ کی تدبیر سے غافل ہیں حالانکہ اللہ کی تدبیر سے سوائے خسارہ اٹھانے والوں کے اور کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔

(۱۰۰) کیا وہ لوگ جو پہلے لوگوں کے بعد روئے زمین کے وارث ہوئے ہیں، اس بات سے عبرت نہیں لیتے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی (اگلوں کی طرح) ان کے گناہوں کی پاداش میں سزا دے دیں (بات یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ (حق کی آواز کو) نہ سُن سکیں۔

تفسیر

زندگی - ایمان وتقویٰ کے زیرِ سایہ

پچھلی آیات میں کچھ قوموں کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے ، جیسے حضرت نوحؑ ،حضرت لوطؑ ،حضرت ہودؑ ،حضرت صالحؑ ،حضرت شعیبؑ کی قومیں ۔ اگرچہ یہ آیتیں بجائے خود ان کے عبرت انگیز نتائج کے بیان کرنے کے لیے کافی و دافی ہیں ،لیکن زیرِ بحث آیات میں مزید وضاحت کے ساتھ ان واقعات کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے ، ارشاد ہوتا ہے : یہ لوگ جو ان آبادیوں اور دیگر شہروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اگر طغیان وسرکشی ،تکذیبِ آیاتِ الٰہی اور ظلم وفساد کی بجائے ایمان لے آئیں اور اس کے سائے میں تقویٰ پرہیزگاری اختیار کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف عذاب الٰہی سے بچ جائیں گے بلکہ ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے بھی کھول دیں گے (ولو انّ اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السمآء والارض) ۔

لیکن افسوس ! انہوں نے صراطِ مستقیم ،جو سعادت وخوش بختی اور رفاہیت وسلامتی کی راہ تھی ، کو چھوڑ دیا اور ، خدا کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور ان کے اصلاحی منصوبوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تو ہم نے بھی انہیں ان کے اعمالِ بد کے جرم میں سزا دی" (ولکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون) ۔

چند اہم نکات

۱- آسمان اور زمین کی برکتوں سے کیا مراد ہے ؟ : اس سلسلے میں مفسّرین کے درمیان بحث ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نباتات کا روئیدہ ہونا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد اجابتِ دُعا اور حلِ مشکلات ہے ۔ یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ برکات آسمانی سے مراد برکاتِ معنوی اور برکاتِ ارضی سے مراد برکات مادّی ہوں ،لیکن اگر گذشتہ آیات پر نظر کی جائے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ :

گذشتہ آیات جن میں سرکشوں اور مجرموں کو شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کبھی آسمان سے سیلاب نازل ہونے اور زمین سے چشموں کے ابلنے کا ذکر ہے (جیسے طوفان نوحؑ) ، اور کبھی آسمانی بجلی گرنے اور کبھی صیحہ آسمانی ،کبھی زمین کے ہولناک زلزلوں کا بیان ہے ۔ زیرِ نظر آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ یہ سب سزائیں ان لوگوں کے اعمالِ بد کا ردِ عمل تھیں ، ورنہ اگر انسان پاک اور باایمان ہو تو آسمان سے

عذاب کے بجائے اللہ کی برکتوں کی بارش ہو۔ یہ خود انسان ہے جو برکتوں کو بلاؤں کی شکل میں بدلے جانے کا باعث ہوتا ہے ۔

۲۔ **"برکات" کا مفہوم :** "برکات" جمع ہے "برکت" کی اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اس کلمہ میں "ثبات" اور "استقرار" کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ، جو نعمت دیر تک برقرار رہنے والی ہو اس کو برکت کہتے ہیں ، اس کے مقابلہ میں وہ بے برکت چیزیں ہوتی ہیں جو زود گزر اور جلدی فنا ہو جانے والی ہوتی ہیں ۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایمان و تقویٰ نہ صرف نزول برکاتِ الٰہی کا سبب ہوتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہی جو نعمتیں انسان کے پاس ہوتی ہیں ان کو وہ برمحل صرف کرتا ہے ۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کتنی زیادہ انسانی طاقت اور اقتصادی وسائل ہیں ، مگر یہ سب اسلحہ سازی کے مقابلوں اور طرح طرح کے نابود کرنے والے ہولناک آلات کی تیاری میں صرف ہو رہے ہیں ۔ یہ وہ قدرت کے عطیے ہیں جن سے ہر طرح کی برکت ختم ہو گئی ہے ۔ یہ جلد ہی فنا ہو جائیں گے ۔ ان سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ان کی وجہ سے ہر طرف ویرانی و بربادی پیدا ہو گی لیکن اگر انسانی معاشرہ میں ایمان بخدا اور تقویٰ شامل ہو جائے تو یہ قدرت کے عطیے ایک دوسری طرح سے ان کے درمیان صرف ہوں جس کے نتیجہ میں ان کے آثار و برکات دیر تک باقی رہیں اور اس طرح وہ برکات کے مصداق بن جائیں ۔

۳۔ **اس آیت میں "اخذ" سے مراد :** آیہ مذکورہ بالا میں لفظ "اخذ" پکڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم ہے "سزا دینا" ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ بالعموم جس کو بھی سزا دینا منظور ہوتا ہے اس کو پہلے پکڑا جاتا ہے ، پھر اس کو باندھ دیتے ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکے ، بعد ازاں اس کو سزا دیتے ہیں ۔

۴۔ **خدا کا فیض اور عقاب کسی سے مخصوص نہیں :** اگرچہ زیرِ بحث آیہ شریفہ کے مدِ نظر قومیں اور ان کے اعمالِ بد ہیں لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس کا مفہوم وسیع ، عام اور دائمی ہے جو کسی ایک قوم و ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور یہ ایک سنتِ الٰہی ہے کہ بے ایمان و کثیف اور فاسد افراد اسی دنیا میں اپنے کیفرِ کردار میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ کبھی تو آسمان و زمین کی بلائیں ان پر برستی ہیں اور کبھی جنگِ عظیم یا علاقائی جنگ کی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ان کے اقتصادی اور جانی سرمائے کو خاک سیاہ کر دیتی ہے اور کبھی جسمانی اور دماغی طور پر وہ اَن دیکھے خطروں سے ایسے متاثر اور خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ان کا سرمایۂ سکون و قرار چھن جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ قرآنِ کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کا قانون کار فرما ہے ورنہ نہ تو خدا کا فیض کسی خاص فرد کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ اس کا عقاب ، جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا ۔

ایمان سے بے بہرہ قومیں کیوں خوشحال ہیں؟

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اس سے ایک ایسے سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر آتا رہتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اگر واقعاً ایمان اور تقویٰ نزولِ برکاتِ الٰہی کا سبب ہے اور بے ایمانی اور گناہ سے برکتیں سلب ہو جاتی ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اکثر ہم اس کے برعکس مشاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی بے ایمان قومیں ناز و نعمت میں غرق ہوتی ہیں جبکہ اہلِ ایمان پریشان حال نظر آتے ہیں ؟ !

اس سوال کا جواب دو نکتوں پر غور کرنے سے مل جائے گا :

۱۔ یہ تصوّر کرنا کہ بے ایمان قومیں اور گنہگار لوگ نعمت میں غرق ہیں ایک بڑا اشتباہ ہے اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ ثروت اور مال و دولت کو خوش قسمتی کا سرچشمہ سمجھ لیا گیا ہے۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو قوم صنعت و ثروت کے لحاظ سے ترقی یافتہ ہو وہ ایک خوش قسمت قوم ہے حالانکہ اسی قوم کے اندرونی حالات کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو اس میں ایسے درد ہائے جانکاہ ملیں گے جو اس قوم کو روحانی طور پر درہم برہم کیے ہوئے ہوں گے۔ ان دردوں اور دکھوں کو دیکھنے کے بعد ہم کو ماننا پڑے گا کہ اسی قوم کے اندر ایسے بھی لاکھوں افراد ہیں جو روئے زمین کے تمام انسانوں سے زیادہ بدبخت ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ جتنی بھی اضافی ترقی نصیب ہوتی ہے وہ بھی کوشش، جستجو، نظم اور استقلال جیسے اصولوں کو اپنانے کی وجہ سے ہے جو انبیائے الٰہی کی تعلیمات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

انہی ایّام میں جبکہ یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ شہر - نیویارک - جو دنیائے مادّی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر ہے، یہ حادثہ رونما ہوا کہ ایک مرتبہ ناگہانی طور پر وہاں بجلی چلی گئی جیسا کہ عام طور سے بہت سے شہروں میں ہوتا رہتا ہے، لیکن نیویارک میں عجیب ہنگامہ برپا ہو گیا یعنی بہت سے لوگوں نے دُکانوں پر یلغار کر دی اور جو جس کے ہاتھ میں آیا لے کر چلا گیا بہت سی دکانیں غارت ہو گئیں یہاں تک کہ پولیس نے تین ہزار غارتگروں کو گرفتار کیا۔

یہ بات مسلّم ہے کہ ان غارت گردوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی کیونکہ تین ہزار تو وہ تھے جو بھاگ نہ سکے اور موقع پر پکڑے گئے۔ نیز یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لوگ جو پکڑے گئے تھے کوئی پیشہ ور چور ڈاکو نہ تھے نہ وہ پہلے سے چوری کے لیے آمادہ تھے کیونکہ یہ ایک ناگہانی حادثہ تھا۔

بنا بریں یہ نتیجہ نکلا کہ صرف ایک دفعہ بجلی کے چلے جانے سے ایک ثروتمند اور ترقی یافتہ شہر کے ہزاروں انسان ذرا سی دیر میں انسانی جامہ اتار کر "ڈاکو اور غارت گر" بن گئے۔ یہ نہ صرف ایک قوم و

ملت کے اخلاق کی پستی کی دلیل ہے بلکہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی بے امنی کی زندگی ہے ۔

ایک دوسری خبر جو اس روز کے اخبارات میں تھی وہ ایک مشہور و معروف شخص جو اس روز ایک بلند و بالا آسمان خراش ہوٹل میں سکونت پذیر تھا، بیان کرتا ہے کہ بجلی جانے کے بعد میرے ہوٹل کی صورتحال بھی بہت خطرناک ہوگئی تھی۔ کوئی شخص اپنے کمرے سے باہر نکل کر راستے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں غارتگروں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ہوٹل کے منتظمین نئے آنے والے مسافروں کو دس دس یا زیادہ کی تعداد میں مسلح پولیس افراد کے ساتھ ان کے کمروں میں بھیجتے تھے۔ شخص مذکور اپنے بیان میں اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ جب تک مجھے بھوک نہیں ستاتی تھی میں اپنے کمرے سے باہر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ۔

اس کے برخلاف مشرق کے پسماندہ شہروں میں بجلی عام طور سے فیل ہوتی رہتی ہے لیکن وہاں اس قسم کی مشکلات رونما نہیں ہوتیں، اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملکوں نے ثروت کے لحاظ سے تو ترقی کر لی ہے مگر امن و امان ذرہ برابر بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ آدمی کو جان سے مار دینا لوگوں کے لیے پانی پی لینے کی طرح آسان ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ اگر کسی کو ساری دنیا دے دی جائے لیکن اس سے یہ کہا جائے کہ ان حالات میں تمہیں زندگی بسر کرنا ہوگی تو وہ تمام انسانوں میں بدبخت ترین فرد ہوگا، پھر یہ کہ بے امنی ان کی مشکلات میں سے ایک مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی ہی نہ معلوم کتنی مشکلات ہیں جن میں وہ گرفتار ہیں۔ لہٰذا ان حقائق کو دیکھتے ہوئے صرف ثروت کی زیادتی کو خوش قسمتی کا نشان نہیں سمجھنا چاہیئے ۔

۲۔ اب یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان دار اور پرہیزگار ہیں وہ کیوں اقتصادی و علمی طور پر عقب افتادہ اور پسماندہ ہیں؟ اس کے جواب میں ہم پوچھیں گے کہ ان کے ایمان اور پرہیزگاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اسلام کے دعویدار ہیں اور ان کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ انبیائے الٰہی کی سیرت پر چلتے ہیں، تو ہم اس بات کو قبول کرنے پر تیار ہیں کہ ایسے لوگ پسماندہ و عقب افتادہ ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایمان اور پرہیزگاری کی اصل ماہیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں انسان کے اعمال اور اس کی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کر جائیں اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو زبانی کلامی دعوے سے حاصل نہیں ہوتی ۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں اور آبادیوں میں اسلامی تعلیمات اور پیغمبروں کے ارشادات کلی طور سے متروک یا نیم متروک ہو کر رہ گئے ہیں اور آج کے اسلامی معاشرہ کا چہرہ اتنا مسخ ہو گیا ہے کہ اسے ایک اسلامی چہرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام تو پاکدامنی، نیکی، امانتداری اور مسلسل کوشش کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن وہ امانت داری اور جدوجہد کہاں ہے؟ اسلام علم و دانش، آگاہی اور بیداری کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن وہ علم و دانش کہاں ہے؟ اسلام اتحاد، اتفاق، یک جہتی اور فداکاری کی طرف لوگوں کو بُلاتا ہے، کیا واقعی آج کے مسلمانوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود وہ پسماندہ ہیں؟ لہٰذا ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ حقیقی اسلام کوئی اور چیز ہے اور ہم کچھ اور ہیں۔

بعد کی آیات میں اس حکم کی عمومیت پر مزید تاکید کے لیے اور یہ بیان کرنے کے لیے کہ مذکورہ بالا قانون گذشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ یہ آج اور کل کے انسانوں کے لیے بھی ہے قرآن فرماتا ہے: وہ مجرم افراد جو روئے زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہیں اپنے آپ کو خدا کی سزا سے محفوظ سمجھتے ہیں، ان کو اس کا ڈر نہیں کہ عذاب الٰہی (بجلی، زلزلہ یا ایسی کوئی آفت) رات کے وقت انہیں اس وقت آلے جبکہ وہ خواب نوشین کے مزے لے رہے ہوں (أفأمن اهل القریٰ ان یأتیهم بأسنا بیاتا وهم نآئمون)۔

"یا یہ کہ دن کے وقت اس وقت ان کا دامن پکڑے جبکہ وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں" (او أمن اهل القریٰ ان یأتیهم بأسنا ضحی وهم یلعبون)۔

مقصد یہ ہے کہ وہ روز و شب، خواب و بیداری اور خوشی و ناخوشی ہر حالت میں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جب بھی وہ چاہے اپنے ایک معمولی فرمان سے ان کے کاشانۂ ہستی کو درہم برہم کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس عذاب کے لیے کوئی مقدمہ فراہم کرے یا کسی مدت کے گزرنے کا انتظار کرے، ہاں بس ایک لحظہ کے اندر وہ جو بلا چاہے اس انسان کے سر پر نازل کر سکتا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ انسان اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے اور باوجود یہ کہ اس نے دنیائے طبیعت کی بڑی بڑی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنا لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی ان حوادث کے مقابلے میں اتنا ہی ضعیف اور بے دست و پا ہے جتنا ہزار سال پہلے کا انسان تھا۔ یعنی خدائی آفتوں جیسے زلزلہ اور بجلی اور اسی طرح کی دوسری آفتوں کے سامنے اس حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اپنی قدرت و توانائی کے باوجود بہت کمزور اور ناتواں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ ہر انسان کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

اس کے بعد کی آیت میں دوبارہ ایک دوسرے انداز میں اسی حقیقت کا اظہار مزید تاکید کیلئے فرمایا گیا ہے: کیا یہ مجرم افراد خدا کی (انتقامی) تدابیر سے مطمئن ہیں؟ حالانکہ سوائے زیاں کاروں کے

کوئی بھی اس کی (انتقامی) تدبیر سے اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا (أفا منوا مکر اللہ فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون)۔

جیسا کہ ہم سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۴ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ لفظ "مکر" کا جو مفہوم ہماری آج کی روز مرہ کی زبان میں لیا جاتا ہے، عربی میں اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے فارسی میں مکر کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شخص کسی کے خلاف شیطانی اور زیاں بخش اسکیمیں تیار کرے لیکن عربی زبان میں "مکر" کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے مقصد سے باز رکھنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیا جائے چاہے وہ حق ہو یا باطل نیز اس لفظ "مکر" میں ایک قسم کا تدریجی نفوذ بھی پوشیدہ ہے۔

بنا بریں "مکرِ الٰہی" سے مراد یہ ہے کہ خدا گنہگار بندوں کو یقینی اور ناقابلِ شکست تدبیروں کے ذریعے خوش حالی اور عیش و آرام کی زندگی سے روک دے۔ اس سے انہی سزاؤں اور ناگہانی بلاؤں طرف اشارہ مقصود ہے جو انسان کو ہر طرح سے بے چارہ کر دیتی ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: جو شخص گھاٹے میں ہے اس کے سوا کوئی بھی اپنے کو خدا کی (انتقامی) تدبیر اور سزا سے امان میں نہیں سمجھتا، یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جملہ پیغمبروں، پیشواؤں اور صالحین کے لیے بھی ہے یا نہیں؟

بعض کا خیال ہے کہ یہ لوگ اس حکم سے خارج ہیں اور مذکورہ بالا آیت صرف گنہگاروں کے لیے ہے لیکن اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم عمومی ہے جو سب کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے کیونکہ تمام پیغمبر اور آئمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین ہمیشہ اپنے اعمال کے ناظر و نگران رہے کہ کہ مبادا ان سے کوئی لغزش صادر ہو جائے کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ان کے معصوم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کبھی ان سے کوئی مخالفت نہیں ہوسکتی[1] بلکہ وہ اپنے ایمان اور ارادہ کی قوت سے اور اپنے اختیار اور الٰہی مدد کے ذریعے خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ ہیں، جبکہ وہ ترکِ اُولیٰ سے ڈرا کرتے تھے اور اس سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو ادا نہ کرسکیں جو خدا نے ان کے دوش پر رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۵ میں ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔

---

[1] عصمت کے یہی معنی ہیں کہ ان سے کوئی غلطی ایسی نہیں ہوسکتی جو موجب دخول جہنم ہو، البتہ ان سے ترک اولیٰ ہوسکتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ ڈرتے رہتے تھے، اب رہے اہلبیت طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین تو ان سے ترک اولیٰ بھی محال ہے، ان کا توبہ استغفار ترقی درجات اور تعلیم کے لیے تھا جیسا کہ مؤلف محترم کئی مقامات پر وضاحت کر چکے ہیں (مترجم)۔

کہو میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اللہ کی نافرمانی کی تو میں روزِ عظیم کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔

جو روایتیں آیہ مذکورہ کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہے۔ صفوان جمال کہتے ہیں کہ ایک روز میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، میں نے سنا کہ آپؑ کہہ رہے تھے:

اللّٰھم لا تؤمنی مکرک - ثم جھر - فقال فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

خدایا! مجھے اپنی تدبیر سے مطمئن نہ کر، پھر اس کے بعد آپؑ نے بلند آواز سے اس آیت کی تلاوت فرمائی فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

نیز نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے فرمایا:

لا تأمنن علی خیر ھٰذہ الامۃ عذاب اللہ لقول اللہ سبحانہ فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

یعنی حتیٰ کہ اس امت کے نیک لوگوں پر بھی الٰہی سزا سے مطمئن و مامون نہ ہونا کیونکہ خداوند کریم فرماتا ہے: فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون [1]

درحقیقت خدا کی سزا سے مطمئن و مامون نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص اپنی ذمہ داریوں کے ادا نہ کرنے یا ان میں کوتاہی واقع ہونے سے ڈرتا ہے۔ یہ خوف اور اس کے ساتھ ہی اس کی رحمت کی امید دونوں ساتھ ساتھ اور برابر سے مومن کے دل میں پائی جانا چاہئیں۔ انہی دونوں کے توازن کی وجہ سے ہر قسم کی مثبت جدوجہد جاری رہتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے روایات میں "خوف و رجاء" کہا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ باایمان افراد ہمیشہ ان دو کے درمیان رہتے ہیں، اس کے برخلاف زیاں کار مجرم اس طرح کیفرِ الٰہی کو بھلا بیٹھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نہایت مطمئن اور امن و امان میں سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک مرتبہ پھر اقوامِ موجودہ کو بیدار کرنے اور پچھلی قوموں کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے قرآن فرماتا ہے: آیا وہ لوگ جو گذشتہ قوموں کی زمینوں کے وارث بنے ہیں اور ان کے ٹھکانوں پر آباد ہوئے ہیں، پچھلی قوموں کے واقعات سے بیدار نہ ہوں گے؟ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور جو حال ہم نے پچھلی قوموں کا کیا ان کا بھی وہی حال کر دیں (اولم یھد للذین یرثون الارض من بعد اھلھا ان لو نشآء اصبناھم بذنوبھم)۔

---

[1] کلمات قصار جملہ ۳۷۷۔

"اور یہ بھی ہم کر سکتے ہیں کہ ان کو زندہ باقی رکھیں اور گناہوں کے اندر غوطہ در ہونے کی وجہ سے ان سے ہم ادراک و شعور اور حق و باطل کی تمیز سلب کرلیں جس کے نتیجہ میں ان میں حقائق کو سننے کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی، وہ کسی نصیحت کو نہ سُن سکیں گے، اپنی زندگی میں حیران و پریشان رہیں گے" (ونطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون)۔

خدا ان لوگوں سے کس طرح ان کے ادراک و شعور اور سُوجھ بُوجھ کو سلب کر لیتا ہے، تفسیرِ نمونہ کی جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیت ، کے ذیل میں ہم اس کو تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

(۱۰۱) تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ○

(۱۰۲) وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۰۱) یہ وہ آبادیاں ہیں جن کے واقعات ہم تم سے بیان کرتے ہیں وہ (اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ) جب ان کے پاس رسول بیّنات لے کر آئے تو وہ چونکہ سابقاً (حق کی) تکذیب کرچکے تھے اس لیے (ان پر) ایمان نہ لائے۔ اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے۔

(۱۰۲) ہم نے ان میں سے اکثر کو اپنے عہد پر باقی نہ پایا، اور ہم نے ان میں سے اکثر کو فاسق پایا۔

تفسیر

ان دونوں آیتوں میں بھی انہی عبرتوں کو پیش کیا گیا ہے جو گذشتہ اقوام کے واقعات میں پوشیدہ ہیں لیکن یہاں رُوئے سخن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اگرچہ سب کو سنانا مقصود ہے، پہلے ارشاد ہوتا ہے : یہ آبادیاں، شہر اور قومیں ہیں جن کے واقعات اور سرگذشتیں ہم تم سے بیان کرتے ہیں (تلك القرٰى نقص عليك من انبآئها)[1]

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے : ایسا نہ تھا کہ وہ بغیر کسی اتمام حجت کے ہلاک کر دیئے گئے بلکہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ان کے پیغمبران کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے، انہوں نے ان کی ہدایت کیلئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں (ولقد جآءتهم رسلهم بالبينات)۔

لیکن انہوں نے ان پیغمبروں کی مسلسل تبلیغات اور ہمہ گیر دعوتوں کا اپنے عناد سے مقابلہ کیا اور وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئے کہ انہوں نے جس بات کی سابق میں تکذیب کر دی تھی اسے قبول کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں (فما كانوا ليؤمنوا بما كذبوا من قبل)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرانِ الٰہی نے دینِ الٰہی کی طرف بلانے کے لیے بارہا قیام کیا تھا لیکن وہ اس طرح اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے ہوئے تھے کہ بہت سے حقائق کے روشن ہو جانے کے باوجود کسی حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

بعد کے جملے میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے : خدا اس طرح کافروں کے دلوں پر بے ایمانی اور گمراہی کا نقش ثبت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے (كذٰلك يطبع الله على قلوب الكافرين)۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غلط راہ پر اپنا قدم اٹھاتے ہیں، تو ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ تکرار اور پیہم غلط کاریوں کی وجہ سے اور ناپاکی اور کفرِ مسلسل کے سبب ان کے دلوں پر ایک ایسا نقش بن جاتا ہے جیسا کسی سکّہ کا انمٹ نقش ہوتا ہے (اتفاقاً لفظ "طبع" کے لغت میں یہی معنی ہیں یعنی کسی شکل کو کسی چیز پر سکّہ کی طرح نقش کر دینا) اور یہ درحقیقت از قبیل اثر و خاصیتِ عمل کے ہے جس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے کیونکہ وہی ہے جس نے "تکرارِ عمل" کو یہ خاصیت بخشی ہے کہ وہ ایک "ملکہ" کی صورت اختیار کرلے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح کی گمراہی کوئی اجباری پہلو نہیں رکھتی بلکہ اس کے اسباب پیدا کرنے والے خود افراد بشر ہوتے ہیں، اگرچہ اسباب میں تاثیر اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔

---

[1] "نقص" کی اصل "قص" ہے جس کی شرح اسی سورہ کی آیت ۷ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کی اخلاقی کمزوری کے ان دو پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے، جو ان کی گمراہی و نابودی کا سبب بن گئے۔

پہلے قرآن فرماتا ہے: یہ لوگ پیمان شکن افراد تھے۔ اور ہم نے ان کی اکثریت میں پائیدار عہد و پیمان نہ پایا۔ (وما وجد نا لاکثرہم من عھد)۔

ہوسکتا ہے اس عہد و پیمان سے " فطری عہد و پیمان " مراد ہو جو خداوند کریم نے بمقتضائے آفرینش و فطرت اپنے تمام بندوں سے لیا ہے، کیونکہ جس وقت اللہ نے اپنے بندوں کو ہوش، ادراک اور استعداد عطا کی اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سے اس بات کا عہد لیا کہ وہ اپنے کانوں اور آنکھوں کو کھولے رکھیں، حق کی آواز سنیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، یہ وہی بات ہے جو اسی سورہ کے آخر میں آیت ۱۷۲ کی تفسیر میں بہ عنوان " عالم ذر " آئے گی اور اس کی شرح ہم انشاء اللہ اپنے مقام پر کریں گے۔

نیز ممکن ہے اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہو جو پیغمبرانِ وقت اپنے دَور کے لوگوں سے لیا کرتے تھے کیونکہ بہت سے لوگ پہلے تو قبول کرلیتے تھے بعدازاں اس سے پھر جاتے تھے۔

یا یہ کہ اس سے تمام عہدوں کی طرف اشارہ مقصود ہے چاہے وہ " فطری " ہوں یا " تشریعی "۔

بہرحال ان کی پیمان شکنی کی عادت ایک بہت بُری عادت تھی جو درحقیقت پیغمبروں کی نافرمانی، کفرونفاق کی راہ پر چلنے پر اصرار، پھر اس کے نتائج بد میں مبتلا ہونے کے اسباب و علل میں سے ایک بڑا سبب تھی۔

بعدازاں ایک اور سبب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے: ہم نے ان میں سے اکثر کو اپنے فرمان کی اطاعت سے خارج پایا (وان وجد نا اکثرھم لفاسقین)۔

مقصد یہ ہے کہ ان میں سرکشی، قانون شکنی، نظامِ آفرینش سے باہر نکلنے اور قوانینِ الٰہی کو توڑنے کا جو جذبہ پایا جاتا تھا، یہ ان کے کفرو بے ایمانی میں ثابت قدم رہنے کا ایک اور سبب تھا۔

اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیئے کہ " اکثرہم " میں جو ضمیر ہے وہ تمام پچھلی اقوام کی جانب پلٹ رہی ہے، اور یہ جو کہا ہے کہ ان میں سے اکثر عہد شکن اور فاسد تھے وہ ان اقلیتوں کی رعایت سے کہا گیا ہے جنھوں نے انبیائے سابقین کی تصدیق کی تھی اور وہ ان پر ایمان لائے تھے اور وہ آخر تک ان کے وفادار رہے تھے، اگرچہ ایسے لوگ بعض اوقات اتنے محدود اور کم ہوتے تھے کہ وہ ایک خاندان سے تجاوز نہ کرتے تھے، لیکن روحِ حق طلبی جو پورے قرآن پر حکمران نظر آتی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ایک خاندان یا معدودے چند افراد کے حق کا بھی پاس و لحاظ کیا جائے اور ان تمام افراد کو منحرف، گمراہ اور پیمان شکن نہ بتایا جائے، یہ ایک پُرکشش بات ہے جو قرآن کریم میں جا بجا نظر آتی ہے۔

٭

(۱۰۳) ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰی بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوۡا بِهَا ۚ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ○

(۱۰۴) وَقَالَ مُوۡسٰی يٰفِرۡعَوۡنُ اِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○ۙ

(۱۰۵) حَقِيۡقٌ عَلٰۤی اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِبَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ○ؕ

(۱۰۶) قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ○

(۱۰۷) فَاَلۡقٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ○ۚۖ

(۱۰۸) وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ○ؑ

ترجمہ

(۱۰۳) اس کے بعد ان کے پیچھے (یعنی گذشتہ انبیاء کے بعد) ہم نے موسٰی کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے گروہ کی طرف بھیجا، لیکن ان لوگوں نے (ان نشانیوں کو قبول نہ کرکے) ان کے ساتھ ظلم کیا، دیکھو مفسدوں کا انجام کیا ہوا؟

(۱۰۴) اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون! مَیں سارے جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں۔

(۱۰۵) میرے لیے یہی مناسب ہے کہ مَیں خدا کی طرف سوائے حق کے کسی بات کو نسبت نہ دوں، مَیں تمہارے لیے تمہارے خدا کی طرف سے روشن دلیل لایا ہوں، لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

(۱۰۶) فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی نشانی لائے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

(۱۰۷) اس پر انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ایک نمایاں اژدہا بن گیا۔

(۱۰۸) اور اپنے ہاتھ کو (گریبان سے) باہر نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید (اور درخشاں) ہو گیا۔

تفسیر

موسیٰؑ اور فرعون کی لڑائی کا ایک منظر

بہت سے انبیاء کی سرگزشت جو گذشتہ آیات میں بطور خلاصہ بیان کی گئی ہے اسی کے ذیل میں ان آیات میں اور اسی طرح کی دیگر متعدد آیات میں جو بعد میں آنے والی ہیں حضرت موسیٰؑ کے واقعات اور فرعون کے اس کے ساتھیوں کے ساتھ ان کی جنگ پھر اس کے بعد فرعون کا عبرتناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت بہ نسبت دیگر انبیاء کے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے تو ممکن ہے دو وجہ سے ہو، ایک تو یہ کہ نزولِ قرآن کے ماحول میں موسیٰؑ بن عمران کے تابعین زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے، نیز ان کو حقانیتِ اسلام کی طرف متوجہ کرنا بہ نسبت دیگر افراد کے زیادہ ضروری تھا[1]

دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کا قیام اور ان کا کفار سے مقابلہ حضرت موسیٰؑ کی نہضت اور تحریک سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

---

[1] اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور مکہ یہودیوں کی آماجگاہ نہ تھا لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ اور حجاز کے دیگر علاقوں میں مقیم یہودیوں کی آبادیوں نے محیطِ مکہ پر کافی اثر کیا تھا اس بنا پر مکی سورتوں میں بھی ان کا کافی ذکر ملتا ہے۔

بہرحال، اس سورہ کے علاوہ دیگر سورتوں جیسے بقرہ، طٰہٰ، شعراء، نمل، قصص وغیرہ میں بھی اس عبرت انگیز سرگزشت کے مختلف حصّوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم ان آیتوں کی الگ الگ شرح کریں اس کے بعد ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں تو بعض افراد کے اس توہم کے برخلاف کہ قرآن میں تکرار سے کام لیا گیا ہے، ہم کو معلوم ہو گا کہ قرآن میں نہ صرف تکرار نہیں ہے بلکہ ہر سورہ میں جو بحث چھیڑی گئی ہے اس کی مناسبت سے اس سرگزشت کا ایک حصّہ شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ضمناً یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں مملکت مصر نسبتاً وسیع مملکت تھی۔ وہاں کے رہنے والوں کا تمدن بھی حضرت نوحؑ، ہودؑ اور شعیبؑ کی اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ لہٰذا، حکومت فراعنہ کی مقاومت بھی زیادہ تھی، اسی بنا پر حضرت موسیٰؑ کی تحریک اور نہضت بھی اتنی اہمیت کی حامل ہوئی کہ اس میں بہت زیادہ عبرت انگیز نکات پائے جاتے ہیں۔ بنا بریں اس سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی زندگی اور بنی اسرائیل کے حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلّی طور پر اس عظیم پیغمبرؑ کی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے پانچ اَدوار

۱۔ پیدائش سے لے کر آغوش فرعون میں آپؑ کی پرورش تک کا زمانہ۔
۲۔ مصر سے آپؑ کا نکلنا اور شہر مدین میں حضرت شعیبؑ کے پاس کچھ وقت گزارنا۔
۳۔ آپؑ کی بعثت کا زمانہ اور فرعون اور اس کی حکومت والوں سے آپؑ کے متعدد تنازعے۔
۴۔ فرعونیوں سے چنگل سے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی نجات اور وہ حوادث جو راستہ میں اور بیت المقدس پہنچنے پر رونما ہوتے۔
۵۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان کشاکش کا زمانہ۔

توجہ رہے کہ قرآن مجید کی ان سورتوں میں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے مذکورہ پانچ ادوار میں سے صرف ایک یا چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ زیرِ بحث آیات میں نیز اسی سورہ کی بہت سی دیگر آیات میں جو آئندہ آنے والی ہیں صرف حضرت موسیٰؑ کی بعثت اور ان کی رسالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہم ان واقعات کو جو آپؑ کی بعثت سے قبل رونما ہوئے آئندہ آنے والی آیات کے ذیل میں بیان کریں گے جو ان واقعات کے ساتھ مربوط ہیں، خصوصاً سورہ "قصص" میں اس کا ذکر آئے گا۔

زیرِ بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اقوام گزشتہ (جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ وغیرہ کی اقوام) کے بعد ہم نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور فرعونیوں کے پاس بھیجا (ثم بعثنا من بعدھم موسٰی بِاٰیٰتنا الٰی فرعون و ملائہ)۔

اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ "فرعون" اسم عام ہے جو تمام سلاطین مصر پر بولا جاتا ہے جیسے سلاطین روم کو "قیصر" اور شاہان ایران کو "کسریٰ" کہتے تھے۔

لفظ "ملأ" جیسا کہ سابقاً بیان کیا گیا ان افراد پر بولا جاتا ہے جو قوم کے سربرآوردہ، اشراف پُرزرق برق نظروں میں سما جانے والے اور معاشرہ کے اہم مواقع پر چھا جانے والے افراد ہوں۔

اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ درجۂ اوّل میں حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف مبعوث ہوئے تو اس کی دو وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰؑ کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے اور مصر اور فرعونیوں کے استعمار سے نجات دلائیں اور یہ کام فرعون سے گفتگو کیے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جیسے ایک مثل ہے کہ پانی ہمیشہ اس چشمہ سے صاف کرنا چاہیئے جہاں سے وہ نکلتا ہے، کیونکہ اجتماعی خرابیاں اور ماحول کے مفاسد کسی فرد یا کسی خاص مقام کی اصلاح سے دور نہیں ہوتے بلکہ چاہیئے یہ کہ سب سے پہلے معاشرے کے سربرآوردہ افراد اور ان اشخاص کی اصلاح کی جائے جن کے ہاتھ میں اس قوم کی سیاست، اقتصاد اور علم کی باگ ڈور ہے، تاکہ باقی افراد کی اصلاح کیلئے بھی زمین ہموار ہو، اور یہ ایک درس ہے جو قرآن کریم تمام مسلمانانِ عالم کو اسلامی معاشروں کی اصلاح کے لیے دے رہا ہو۔

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ان لوگوں نے آیاتِ الٰہی پر ظلم کیا (فظلموا بھا)۔

"ظلم" یہاں ایک وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہیں "کسی شے کو بے محل استعمال کیا جانا" اور اس میں شک نہیں کہ آیاتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں اور ان کو قبول کرکے اپنے اپنے معاشروں کی اصلاح کریں۔ مگر ہوا یہ کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے ان کا انکار کرکے اپنے اوپر ظلم کیا۔

آخر میں قرآن مزید فرماتا ہے: دیکھو مفسدوں کا انجام کیا ہوا (فانظر کیف کان عاقبة المفسدین)۔

اس جملے میں فرعون اور اس کے لشکر کی نابودی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

درحقیقت گذشتہ آیت میں نہایت اجمالی طور پر حضرت موسیٰؑ کی رسالت اور فرعون سے آپ کے مقابلے اور اس کا انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن بعد والی آیات میں اسی بات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، پہلے فرماتا ہے: موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں سارے جہانوں کے پروردگار کے طرف سے فرستادہ ہوں (وقال موسٰی یا فرعون انی رسول من رب العالمین)۔

یہ حضرت موسیٰؑ کا فرعون سے پہلا مقابلہ ہے اور حق و باطل کی نبرد کا ایک نقشہ ہے۔ جاذب توجہ یہ بات ہے کہ پہلی بار فرعون کے سامنے ایک ایسا شخص آیا جس نے فرعون کو فرعون کہہ کر خطاب کیا۔ یہ ایک ایسا خطاب تھا جو ہر قسم کے ادب، تملق، چاپلوسی اور عبودیت کے اظہار سے خالی تھا کیونکہ اب تک تو لوگ اسے ہمارے سردار! اے مالک! اے رب اور اسی طرح کے دوسرے باطل القابات کے ساتھ پکارتے آئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ تعبیر گویا فرعون کے لیے سب سے پہلے خطرہ کا الارم تھا۔ نیز حضرت موسیٰؑ کا یہ کہنا کہ "میں جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں" فی الحقیقت فرعون کے لیے ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا۔ کیونکہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ فرعون اور اس کی طرح کے دوسرے مدعیان ربوبیت سب جھوٹے ہیں اور تمام جہانوں کا رب صرف خدائے وحدہ لاشریک ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی رسالت کے اعلان کے بعد ہی یہ کہا:

اب جبکہ میں خدا کا فرستادہ ہوں تو میرے لیے مناسب ہے کہ میں اس کے بارے میں سوائے حق کے دوسری بات نہ کہوں کیونکہ خدا کا فرستادہ تمام عیوب سے مبرّہ و منزّہ ہوتا ہے ممکن نہیں کہ وہ کوئی غلط بات کہے (حقیق علیٰ ان لآ اقول علی اللہ الا الحق)۔

بعد ازاں اپنے دعوائے نبوّت کے اثبات کے لیے آپ نے اس جملہ کا اضافہ کیا: ایسا نہیں کہ میں نے یہ دعویٰ بغیر کسی دلیل کے کیا ہو، میں تمہارے پروردگار کی جانب سے روشن و واضح دلیل لے کر آیا ہوں (قد جئتکم ببینۃ من ربکم)۔

لہٰذا بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ بھیج دو (فارسل معی بنیٓ اسرآئیل)۔

یہ درحقیقت حضرت موسیٰؑ کی رسالت کا ایک حصہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے چنگل سے چھٹکارا دلائیں اور اسیری کی زنجیروں کو ان کے ہاتھوں اور پیروں سے کاٹ دیں کیونکہ اس زمانے میں بنی اسرائیل ذلیل غلاموں کی حیثیت سے قبطیوں (اہلِ مصر) کے ہاتھوں میں گرفتار تھے اور قبطی ان سے ہر سخت و پست کام لیا کرتے تھے۔

آئندہ کی آیات سے نیز قرآن کی دیگر آیات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ فرعون اور دیگر اہلِ مصر کو بھی اپنے آئین کی طرف دعوت دیں، یعنی ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔

فرعون نے جونہی یہ دعویٰ سنا کہ "میں اپنے ہمراہ روشن دلیل بھی رکھتا ہوں" فوراً کہا "اگر تم سچ کہتے ہو اور اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی رکھتے ہو تو اسے پیش کرو" (قال ان کنت جئت بایۃ

فأت بهآ ان كنت من الصادقين) ۔

اس تعبیر میں ایک تو حضرت موسیٰ کے دعوے کے متعلق شک و شبہ مخفی تھا، اس کے علاوہ اس کے یہ بھی معنی تھے کہ دیکھو! میں جویائے حق ہوں کہ اگر موسیٰ نے کوئی قاطع دلیل پیش کر دی تو فوراً اسے مان لوں گا۔

اس پر حضرت موسیٰ نے بغیر کسی توقف کے اپنے دو بڑے معجزے پیش کر دیئے جن میں سے ایک "خوف" کا مظہر تھا تو دوسرا "امید" کا جس کی وجہ سے آپ کے مقام "انذار" و "بشارت" کی تکمیل ہوتی ہے۔ پہلے "آپ نے اپنا عصا نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا جو ایک نمایاں اژدھے کی شکل میں ہوگیا" (فالقى عصاه فاذا هى ثعبان مبين) [1]

لفظ "مبین" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عصا سچ مچ اژدہا بن گیا وہاں کسی قسم کے فریب نظر، ہاتھ کی صفائی یا جادو جنتر وغیرہ نہ تھا، برخلاف ان امور کے جو جادو گروں نے بعد میں ظاہر کیے، کیونکہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان جادو گروں نے نظر فریب کام کیا اور ایک ایسا عمل کیا جس کی وجہ سے لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ سانپ ہیں جن میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ سورہ نمل کی آیت ۱۰ اور قصص کی آیت ۳۱ میں ہے کہ وہ عصا "جان" کی شکل میں حرکت کرنے لگا اور "جان" عربی میں باریک سانپ کو کہتے ہیں جو تیز بھاگے، یہ تعبیر لفظ "ثعبان" جس کے معنی ایک بڑے اژدھے کے ہیں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں حضرت موسیٰ کی بعثت کے آغاز سے تعلق رکھتی ہیں اور آیت زیر بحث کا تعلق حضرت موسیٰ اور فرعون کے مقابلے سے ہے، تو یہ مشکل حل ہو جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں آپ کا عصا چھوٹا سانپ بنا بعد میں اس کی جسامت میں اضافہ ہوتا گیا تاکہ حضرت موسیٰ اس معجزہ سے تدریجاً مانوس ہو جائیں پھر جب فرعون سے مقابلہ ہوا تو اس نے ایک بہت بڑے اژدھے کی صورت اختیار کر لی تاکہ دشمن کے دل پر خاطر خواہ اثر ہو جبکہ حضرت موسیٰ کے دل میں اس کی ہیبت اس سے قبل دیکھنے کی وجہ سے کم ہو چکی تھی۔

---

[1] راغب نے "مفردات" میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ کلمہ "ثعبان" مادہ "ثعب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی پانی جاری ہونے کے ہیں کیونکہ یہ حیوان کسی نہر کی طرح لہرا کے چلتا ہے۔

عصا اژدھے کی شکل میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصا کا اژدہا بن جانا ایک بیّن معجزہ ہے جس کی توجیہ مادّی اصولوں سے نہیں کی جاسکتی، بلکہ ایک خدا پرست شخص کو اس سے کوئی تعجب بھی نہ ہوگا کیونکہ وہ خدا کو قادرِ مطلق اور سارے عالم کے قوانین کو ارادۂ الٰہی کے تابع سمجھتا ہے لہٰذا اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا حیوان کی صورت اختیار کرلے کیونکہ ایک ماورق طبیعت قدرت کے زیرِ اثر ایسا ہونا عین ممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اس جہانِ طبیعت میں تمام حیوانات کی خلقت خاک سے ہوئی ہے نیز لکڑی و نباتات کی خلقت بھی خاک سے ہوئی ہے، لیکن مٹی سے ایک بڑا سانپ بننے کے لیے عادتاً شاید کروڑوں سال کی مدّت درکار ہے، لیکن اعجاز کے ذریعے یہ طولانی مدت اس قدر کوتاہ ہوگئی کہ وہ تمام انقلابات ایک لحظہ میں طے ہوگئے جن کی بنا پر مٹی سے سانپ بنتا ہے، جس کی وجہ سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جو قوانینِ طبیعت کے زیرِ اثر ایک طولانی مدّت میں سانپ بنتا، چند لحظوں میں یہ شکل اختیار کرگیا۔

اس مقام پر کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو تمام معجزاتِ انبیاء کی طبیعی اور مادّی توجیہات کرتے ہیں جس سے ان کے اعجازی پہلو کی نفی ہوتی ہے، اور ان کی یہ سعی ہوتی ہے کہ تمام معجزات کو معمول کے مسائل کی شکل میں ظاہر کریں، ہرچند وہ کتب آسمانی کی نص اور الفاظ صریحہ کے خلاف ہو۔ ایسے لوگوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ اپنی پوزیشن اچھی طرح سے واضح کریں۔ کیا وہ واقعاً خدا کی عظیم قدرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے قوانینِ طبیعت پر حاکم مانتے ہیں کہ نہیں؟ اگر وہ خدا کو قادر و توانا نہیں سمجھتے تو ان سے انبیاء کے حالات اور ان کے معجزات کی بات کرنا بالکل بے کار ہے اور اگر وہ خدا کو قادر جانتے ہیں تو پھر ذرا تأمل کریں کہ ان تکلف آمیز توجیہوں کی کیا ضرورت ہے جو سراسر آیاتِ قرآنی کے خلاف ہیں (اگرچہ زیرِ بحث آیت میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی مفسّر نے جس کا طریقۂ تفسیر کیسا ہی مختلف کیوں نہ ہو اس آیت کی مادّی توجیہ کی ہو، تاہم جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ایک قاعدہ کلی کے طور پر تھا)۔

✽ ✽ ✽

اس کے بعد کی آیت نے حضرت موسیٰؑ کا دوسرا معجزہ بیان کیا ہے، جو بشارت کا پہلو رکھتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: موسیٰ نے اپنا ہاتھ گریبان سے باہر نکالا، تو وہ ناگہاں دیکھنے والوں کے لیے سفید اور درخشاں ہوگیا (و نزع یدہٗ فاذا ھی بیضآء للناظرین)۔

" نزع " کے معنی ہیں "کسی چیز کو اس جگہ سے باہر نکالا جائے جہاں وہ پہلے سے قرار پذیر ہو، مثلاً کاندھے سے عبا کا الگ کرنا، تن سے لباس کا دُور کرنا ایسے کاموں کو کلام عرب میں " نزع " سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح سے بدن سے روح کے جُدا ہونے کو بھی " نزع روح " کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یہ لفظ " خارج کرنے " کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔

اگرچہ اس آیت میں ہاتھ نکالنے کا ذکر نہیں ہے لیکن سورہ قصص کی آیت ۳۲ میں ہے :

" اُسْلُكْ يَدَكَ فِى جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایسے موقع پر اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرکے جب دوبارہ باہر نکالتے تھے تو وہ نمایاں طور پر سفید اور درخشاں ہو جایا کرتا تھا اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنی پہلی حالت پر پلٹ آتا تھا۔

کچھ تفاسیر اور روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ سفیدی کے علاوہ ایسی حالت میں بہت زیادہ چمکیلا بھی ہو جاتا تھا، لیکن آیاتِ قرآنی اس معاملہ میں خاموش ہیں اگرچہ اس مفہوم کے خلاف بھی نہیں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ اور اس سے پہلے بیان کیا جانے والا معجزہ جو عصا کے بارے میں تھا میں مسلمہ طور پر کوئی عادی اور معمول کا پہلو نہیں ہے نہ طبیعت کو اس میں دخل ہے بلکہ یہ پیغمبروں کے خارقِ عادت معجزات میں داخل ہے جو ماوراء طبیعت اور قوت کی دخالت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی اشارہ بیان کیا گیا کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ دونوں معجزے جو دکھلائے تو اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میں صرف ڈرانے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ تہدید صرف دشمنوں اور مخالفین کے لیے ہے اور تشویق، تعمیر اور نورانیت مومنین کے لیے ہے۔

(۱۰۹) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ

(۱۱۰) يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۞

(۱۱۱) قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ

(۱۱۲) يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۞

ترجمہ

(۱۰۹) فرعون کے اصحاب نے کہا بے شک یہ ایک جاننے والا جادو گر ہے۔

(۱۱۰) یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے باہر نکال دے، تمہاری رائے کیا ہے؟ (اس کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیئے)۔

(۱۱۱) (اس کے بعد) انہوں نے (فرعون سے یہ) کہا کہ اس کے اور اس کے بھائی کے معاملے کو تاخیر میں ڈال دو اور اکٹھا کرنے والوں کو تمام شہروں میں بھیج دو۔

(۱۱۲) تاکہ وہ ہر آزمودہ جادوگر کو تمہارے پاس لے آئیں۔

تفسیر

مقابلہ شروع ہوتا ہے

ان آیات میں اس پہلے ردِ عمل کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ کی دعوت اور ان کی معجزنمائی کے نتیجے میں فرعون اور اس کی حکومت کے افراد پر مرتب ہوا۔

آیت میں پہلے اصحاب فرعون کی طرف سے یہ نقل ہوا کہ انہوں نے جیسے ہی موسیٰ سے خارقِ عادت امور کا مشاہدہ کیا تو فوراً ہی ان کی طرف جادو کی نسبت دے دی اور کہا: یہ ایک جاننے والا پرانا جادوگر ہے (قال الملأ من قوم فرعون ان ھٰذا لساحر علیم)۔

لیکن سورۂ شعراء کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات فرعون نے کہی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ

فرعون نے اپنے اصحاب سے کہا کہ یہ ایک جاننے والا جادوگر ہے۔ (شعراء ۳۴)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیتیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات پہلے فرعون نے کہی ہو کیونکہ اس حادثے کے بعد طبیعی طور پر سب کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اس پر موسیٰ کی اس ضرب کاری کا کیا اثر ہوتا ہے۔ پھر جب فرعون نے اپنی بات کہہ دی کہ یہ ایک تجربہ کار جادوگر معلوم ہوتا ہے تو اس کے اصحاب جن کو چاپلوسی کی عادت تھی اور ان

کا مقصد بجز اپنے سردار کی رضا مندی کے اور کچھ نہ تھا بیک زبان بول اٹھے : " بالکل درست فرمایا یہ ایک بہت ماہر جادوگر معلوم ہوتا ہے " یہ حالت صرف فرعون کے ساتھیوں ہی کی نہیں تھی بلکہ دنیا میں ہر ظالم سردار کے ارد گرد ایسے افراد جمع ہو جایا کرتے ہیں اور وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو فرعون کے دربار میں ہوا۔

☆

اس کے بعد انہوں نے یہ بھی کہا کہ : "اس شخص کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تمہارے وطن سے نکال باہر کرے" (یرید ان یخرجکم من ارضکم)۔

یعنی اس کی غرض سوائے استعمار، استثمار، حکومت طلبی اور دوسروں کی زمین غصب کرنے کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ خارق عادت باتیں اور دعوائے نبوت سب کچھ اسی غرض سے ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ان باتوں کے جان لینے کے بعد اب " تم لوگ بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرو کہ اس شخص کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے" (فماذا تأمرون)۔

یعنی وہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں مشورہ کرنے بیٹھے اور انہوں نے اس معاملے میں تبادلہ خیالات کیا کیونکہ " امر " کا مادہ ہمیشہ حکم دینے کے لیے نہیں آتا بلکہ مشورہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں پر پھر یہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ بالکل یہی جملہ سورۂ شعراء میں فرعون کی زبان سے بھی نقل ہوا ہے اور اس نے اس موقع پر اپنے اطرافیوں سے کہا کہ بتاؤ تم لوگ موسیٰ کے بارے میں کیا رائے دیتے ہو؟ ہم نے بیان کیا کہ ان دونوں میں اختلاف نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ " فماذا تأمرون " اطرافیانِ فرعون نے فرعون سے کہا تھا، اس میں صیغۂ جمع تعظیم کے لیے ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

☆

بہر حال سب کی رائے یہ قرار پائی کہ انہوں نے فرعون سے کہا اس کے اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کے بارے میں جلد بازی سے کام نہ لو اور جو کچھ بھی فیصلہ کرنا ہو وہ بعد کے لیے اٹھا رکھو لیکن جادوگروں کو اکٹھا کرنے والے افراد کو تمام شہروں میں روانہ کردو " (قالوا ارجه واخاه و ارسل فی المدآئن حاشرین)۔

" تاکہ یہ لوگ تمام ماہر و تجربہ کار جادوگروں کو تیرے پاس آنے کی دعوت دیں اور ان کو لے کر تیرے پاس آئیں" (یأتوك بكل ساحر عليم)۔

یہاں پر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا فرعون کی جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ شاید حضرت موسیٰؑ

کا دعوائے نبوّت ایک سچا دعویٰ ہو اور اس طرح وہ انہیں آزمانا چاہتے تھے یا اس کے برعکس انہیں اپنے دعوے میں جھوٹا خیال کرتے تھے اور ہر شخص کی کوشش کو اپنی فکر و ہمت کے مطابق سیاسی رنگ دیتے تھے لہٰذا ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کی ٹھان لی لیکن اگر ان کو بعجلت قتل کر دیا جاتا تو اس سے خوشگوار نتائج برآمد نہ ہوتے کیونکہ ان کے دونوں معجزوں کی وجہ سے لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو گئے تھے پس اگر وہ فوراً قتل کر دیئے جاتے تو نبوت کے ساتھ ساتھ مظلومیّت بھی شامل ہو جاتی اور اس طرح اور زیادہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے۔ لہٰذا پہلے انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ پہلے ان کے معجزانہ عمل کو خارقِ عادت ساحرانہ اعمال سے منتقل کر دیں اور اس طرح انہیں بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر دیں تاکہ موسیٰ و ہارونؑ کی داستان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ دوسرا احتمال قرائن سے زیادہ نزدیک تر ہے۔

٭

(۱۱۳) وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝

(۱۱۴) قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝

(۱۱۵) قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝

(۱۱۶) قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝

(۱۱۷) وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ۚ

(۱۱۸) فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ۚ

(۱۱۹) فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝ۚ

(۱۲۰) وَ اُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ ﴿ۚ﴾

(۱۲۱) قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ﴾

(۱۲۲) رَبِّ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿﴾

ترجمہ

(۱۱۳) جادوگر فرعون کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: اگر ہم غالب ہوگئے تو کیا ہمیں کوئی اہم معاوضہ ملے گا؟

(۱۱۴) (فرعون نے) کہا: ہاں (ضرور ملے گا اور) تم لوگ (میرے) مقرّب ہو جاؤ گے۔

(۱۱۵) (جادوگروں نے) کہا: اے موسٰی یا تو تم (پہلے اپنا عصا) ڈالو، یا ہم (اپنا جادو) ڈالیں۔

(۱۱۶) (موسٰی نے) کہا تم (پہلے) ڈالو، اور جب انہوں نے (اپنے جادوؤں کو) ڈالا تو لوگوں کی نظربندی کر دی، اور لوگوں کو ڈرا دیا اور انہوں نے ایک عظیم جادو پیش کیا۔

(۱۱۷) (اس وقت) ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ (ذرا) اپنے عصا کو سامنے ڈال دو (جونہی موسٰی نے عصا ڈالا تو) وہ فوراً (ایک بڑے اژدھے کی شکل میں ہوگیا اور) ان کے جھوٹے وسیلوں کو نگلنے لگا۔

(۱۱۸) اس موقع پر حق آشکارا ہوگیا اور جو کچھ انہوں نے (کھیل) بنایا تھا نابود ہوگیا۔

(۱۱۹) وہ اس موقع پر مغلوب ہوگئے اور ذلیل و خوار ہوگئے۔

(۱۲۰) اور جادوگر سب کے سب سجدہ میں گر گئے۔

(۱۲۱) اور انہوں نے کہا کہ ہم جہانوں کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔

(۱۲۲) جو موسیٰ و ہارون کا پروردگار ہے۔

تفسیر

آخرکار حق نے کیسے فتح پائی

ان آیات میں حضرت موسیٰؑ اور ساحروں کے مقابلے اور آخر میں اس کے نتیجے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ پہلی آیت میں قرآن فرماتا ہے: جادوگر فرعون کے بلانے پر اس کے پاس آئے اور انہوں نے جو سب سے پہلی بات پیش کی وہ یہ تھی کہ اگر ہم کو موسیٰ پر غلبہ حاصل ہوا تو کیا ہم کو معقول صلہ ملے گا (وجآء السحرة فرعون قالوآ ان لنالاجراً ان کنّا نحن الغالبین)۔

اگرچہ لفظ "اجر" کے معنی ہر قسم کی پاداش اور معاوضے کے ہیں وہ کم ہو یا زیادہ لیکن چونکہ یہاں پر "اجر" "نکرہ" کے ساتھ آیا ہے اس لیے اس کے معنی زیادتی اور اہمیّت کے ہیں، خصوصاً یہ کہ ان کو اجر ملنا تو یقینی تھا، لہٰذا جس چیز کا ان کو فرعون سے پہلے سے وعدہ لینا مقصود تھا وہ اہم اجر اور زیادہ معاوضہ لینے کا مسئلہ تھا۔ فرعون نے بھی بغیر کسی توقف کے ان کی بات مان لی اور کہا: تم کو نہ صرف یہ کہ اہم اجر اور خاطر خواہ معاوضہ ملے گا بلکہ تم میرے دربار کے مقرب لوگوں میں سے ہو جاؤ گے (قال نعم وانکم لمن المقربین)۔

اس طرح فرعون نے ان کو "مال و زر" کا بھی وعدہ دیا، اور "بڑے منصب" کی بھی بات کی۔ آیت کی اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کے دربار میں تقرب حاصل کرنا مال و ثروت سے بھی اہم بات تھی اور یہ ایک معنوی درجہ شمار ہوتا تھا گویا جو بھی اس پر فائز ہوگیا دولت اس کے پاؤں چومنے لگتی تھی۔

٭

آخرکار حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کے مقابلہ کے لیے ایک دن طے پایا، جیساکہ سورہ طٰہٰ اور شعراء دونوں میں آیا ہے، اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے تمام لوگوں کو دعوتِ عام دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

روزِ معیّن آیا۔ تمام جادوگر اپنے ساز و سامان سے لیس ہوکر پہنچ گئے۔ وہ اپنے ہمراہ بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں بھی لائے جن کے اندر کیمیاوی مادّے بھرے ہوئے تھے، جن پر اگر آفتاب کی حرارت پڑے تو ان میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایک عجیب منظر تھا کیونکہ اتنے بڑے انبوہ کے مقابلے میں صرف حضرت موسیٰؑ اپنے بھائی ہارونؑ

کے ساتھ حاضر تھے اور ان کے ساتھ سوائے خدا کے کوئی بھی تو نہ تھا۔

ساحروں نے ایک خاص غرور کے ساتھ موسیٰ سے کہا : یا تو تم پہل کرو اور اپنا عصا پھینکو یا ہم آغاز کرتے ہیں، اور اپنے وسائل پھینکتے ہیں (قالوا یا موسیٰ اما ان تلقی واما ان نکون نحن الملقین)۔

حضرت موسیٰ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا : تم شروع کرو اور اپنے وسائل پھینکو (قال القوا)۔

جس وقت ان جادوگروں نے اپنی اپنی رسیوں کو میدان کے بیچ میں پھینکا، تو انہوں نے لوگوں کی نظر بندی کر دی اور اپنے اعمال اور مبالغہ آمیز اقوال سے لوگوں کے دلوں میں خوف و وحشت پیدا کر دی اور ایک بڑے جادو کا تماشہ ان کو دکھایا۔ (فلما القوا سحروا اعین الناس واسترھبوھم وجآءو بسحر عظیم)۔

جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی جلد اوّل آیت ۱۰۲ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں "سحر" کے معنی اصل میں دھوکا، نیرنگ، شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی کے ہیں اور کبھی یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے آتا ہے جس کا سبب نامرئی و مرموز ہو۔

بنا بریں اس لفظ کے ذیل میں وہ تمام افراد آجائیں گے جو ہاتھ کی صفائی، ہاتھ کی تیز حرکات اور مہارت کے ذریعے چیزوں کو اس طرح اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں کہ ایک خارق عادت کام معلوم ہوتا ہے نیز وہ لوگ بھی اس میں داخل ہو جائیں گے جو کیمیکل کے ذریعے یا فزکس کے قوانین کے ذریعہ لوگوں کو عجیب طرح کے کھیل تماشے دکھلائیں۔ ان سب کو "ساحر" کہا جائے گا۔

اس کے علاوہ جادوگروں کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے بھی کچھ ایسے کلمات کہتے جاتے ہیں جن کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر نفسیاتی حیثیت سے پڑتا ہے۔ وہ کلمات ایسے وحشتناک اور ہولناک ہوتے ہیں جو حاضرین کے دلوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں جادوگر جس خارق عادت امر کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے اس کے لیے ایک طرح سے زمین ہموار ہو جاتی ہے اس سورۃ میں نیز دیگر سورتوں میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان جادوگروں نے اس روز ان تمام وسائل سحر سے کام لیا تھا۔ یہ جملہ "سحروا اعین الناس" (لوگوں کی نظر بندی کر دی) یا یہ جملہ "استرھبوھم" (لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا) یا دوسری تعبیرات جو سورہ طٰہٰ اور شعرآء میں آئی ہیں اس امر کی شاہد ہیں[1]

٭

---

[1] حقیقت سحر کی مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل (ص۲۸۵ تا ص۲۸۹ اردو ترجمہ) ملاحظہ ہو۔

دو اہم نکات

۱۔ **ساحروں کے جادو کا ایک عجیب منظر** : قرآن نے اپنے ایک جملہ : " وجآؤ وا بسحر عظیم " کے ذریعہ سربستہ طور پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جادوگروں نے اس موقع پر جو منصوبہ باندھا تھا وہ انتہائی اہم جچا تلا اور ہولناک تھا ورنہ آیت میں لفظ " عظیم " استعمال نہ ہوتا۔

تواریخ، تفاسیر اور روایات میں بھی ان آیات کے ذیل میں جو مطالب درج ہوئے ہیں ان سے بھی اس موقع کے منظر کی اہمیت و وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسّرین کے قول کے مطابق ان ساحروں کی تعداد کئی ہزار تھی نیز ان کے وسائل سحر بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ چونکہ اس زمانے میں مصر میں سحر و ساحری کا کافی زور تھا اس بنا پر اس بات پر کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

خصوصاً سورہ طٰہٰ کی آیت ۶۷ میں ہے :

فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسٰی ۔

یعنی وہ منظر اتنا عظیم و وحشتناک تھا کہ حضرت موسٰیؑ نے بھی اس کی وجہ سے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔

اگرچہ نہج البلاغہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو اس بات کا خوف لاحق ہو گیا تھا کہ ان جادوگروں کو دیکھ کر لوگ اس قدر متاثر نہ ہو جائیں کہ ان کو حق کی طرف متوجہ کرنا دشوار ہو جائے[1]

بہر صورت یہ تمام باتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ اس وقت ایک عظیم معرکہ درپیش تھا جسے حضرت موسٰیؑ کو بفضلِ الٰہی سر کرنا تھا۔

۲۔ **مناسب ہتھیار سے مقابلہ** : اس بحث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اپنی وسیع حکومت میں جو اسے سرزمینِ مصر پر حاصل تھی ایک سوچی سمجھی شیطانی سیاست پر گامزن تھا۔ اس نے حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ کے مقابلے میں صرف ڈرانے دھمکانے ہی سے کام نہ لیا بلکہ اس نے بزعم خود یہ کوشش کی کہ حضرت موسٰیؑ نے جو معجزہ پیش کیا تھا اس کے مشابہ ایک ہتھیار پیش کرے۔ بلاشبہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو پھر حضرت موسٰیؑ اور ان کی تعلیمات کا دنیا میں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ اس صورت میں ان کا مارا جانا اس کے لیے بہت آسان ہو جاتا، لوگ بھی اس پر خوش ہوتے مگر اس بے چارے کو کیا خبر کہ حضرت موسٰیؑ نے کسی انسانی قوت پر بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اس قوت لایزالِ الٰہی اور قدرتِ پروردگارِ لامتناہی پر تکیہ کیا ہے جو ہر طاقت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ بہرحال

---

[1] خطبہ ۴

دشمن کے مقابلے پر مناسب ہتھیار لے کر جانا فتح حاصل کرنے کے لیے ایک بہترین راستہ ہے جس سے بڑے سے بڑے دشمن کو شکست دی جاسکتی ہے۔

یہ وقت جبکہ تمام لوگ ہیجان میں آئے ہوئے تھے، ہر طرف خوشی کے نعرے لگائے جا رہے تھے، فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لبوں پر رضایت و طمانیت کا تبسم کھیل رہا تھا، ان کی آنکھیں بھی مسرت سے چمک رہی تھیں کہ ۔۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ کو اللہ کی وحی ہوئی ۔۔ اے موسیٰ! تم بھی اپنا عصا پھینک دو، عصا کا پھینکنا تھا کہ یک بیک منظر بالکل بدل گیا، چہروں سے رنگ اڑ گئے، فرعون اور اس کے تمام ساتھی لرزنے لگے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو ڈال دو، ناگہاں وہ عصا (ایک اژدھے کی شکل میں ہوگیا اور) نگلنے لگا ان کے جھوٹے وسیلوں کو (واوحینا الی موسیٰ ان الق عصاك فاذا ھی تلقف ما یأفکون)۔

"تلقف" مادہ "لقف" (بروزن وقف) سے ہے، جس کے معنی کسی چیز کو قوت کے ساتھ پکڑنے کے ہیں، چاہے دہن سے ہو یا ہاتھ سے لیکن بعض مقامات پر یہ لفظ نگلنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں بھی بظاہر اسی معنی میں آیا ہے۔

"یأفکون" مادہ "افک" (بروزن کتف) سے ہے جس کے اصلی معنی کسی چیز سے پلٹانے کے ہیں، چونکہ جھوٹ انسان کو حق سے پلٹا دیتا ہے اس لیے اس کو "افک" کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں پر اس آیت کے معنی میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے وہ یہ کہ عصائے موسیٰ نے جس وقت ایک بڑے سانپ کی شکل اختیار کی تو اس نے ساحروں کے وسیلوں کو نگلا نہیں تھا بلکہ انہیں بیکار کر دیا اور ان کی پہلی شکل پر پلٹا دیا تھا۔ ان مفسرین کا خیال ہے کہ اس طرح ہر اشتباہ کا راستہ لوگوں کے لیے بند ہو جاتا ہے، جبکہ ان وسیلوں کا نگل لینا لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کرسکتا کہ حضرت موسیٰ کا معجزہ ان کے وسیلوں سے زبردست ہے۔

لیکن یہ احتمال نہ تو کلمہ "تلقف" سے مطابقت رکھتا ہے، نہ آیت کے مطالب سے اسے مناسبت ہے کیونکہ "تلقف" کے معنی جیسا کہ بیان ہوا کسی چیز کو بہ سرعت پکڑنے کے ہیں نہ کہ اس کو دگرگوں کرنے کے ہیں۔

علاوہ بر ایں اگر یہ بنا ہوتی کہ اعجازِ موسیٰ ساحروں کے سحر کو باطل کرنے کے ذریعے آشکار ہو تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ عصا ایک بڑے سانپ کی شکل اختیار کرے جیسا کہ قرآن نے اس سرگذشت کے آغاز میں بیان کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے بھی اگر چشم پوشی کرلی جائے تو یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ اگر صرف شک و

تردد پیدا ہی کرنا تھا تو ساحروں کے وسائل کا پہلی صورت پر پلٹ جانا بھی شک و تردد کا باعث ہو سکتا تھا کیونکہ ممکن ہے اس وقت یہ احتمال پیدا ہوتا کہ موسیٰ اپنے سحر میں اس قدر استاد ہیں کہ دوسروں کے جادو کو باطل کر کے پہلی حالت پر پلٹا سکتے ہیں۔

بلکہ جو چیز اس امر کا باعث ہوئی کہ لوگوں کو یہ پتہ چل گیا کہ حضرت موسیٰ کا خارقِ عادت کارنامہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اور وہ خدا کی بے انتہا طاقت کی وجہ سے نمایاں ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مصر میں آزمودہ کار اور ماہر جادوگروں کی کثرت تھی۔ اس فن میں جو لوگ طاق تھے اور استاد سمجھے جاتے تھے وہی اس زمانے کے ماحول میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ جبکہ حضرت موسیٰ میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ ایک گمنام انسان بنی اسرائیل کے درمیان سے اٹھا اور اس نے ایک ایسا کارنامہ پیش کیا جس کے آگے سب عاجز ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ کوئی غیبی طاقت کارفرما ہے اور موسیٰ ایک معمولی انسان نہیں ہیں۔

٭

"اس گھڑی حق آشکار ہو گیا اور ان کے اعمال جو سراسر ناحق و نادرست تھے باطل ہو کر رہ گئے" (فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون)۔

کیونکہ حضرت موسیٰ کا عمل ایک واقعیت پر مبنی تھا، اور ان ساحروں کے اعمال سوائے دھوکا اور فریبِ نظر کے کچھ نہ تھے، اور اس میں شک نہیں کہ کوئی باطل حق کے سامنے دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔

یہ ضرب اوّل تھی جو حضرت موسیٰ نبی اللہ نے فرعون کے جبروت و اقتدار کی بنیاد پر وارد کی۔

٭

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس طرح شکست کے آثار ان لوگوں میں نمایاں ہو گئے، اور سب کے سب ذلیل، پست اور ناتواں ہو گئے (فغلبوا ھنالک وانقلبوا صاغرین)۔

اگرچہ تاریخوں میں اس موقع پر بہت زیادہ مطالب بیان ہوئے ہیں بلکہ بغیر تاریخ کا سہارا لیے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر لوگوں کے احساسات اور جوش کا کیا عالم ہو گا۔ بہت سے لوگ تو اس قدر ڈرے کہ انہوں نے بھاگنا شروع کیا، کچھ لوگ اپنے مقام پر کھڑے چیخ رہے تھے، کچھ لوگ دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ فرعون اور اس کے طرفدار جو بڑی وحشت اور اضطراب کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہے تھے ان کی پیشانی پر شرم و ندامت کا پسینہ آ گیا، اور اپنے مبہم و تاریک مستقبل کی طرف دیکھنے لگے کہ لو ہماری حکومت و سلطنت ہاتھ سے گئی کیونکہ اس وقت جو کچھ ہوا وہ ان کے لیے بالکل ایک غیر متوقع تھا۔ اب ان کی فکر و تدبیر کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔

اس سے بھی کاری ترضربت اس وقت لگی جب حضرت موسیٰؑ اور ساحروں کے مقابلے کا نقشہ یک بیک اس طرح بدل گیا کہ ناگہاں ۔ سب جادو گر زمین پر گر گئے اور وہ عظمتِ الٰہی کے سامنے سربسجود ہو گئے" (و القی السحرۃ ساجدین)۔

۔ اور وہ پکارے کہ ہم سارے جہانوں کے پروردگار پر ایمان لائے" (قالوآ اٰمنا برب العٰلمین)۔

۔ اور وہ خدا وہی ہے جو موسیٰؑ و ہارون کا بھی رب ہے۔ (رب موسٰی و ھارون)۔

انہوں نے اس جملے کے ذریعے اس بات کا کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ اس خدا کے علاوہ جو بھی ادعائے ربوبیّت کرے اس کی خدائی مصنوعی ہے ، ہم ہیں جو حقیقی پروردگار پر ایمان لائے ہیں، حتیٰ کہ انہوں نے کلمۂ ۔ رب العالمین ۔ پر بھی اکتفا نہ کی ، کیونکہ فرعون نے اس بات کا دعوٰے کر دیا تھا کہ سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے ، لہٰذا ضرورت ہوئی کہ اس کے بعد وہ یہ اضافہ کریں کہ ہمارا رب وہ ہے جو موسیٰؑ و ہارونؑ کا بھی رب ہے ، تاکہ ہر قسم کی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے ۔

یہ وہ بات تھی جس کا فرعون اور اس کے اطرافیوں کو بالکل گمان بھی نہ تھا۔ یعنی وہ لوگ جنہیں اس نے حضرت موسیٰؑ کو زیر کرنے کے لیے بلایا تھا وہی مومنین کی صفِ اوّل میں دکھائی دینے لگے ۔ یہ لوگ بغیر کسی شرم و تامّل کے خدا کے حضور خاک پر گر گئے اور انہوں نے بغیر کسی شرط کے حضرت موسیٰؑ کی اطاعت کو جان و دل سے قبول کر لیا ۔

کبھی انسان میں اس طرح بھی انقلاب یکایک آجاتا ہے اور اس کی کایا پلٹ جاتی ہے ۔ اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ نورِ ایمانی کی کرن ہر دل کے اندر موجود ہوتی ہے ، جس کو ہو سکتا ہے کہ ماحول ، خاندان اور زمان طویل و قلیل کے پردے وقتی طور پر چھپا لیں ، لیکن جب کبھی کوئی طوفان اٹھتا ہے تو پردہ ہٹ جاتا ہے اس وقت یہ نور شعلہ بن کر اس طرح لپکتا ہے کہ اس سے زمانے کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے ۔

خصوصاً اس وجہ سے بھی وہ جلدی ایمان لائے کہ وہ خود فنِ ساحری میں منجھے ہوئے استاد تھے' اس فن کے تمام رموز و اسرار سے بخوبی آگاہ تھے لہٰذا ان کو ایک " معجزہ " اور " سحر " کے درمیان جو فرق ہے اس سے آگاہی تھی ، یہ وہ چیز تھی جو ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے لیے مشکل سے واضح ہوتی مگر ان کے لیے تو یہ روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح تھی ۔ انہوں نے اپنے فنِ سحر کے ذریعے جو انہوں نے سالہا سال کی زحمت کے بعد حاصل کیا تھا ، یہ سمجھا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ کارنامہ ہرگز سحر نہیں ہو سکتا ، نہ یہ کسی بشری طاقت کا کام ہے بلکہ مافوق طبیعت اسرار سے اس کا تعلق ہے لہٰذا ان کا اتنی جلدی اور اس صراحت و شدت کے ساتھ ایمان لے آنا کوئی جائے تعجب نہیں ہے ۔

جملہ " القی السحرۃ " جو مجہول کا صیغہ ہے اس سے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ساحروں کی فروتنی'

کامل سپردگی اور غیر معمولی استقبال و قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے یعنی معجزۂ حضرت موسیٰ میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ ان کی طرف بے ساختہ کھنچ گئے اور زمین پر گر کر ان کی حقانیت کا اعتراف و اقرار کرنے لگے۔

(۱۲۳) قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

(۱۲۴) لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

(۱۲۵) قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ○ۚ

(۱۲۶) وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ○ۧ

ترجمہ

(۱۲۳) فرعون نے کہا (ہائیں)، تم اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دوں، یقیناً یہ ایک (زبردست) سازش ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس سے اس کے ساکنوں کو نکال باہر کرو (اچھا)، تم کو کچھ دیر کے بعد پتہ چلے گا۔

(۱۲۴) میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارے ہاتھ پیروں کو ایک دوسرے کے الٹ (یعنی ایک طرف کا ہاتھ تو دوسری طرف کا پیر) کاٹ ڈالوں گا اس کے بعد تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔

(۱۲۵) (ساحروں نے کہا (یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے) ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے۔

(۱۲۶) تیرا جو کچھ بھی غصہ ہمارے اوپر ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لے آئے، خدایا! ہمارے اوپر صبر (و استقامت) کو اچھی طرح انڈیل دے، اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں (اور زندگی کے آخری لمحوں تک ہمارے ایمان و اخلاص کو باقی رکھ)۔

تفسیر

لغو تحدیدیں

جب فرعون کے ارکانِ حکومت پر ساحروں کے ایمان لانے سے ایک ضرب کاری لگی تو فرعون بہت پریشان و مضطرب ہوا۔ کیونکہ اس نے محسوس کر لیا کہ اگر وہ اس وقت شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہ کرے گا تو دوسرے لوگ بھی متاثر ہو کر ایمان لے آئیں گے جس کے بعد حالات پر قابو پانا ناممکن ہوگا، لہٰذا اس نے دو تدبیروں پر عمل کیا:

پہلے اس نے ساحروں پر ایک عوام پسند تہمت لگائی اس کے بعد شدید ترین تہدید کے ساتھ ان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا لیکن ان دونوں منظروں کے مقابلے میں ساحروں نے ایسے صبر و شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ فرعون اور اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو گئے اور ان کی تدبیریں خاک میں مل گئیں، اس طرح تختِ فرعونی کی لرزاں بنیاد پر ایک تیسری ضرب لگی۔ زیرِ بحث آیات میں اس منظر کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

پہلے یہ : فرعون نے ساحروں سے کہا: آیا قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں تم اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے ہو (قال فرعون اٰمنتم بہٖ قبل ان اٰذن لکم)۔

کلمہ "بہٖ" (اس پر) کے ذریعے اسے موسیٰ کی انتہائی تحقیر منظور تھی گویا وہ نام لیے جانے کے لائق بھی نہ تھے اور اس جملہ "قبل ان اٰذن لکم" کے ذریعے فرعون کہنا چاہتا ہے کہ میں خود ایسا حق پسند

ہوں کہ اگر موسیٰ کے دعوے میں کوئی بھی حقیقت ہوتی تو میں تمہیں ایمان لانے کی اجازت دے دیتا لیکن تمہاری اس جلد بازی سے پتہ چلا کہ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حقیقت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے اہلِ مصر کے خلاف ایک عظیم سازش کر رکھی ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا جملے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون کا جنون اقتدار پسندی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اہلِ مصر نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام نہ دیں بلکہ انہیں سوچنے اور غور و فکر کرنے اور کوئی مذہب اختیار کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور یہ استعمار و استبداد کی بدترین مثال ہے کہ قومیں کسی فرد کے ہاتھ میں اس طرح اسیر اور غلام ہو جائیں کہ ان سے سوچنے سمجھنے یہاں تک کہ کسی نظریہ کو اپنانے کا حق بھی ان سے چھن جائے۔ یہ وہی طریقۂ کار ہے جو "استعمارِ جدید" کے نظام میں بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یعنی استعماری قوتیں صرف سیاسی اقتصادی اور اجتماعی استعمار پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں پر بھی استعمار کے تالے لگا دیئے جائیں اور صرف انہی کے نظریے اور افکار کی جڑیں لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کر سکیں۔

چنانچہ کمیونسٹ ممالک میں جہاں چاروں طرف آہنی دیواریں کھڑی ہیں، سرحدیں بند ہیں، ہر چیز پر خاص کر تعلیم و تربیت پر سنسر شپ قائم ہے "استعمار فکری" کے نشانات اچھی طرح سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن مغربی سرمایہ دار ممالک میں جہاں یہ چیزیں نہیں ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی ہے جبکہ آزادیٔ خیال بھی حاصل ہے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جو چاہے سوچے اور جس کا جو چاہے انتخاب کرے، وہاں یہ کام ایک دوسری طرح انجام پذیر ہوتا ہے کیونکہ ان مقامات پر بڑے بڑے سرمایہ داروں کا نشر و اشاعت، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر پہرہ ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے ذریعے آزادیٔ فکر و عقیدہ کے لباس میں اپنے افکار و عقائد کو غریب عوام پر سوار کر دیتے ہیں اور مسلسل "برین واشنگ" کے ذریعے وہ دنیا کو ادھر ہی لے جاتے ہیں جدھر ان کا دل چاہتا ہے اور دورِ حاضر کے لیے ایک بلائے عظیم ہے۔

اس کے بعد فرعون نے اس جملہ کا اضافہ کیا: یہ پلان ہے جو تم نے اس شہر میں اس لیے بنایا ہے کہ اس کے رہنے والوں کو یہاں سے باہر نکال دو (ان هٰذا لمکر مکرتموه فی المدینة لتخرجوا منهآ اهلها)۔

سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۱ میں ہے:

"انهٗ لکبیرکم الذی علمکم السحر"

"موسیٰ بڑا استاد ہے تمہارا، جس نے تم کو یہ جادو سکھایا ہے"

اگر اس پر نظر کی جائے تو معلوم ہو گا کہ فرعون کا مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں نے کافی عرصے سے مصر کی حکومت پر قبضہ جمانے اور لوگوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی اسکیم بنا رکھی ہے یہ ان چند دنوں کی بات نہیں ہے۔

اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۔ مدینہ ۔ سے مراد صرف شہر مصر نہیں بلکہ پورا مصر ملک ہے۔ جیسا کہ ۔ المدینۃ ۔ کے الف و لام سے ظاہر ہے جو کہ جنس کے اعتبار سے آیا ہے۔ کیونکہ جملہ " لتخرجوا منھا اھلھا " سے مراد ہے موسیٰ اور بنی اسرائیل کا تمام مصر پر تسلط اور فرعون اور اس کے اطرافیوں کو تمام اہم مقامات سے نکال دینا یا ان میں سے ایک جماعت کو دور دراز کے مقامات کی طرف جلا وطن کر دینا۔ نیز اسی سورت کی آیت ۱۱۰ بھی اسی مدعا پر دلالت کرتی ہے۔

بہر حال یہ تہمت اس قدر بے بنیاد اور رسوا کن ہے کہ سوائے عوام الناس اور بے خبر افراد کے کوئی بھی اسے قبول نہیں کر سکتا تھا کیونکہ موسیٰ سرے سے مصر میں موجود ہی نہ تھے نہ کسی شخص نے ان کو ساحروں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگر وہ ان کے مشہور استاد تھے تو وہ یقینی طور سے اس سے قبل ان کے ہمراہ دیکھے جاتے اور بہت سے لوگ ان کو جانتے پہچانتے ، اگر حضرت موسیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ کسی طرح کی سازش کی ہوتی تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے بآسانی چھپایا جا سکے کیونکہ گنتی کے چند لوگوں کے درمیان تو سازش ہو سکتی ہے مگر ہزاروں جادوگروں کے درمیان جو مختلف دُور دراز کے علاقوں سے آئے تھے ایسی سازش کیسے کی جا سکتی ہے ؟

اس کے بعد فرعون نے ایک سربستہ اور انتہائی شدید جملے میں انہیں دھمکی دی : لیکن تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا (فسوف تعلمون)۔

ٌ

اس کے بعد کی آیت میں اس خفیہ دھمکی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے : مَیں قسم کھاتا ہوں کہ مَیں تمہارے ہاتھوں اور پَیروں کو ایک دوسرے کے الٹ (ایک طرف کا ہاتھ تو دوسری طرف کا پَیر) کاٹ دوں گا اس کے بعد تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا (لاقطعنّ ایدیکم وارجلکم من خلاف ثم لاصلبنّکم اجمعین)۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو بڑی اذیتیں دے کر قتل کرے اور دیکھنے والوں کے سامنے بڑا ہولناک اور عبرتناک منظر پیش کرے کیونکہ ان کے ہاتھ پَیروں کا قطع کرنا اس کے بعد سُولی پر لٹکانا اس بات کا سبب تھا کہ ان کے بدن سے فوارے کی طرح خون جاری ہو اور وہ بلندی پر اپنے ہاتھ پَیر ماریں اور تڑپ تڑپ کر جان دیں (توجہ رہے کہ اس زمانے میں سولی کے لیے گردن میں پھندا نہیں ڈالتے تھے بلکہ زیر بغل رسّی ڈال کر لٹکا دیتے تھے)۔

شاید الٹی طرف سے ہاتھ پیر کاٹنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دیر میں اپنی جان دیں اور ان کی اذیت اور تکلیف کی مدت طولانی ہو جائے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فرعون نے ان ساحروں کو مغلوب کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا یہ ایک عام منصوبہ تھا جو جابر حکمران اہلِ حق کو زیر کرنے کے لیے ہر دور میں بنایا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگا کر رائے عامہ ان کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسری طرف ان کو زندان، تعذیب اور قتل کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے حضرت موسیٰ کے قصے میں دیکھا ہے فرعون کے ان دونوں حربوں میں سے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ اور کامیاب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

٭

ان دونوں حربوں کے مقابلہ میں جادوگروں نے میدان مقابلہ کو خالی نہ کیا بلکہ یکدل و یک زبان ہو کر یہ جواب دیا: ہم تو اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے (قالوآ انآ الٰی ربنا منقلبون)۔

یعنی اے فرعون! اگر تیری آخری تہدید صورتِ عمل میں آجائے اور تو ہم کو قتل بھی کر دے تو اس سے نہ صرف ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ اس سے ہماری دلی مراد حاصل ہوگی اور ہم شربتِ شہادت پی کر جنت میں جائیں گے اور یہ ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرعون کی تہمت باطل کرنے کے لیے اور اس مجمع کے سامنے جو اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اس طرح کہا: اصل اعتراض تیرا ہم پر صرف یہ ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی ان آیتوں پر ایمان لے آتے ہیں جو ہماری طرف آئی ہیں (وما تنقم منآ الآ ان اٰمنا باٰیات ربنا لمّا جآءتنا)۔

یعنی ہم لوگ نہ تو ہنگامہ پرور ہیں اور نہ ہم نے تیرے خلاف کوئی سازش کی ہے، نہ ہم اس لیے موسیٰ پر ایمان لاتے ہیں کہ حکومت ہمیں مل جائے یا اس سرزمین کے لوگوں کو یہاں سے باہر نکال دیں، تو خود جانتا ہے کہ ہم لوگ ایسے نہیں ہیں، بلکہ ہم نے جب حق کو دیکھا اور اس کی نشانیوں کو بخوبی پہچان لیا تو ہم نے اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہی اور ایمان لے آئے، ہمارا سارا گناہ تیری نظر میں یہی ہے اور بس!

درحقیقت انہوں نے اپنے پہلے جملے سے فرعون پر یہ ثابت کیا کہ ہم تیری دھمکیوں سے بالکل نہیں ڈرتے اور بڑے ثباتِ قدم کے ساتھ موت کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، پھر اس کے بعد دوسرے جملے سے انہوں نے ان تہمتوں کا جواب دیا جو فرعون نے ان پر لگائی تھیں۔

لفظ "تنقم" مادہ "نقمت" (بروزن "نعمت") سے ہے۔ اس کا اصلی معنی ہے زبان سے یا

عمل اور سزا کے ذریعے کسی شے کا انکار کرنا۔ اس بنا پر آیہ مذکورہ بالا کے معنی یہ ہوں گے کہ تیرا ایک ہی اعتراض ہم پر یہ ہے کہ ہم لوگ ایمان لے آئے ہیں، یا یہ معنی ہوں گے کہ تو ہمیں صرف اس بنا پر سزا دے رہا ہے کہ ہم نے ایمان قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرعون کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور خدا کی بارگاہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے صبر و استقامت کی التجا کی، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بغیر خدا کی تائید و توفیق کے ان میں اتنی سخت دھمکیوں اور سزاؤں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا: خدایا! صبر کا پیمانہ ہمارے اوپر انڈیل دے اور ہمارے اخلاص و ایمان کو آخری لحاتِ زندگی تک باقی رکھ (ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چونکہ انہیں پتہ تھا کہ خطرہ اپنے آخری درجہ تک پہنچ گیا ہے لہٰذا انہوں نے اس "افرغ علینا صبراً" کہہ کر خدا سے درخواست کی کہ تو بھی ہمیں صبر و استقامت کا آخری درجہ عطا کر دے (کیونکہ لفظ "افرغ" مادّہ "افراغ" سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی برتن سے کسی سیال شئے کو اس طرح انڈیل دیا جائے کہ برتن میں کچھ بھی باقی نہ رہ جائے۔

آگاہی اور استقامت

ممکن ہے کسی شخص کو اس بات پر تعجب ہو کہ ان جادوگروں کی اتنی جلدی کایا پلٹ کیسے ہوگئی کہاں تو وہ موسیٰ کے مقابلے کی ٹھان کر آئے تھے اور کہاں یہ کہ وہ فوراً مومنین کی صف میں آگئے۔ پھر مومن بھی ایسے کہ انہیں ہر قسم کی قربانی اور فداکاری سے بھی کوئی باک نہ تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اتنے کم عرصے میں کسی انسان کے ذہن میں اتنا زبردست انقلاب آجائے کہ وہ صفِ مخالف سے بالکل کٹ کر صفِ موالف میں مل جائے اور اتنی سختی سے اپنے نئے عقیدہ پر ڈٹ جائے کہ اپنے مقام اور زندگی سب کو نظر انداز کر دے اور مردانہ وار بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ شربتِ شہادت کے آخری گھونٹ کو بھی پی جائے۔

لیکن اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں کہ وہ جادوگر جو علمِ سحر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے وہ اپنے علم کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی عظمت سے اچھی طرح آگاہ ہو گئے اور انہوں نے پوری آگہی کے ساتھ اس میدان میں اپنا قدم رکھا۔ ان کی یہ واقفیت و آگاہی ان کے اس عشقِ سوزاں کا سرچشمہ بن گئی، جس نے ان کے سارے وجود کا احاطہ کر لیا ایک ایسا عشق جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور جو انسان کی تمام خواہشوں سے مافوق ہے۔

انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ انہوں نے کس راستے پر اپنا قدم رکھا ہے، وہ کس واسطے جنگ کر

رہے ہیں، کس سے جنگ کر رہے ہیں اور اس جنگ کے نتیجہ میں کیسا روشن مستقبل ان کے انتظار میں ہے ؟ !

یہی وجہ ہے کہ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے بڑی صراحت و شجاعت کے ساتھ (جیساکہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۲ میں آیا ہے) یہ کہا :

قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہم تجھے ان روشن دلائل پر ہرگز ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے رب کی طرف سے ہمارے پاس آئے ہیں، تیرا جو دل چاہے کرلے لیکن یہ جان لے کہ تیری قدرت کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود ہے ۔

آخر کار ۔ جیساکہ تواریخ اور روایات میں ہے ، ان لوگوں نے اس راہ میں اس قدر پامردی و استقامت کا مظاہرہ کیا کہ فرعون نے اپنی دھمکی کو پورا کر دکھایا اور ان کے مثلہ شدہ بدنوں کو دریائے نیل کے کنارے کھجور کے درختوں کی شاخوں پر آویزاں کر دیا ، جس کی وجہ سے ان کا پُرافتخار نام ہمیشہ کے لیے دنیا کے حریت پسندوں کی فہرست میں ثبت ہوگیا اور بقول مفسّر بزرگوار علامہ طبرسی :

"کانوا اول النهار کفاراً سحرة و اٰخر النهار شهداء بررة"

وہ صبح کے وقت کافر جادوگر تھے اور عصر کے وقت شہید و نیکوکار ہوگئے ۔

لیکن توجہ رہے کہ اس طرح کا انقلاب و استقامت بجز الٰہی تائید کے ممکن نہیں ہے ۔ یہ بات مسلّم ہے کہ جو لوگ سچے دل سے خدا کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں خدا کی مدد بھی ان کی تلاش میں آتی ہے ۔

(۱۲۷) وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝

(۱۲۸) قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

(۱۲۹) قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۲۷) قوم فرعون کے سرداروں نے اس سے کہا : آیا موسٰی اور ان کی قوم کو آزاد چھوڑ دے گا کہ وہ زمین میں فساد کرتے پھریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو ترک کردیں ۔ (فرعون نے) کہا عنقریب مَیں ان کے لڑکوں کو قتل کردوں گا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دوں گا (تاکہ وہ ہماری خدمت کریں) اور ہم پورے طور سے ان پر مسلط ہیں ۔

(۱۲۸) موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر اختیار کرو کہ زمین خدا ہی کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے ۔

(۱۲۹) انہوں نے کہا کہ (اے موسٰی) تمہارے آنے سے قبل بھی ہم نے بہت اذیتیں دیکھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ہم دُکھ جھیل رہے ہیں (آخر ان مصائب کا کب خاتمہ ہوگا ؟) موسٰی نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا اور تمہیں زمین میں اس کا جانشین بنا دے گا تاکہ وہ دیکھے کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو ۔

تفسیر

ان آیات میں فرعون اور اس کے اطرافیوں کی ایک اور گفتگو حضرت موسٰیؑ کے بارے میں نقل کی گئی ہے اور جیسا کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے یہ گفتگو موسٰیؑ اور جادوگروں کے مقابلے کے بعد ہوئی تھی ۔

پہلی آیت میں ہے کہ: قوم فرعون کے سرداروں نے بطورِ اعتراض اس سے کہا: آیا موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ان کی حالت پر آزاد چھوڑ دے گا تاکہ وہ زمین میں فساد کریں، اور تجھے اور تیرے خداؤں کو ترک کر دیں (وقال الملأ من قوم فرعون أتذر موسٰی وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک وآلھتک)۔

اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ سے شکست کھانے کے بعد فرعون نے ایک مدت تک انہیں اور بنی اسرائیل کو کھلا چھوڑ دیا تھا (اگرچہ یہ آزادی بہت محدود تھی) لیکن موسیٰ اور ان کے ماننے والے بھی خالی نہ بیٹھے اور حضرت موسیٰ کے آئین کی تبلیغ میں مصروف رہے یہاں تک کہ قوم فرعون کو ان کی ان سرگرمیوں کا پتہ چلا اور انہیں اندیشہ لاحق ہوا چنانچہ وہ لوگ فرعون کے پاس آئے اور اسے اس بات کی طرف آمادہ کرنا چاہا کہ وہ موسیٰ اور ان کی قوم پر سختی کرے۔

آیا یہ محدود آزادی اس معجزہ کی وجہ سے تھی جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے ذریعے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا تھا؟ یا اس اختلاف کی وجہ سے تھی جو اہلِ مصر کے درمیان حتیٰ کہ خود قبطیوں کے درمیان حضرت موسیٰ اور ان کے آئین کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے کچھ لوگ ان کی جانب مائل ہو گئے تھے، اور فرعون یہ دیکھ رہا تھا کہ ان حالات میں وہ ان کے خلاف کوئی سخت اقدام نہیں کر سکتا تھا؟ دونوں احتمالوں کا امکان ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے یکجا فرعون کے ذہن پر اپنا اثر کیا ہو۔

بہر حال فرعون پر ان باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے ان لوگوں کے جواب میں کہا: میں جلد ہی ان کے لڑکوں کو قتل کروں گا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دوں گا (تاکہ ان سے خدمت لی جائے)، اور ہم ان پر اچھی طرح قابو رکھتے ہیں (قال سنقتل ابناءھم ونستحی نساءھم وانا فوقھم قاھرون)۔

لفظ "آلھتک" (تیرے خداؤں) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ جو بات اس آیت کے ظاہر سے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ فرعون نے بھی اپنے لیے کچھ بت اور خدا بنا رکھے تھے۔ اگرچہ سورہ نازعات کی آیت ۲۴ "انا ربکم الاعلیٰ" اور سورہ قصص کی آیت ۳۸ "ما علمت لکم من الٰہ غیری" سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ مصر سب سے بڑا خدا فرعون کو سمجھتے تھے یا کم از کم وہ خود اپنے کو ایسا سمجھتا تھا اور اپنی سطح کا کوئی دوسرا خدا اس کی نظر میں نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لیے کچھ معبود بنا رکھے تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ فرعون نے اس مقام پر ایک گہری سیاست شروع کی اور ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کی قوت و قدرت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، وہ تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے مردوں کا خاتمہ کر دے تاکہ وہ کبھی اس سے مقابلہ نہ کر سکیں اور عورتوں

اور لڑکیوں کو کنیزی اور خدمت کے لیے باقی رکھے، یہ ہر قدیم و جدید استعمار کا ایک زبردست طریقہ ہے جس کی وجہ سے مثبت و فعال افراد قوم کی آغوش سے چھین لیے جاتے ہیں اور ان کو نابود کر دیا جاتا ہے، یا پھر ان سے مردانگی اور شجاعت کے جوہر کو طرح طرح کے حیلوں اور دسیلوں سے سلب کر لیا جاتا ہے اور افراد غیر فعال کو زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔

مزید یہ احتمال موجود ہے کہ فرعون چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی ہمت دو طرح سے ٹوٹ جائے ایک تو لڑکوں کا قتل، دوسرے ناموس کا خطرہ۔ مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل ان دو حربوں سے گھبرا کر دشمن کے چنگل میں خوب اچھی طرح سے جکڑ جائیں۔

بہر حال جملہ "انا فوقھم قاھرون" اس بات کی حکایت کرتا ہے کہ فرعون یہ کہہ کر یہ چاہتا تھا کہ ہر قسم کی فکرمندی اپنے تابعین کے دل سے دور کرے اور انہیں یہ اطلاع دے کہ حالات پورے طور سے اس کے قابو میں ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک سوال یہ درپیش آتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ کو کیوں نہ قتل کر دیا اور صرف بنی اسرائیل کے قتل کا تہیہ کیوں کیا؟

اس کا جواب سورۂ مومن کی آیات سے بخوبی مل جاتا ہے جن میں ہے کہ ابتدا میں فرعون نے ایسا ہی چاہا تھا کہ موسیٰ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دے لیکن جب فرعون کو مؤمن آلِ فرعون نے یہ دھمکی آمیز نصیحت کی کہ موسیٰ کا قتل ہوسکتا ہے کہ خطرناک واقع ہو اور وہ واقعاً خدا کے نبیٔ برحق ہوں اور جس عذاب سے وہ ڈراتے ہیں وہ تم کو آلے، تو اس کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور اسے موسیٰ کے قتل کی ہمت نہ ہوئی۔

علاوہ بریں جب حضرت موسیٰ کو جادوگروں پر غلبہ حاصل ہوا تو اس کا قہری نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مصر میں اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ حضرت موسیٰ کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے مخالف و موافق ایسے موقع پر فرعون نے خیال کیا کہ اگر اس نے موسیٰ کے متعلق کوئی جارحانہ اقدام کیا تو ہوسکتا ہے کہ اس کا ردِّعمل اس کی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہو لہٰذا وہ ان کے قتل کے ارادے سے باز رہا۔

اس کے بعد کی آیت میں اس پروگرام کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کیا کہ وہ کس طرح سے فرعون کا مقابلہ کریں اور یہ کہ وہ کس طرح فتحیاب ہوسکتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اگر تین شرطوں پر عمل کرو گے تو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ پہلے یہ کہ تمہارا بھروسہ صرف خدا پر ہو اور اسی سے

مدد مانگو" (قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ)۔

دوسری بات جو حضرت موسیٰ نے ان سے کہی وہ یہ تھی: پامردی اور ثابت قدمی کو کسی حال میں نہ چھوڑو۔ اور دشمن کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر میدان نہ چھوڑو (واصبروا)۔

اس مطلب کی مزید تاکید کے لیے اور اس کی دلیل بیان کرنے کے لیے موسیٰ ان سے کہتے ہیں: ساری زمین صرف اللہ کی ہے، وہی اس کا مالک و مختار ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے (ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ)۔

اور آخری شرط یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو کیونکہ "فتحیابی پرہیزگاروں کے لیے ہے" (والعاقبۃ للمتقین)۔

یہ تینوں شرطیں جن میں سے ایک عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے (خدا سے طلبِ استقامت) اور دوسری اخلاق سے متعلق ہے (صبر و استقامت) اور تیسری کا تعلق عمل سے ہے (تقویٰ و پرہیزگاری) صرف بنی اسرائیل کی ان کے دشمن پر فتحیابی کی شرطیں نہ تھیں بلکہ ہر قوم و ملت جو اپنے دشمن پر غالب آنا چاہتی ہے بغیر اس سہ نکاتی پروگرام کے کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ بے ایمان افراد اور سست اور ڈرپوک لوگ اور وہ قومیں جو گنہگار اور تباہ کار ہیں اگر فتحیاب ہو بھی جائیں تو ان کی یہ کامیابی وقتی اور چند روزہ ہوگی۔

یہ بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ یہ تینوں نکات ایک دوسرے کی شاخ ہیں کیونکہ پرہیزگاری بغیر شہوات و خواہشات کے مقابلے میں صبر و استقامت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ صبر و استقامت بغیر خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان کے باقی نہیں رہ سکتی۔

☼

آخر میں وہ شکوہ بیان کیا گیا ہے جو ان مشکلات سے پیدا ہوا جو بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے قیام کی وجہ سے پیش آئیں فرماتا ہے: "انہوں نے موسیٰ سے کہا: تمہارے آنے سے پہلے بھی یہ لوگ ہمیں تکلیفیں پہنچاتے تھے، اب جب سے تم آگئے ہو تب بھی ان کی اذیت رسانی جاری ہے" پس ہمارے لیے کب کشائش پیدا ہوگی (قالوآ اوذینا من قبل ان تأتینا ومن بعد ما جئتنا)۔

گویا بنی اسرائیل ہمارے بہت سے افراد کی طرح اس بات کے امیدوار تھے کہ حضرت موسیٰ کے قیام کے ساتھ ہی ایک رات کے اندر ان کے تمام مصائب کا خاتمہ ہو جائے، فرعون ہلاک ہو جائے، فرعون والے بھی سب فنا ہو جائیں اور مصر کی لمبی چوڑی سلطنت اپنے تمام خزانوں اور ذخیروں کے ساتھ ان کے اختیار میں آجائے اور یہ سب باتیں معجزہ کے طور پر وقوع پذیر ہوں جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو کسی طرح کی کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن حضرت موسیٰ نے ان کو سمجھایا کہ وہ آخر کار فتحیاب تو ہوں گے لیکن اس کے لیے ان کو ایک طولانی راستہ طے کرنا پڑے گا اور یہ فتحیابی جیسا کہ اللہ کی سنّت اور طریقہ ہے صبر و استقامت کے جوہر دکھانے کے بعد حاصل ہوگی جیسا کہ زیر بحث آیت کہہ رہی ہے: موسیٰ نے کہا امید ہے کہ خدا تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردے گا اور تم کو زمین میں ان کا جانشین قرار دے گا (قال عسٰی ربکم ان یہلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض)۔

یہاں پر لفظ "عسٰی" (جس کے معنی شاید اور امید کے ہیں) لفظ "لعل" کی طرح جو بہت سی آیات میں آیا ہے، درحقیقت اس مطلب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ تمہاری اس فتحیابی و کامیابی کی کچھ شرطیں ہیں جن کے بغیر تم کامیاب نہیں ہو سکتے (اس کی مزید توضیح کے لیے سورۂ نسار کی آیت ۸۴ کی تفسیر اسی کتاب کی جلد چہارم میں ملاحظہ ہو)۔

آیت کے آخر میں فرماتے ہیں: خدا تمہیں یہ نعمتیں عطا کرے گا اور تمہاری کھوئی آزادی تمہیں دوبارہ لوٹائے گا" تاکہ یہ دیکھے کہ اس کے مقابلے میں تمہارا عمل کیسا ہوتا ہے" (فینظر کیف تعملون)۔

یعنی کامیابی کے بعد تمہاری آزمائش کا دور شروع ہو جائے گا، ایک ایسی ملت کی آزمائش جو پہلے اپنے دامن میں کچھ نہ رکھتی تھی اس کے بعد خدا کے فضل سے اس کا دامن نعمات الٰہی سے مالامال ہوگیا۔

اس تعبیر میں ضمنی حیثیت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والے زمانے میں تم لوگ اس آزمائش پر پورا نہ اتر سکو گے بلکہ تمہارے ہاتھ میں بھی جب قدرت و حکومت آجائے گی تو دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی ظلم و فساد پر اتر آؤ گے۔

ایک روایت میں جو کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، میں ہے:

قال وجدنا فی کتاب علی صلوات اللہ علیہ ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین انا واھل بیتی الذین اورثنا اللہ الارض ونحن المتقون[1]

یعنی کتاب حضرت علی علیہ السلام میں ہم نے اس طرح لکھا ہوا دیکھا کہ آیت:
ان الارض للہ الخ سے مَیں اور میرے اہلبیت مراد ہیں اور ہم ہی وہ افراد ہیں جن کو خدا آخر میں زمین منتقل کردے گا اور ہم حقیقی متقین ہیں۔

اس حدیث سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور اب بھی زمین پر وہ پرہیزگار موجود ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۶۔

(۱۳۰) وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

(۱۳۱) فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۳۰) اور ہم نے قومِ فرعون کو خشک سالی اور میووں کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ وہ بیدار ہو جائیں۔

(۱۳۱) لیکن انہوں نے (نہ صرف یہ کہ نصیحت قبول نہ کی بلکہ) جب انہیں کوئی اچھائی (اور نعمت) ملی تو وہ کہتے تھے کہ یہ خود ہماری وجہ سے ہے! پھر جب کوئی برائی (اور مصیبت) آتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سے ہے! کہو ان تمام بدفالیوں کا سرچشمہ خدا کے پاس ہے (وہ تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے تم کو سزا دیتا ہے) لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

بیدار کرنے والی سزائیں

جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۹۴ میں گزرا ہے کہ ایک کلی قانون تمام پیمبروں کے لیے یہ تھا کہ جب ان کو لوگوں کی مخالفت کا سامنا ہوا اور وہ کسی طرح سے راہِ راست پہ نہ آئیں تو خدا ان کو بیدار کرنے کے لیے مشکلات و مصائب میں گرفتار کرتا تھا تاکہ وہ اپنے میں نیازمندی اور محتاجی کا احساس کریں، اور

ان کی فطرتِ توحید جو آرام و آسائش کی وجہ سے غفلت کے پردوں میں چلی گئی ہے دوبارہ ابھر آئے اور ان کو اپنی ضعف و ناتوانی کا اندازہ ہو اور اس قادر و توانا ہستی کی جانب متوجہ ہوں جو ہر نعمت و نقمت کا سرچشمہ ہے۔

پہلی آیت میں اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے: ہم نے آلِ فرعون کو قحط، خشک سالی اور ثمرات کی کمی میں مبتلا کیا شاید متذکر بیدار ہو جائیں (ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین و نقص من الثمرات لعلھم یذکرون)۔

"سنین" جمع ہے "سنة" کی جس کے معنی سال کے ہیں، لیکن عام طور سے جب یہ لفظ "اخذ" کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی قحط سالی کے ہو جاتے ہیں۔ بنابرین "اخذہ السنة" (سال نے اس کو پکڑا) کے معنی ہیں کہ وہ خشک سالی میں مبتلا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قحط سالی کے سال بہ نسبت دوسرے سالوں کے کم ہیں لہٰذا جب کہا گیا کہ اس کو سال نے پکڑ لیا اور اس سے عام سال مراد ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں اس لیے اس سے مراد وہ سال ہوں گے جو کم آتے ہیں تاکہ ایک نئی بات سمجھ میں آئے اور وہ خشک سالی کے سال ہیں۔

لفظ "آل" دراصل "اھل" تھا پھر اس میں قلب واقع ہوا اور اس حالت میں ہو گیا، اور "اہل" کے معنی ہیں "انسان کے قریبی اور خاص آدمی چاہے وہ اس کا قریبی عزیز ہو یا اس کا ہم خیال ہم مسلک و اطرافی ہو"

باوجودیکہ قحط سالی نے فرعونیوں کو گھیر لیا تھا لیکن آیہ مذکورہ بالا میں صرف فرعون کے مخصوصین کا ذکر کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بیدار ہو گئے تو سب لوگ بیدار ہو جائیں گے کیونکہ تمام لوگوں کی نبض انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ چاہیں تو بقیہ افراد کو گمراہ کریں یا ہدایت کریں۔

اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ خشک سالی اہل مصر کے لیے ایک بلائے عظیم شمار ہوتی تھی کیونکہ مصر پورے طور سے ایک زرعی مملکت تھی اس بنا پر اگر زراعت نہ ہو تو اس کا اثر ملک کے تمام افراد پر پڑتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فرعون اور اس کے افراد چونکہ ان زمینوں کے مالک اصلی تھے اسلیے فی الحقیقت وہ سب سے زیادہ اس سے متاثر ہوئے تھے۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خشک سالی کئی سال تک باقی رہی کیونکہ "سنین" جمع کا صیغہ ہے خصوصاً "نقص من الثمرات" کا بھی اضافہ ہوا ہے (میووں کی کمی) کیونکہ خشک سالی اگر وقتی ہو تو درختوں پر اتنا اثر انداز نہیں ہوا کرتی لیکن اگر طولانی ہو جائے تو درختوں کو بھی نابود کر دیتی ہے اگرچہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خشک سالی کے علاوہ کوئی اور آفت بھی درختوں کو آگئی ہو۔

جملہ "لعلھم یذکرون" سے گویا اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حقیقت توحید کی طرف

توجہ ہر انسان کی سرشت میں ابتدا سے پوشیدہ ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ غلط تربیت کی وجہ سے، یا نعمتوں میں مست ہو جانے کے باعث انسان اس کو بھول جاتا ہے، لیکن جب مشکلوں میں پھنستا ہے تو دوبارہ پھر خدا یاد آتا ہے، مادّہ "تذکر" جس کے معنی یاد آوری کے ہیں اس مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ آیہ ۹۴ کے ذیل میں جو جملہ "لعلهم يضرعون" (شاید وہ خدا کے سامنے خضوع اور فروتنی اختیار کریں) آیا ہے، فی الحقیقت پہلا جملہ "لعلهم يذكرون" اسی کا مقدمہ ہے کیونکہ انسان پہلے حالت "تذکر" میں آتا ہے اس کے بعد فروتنی اور سپردگی کی منزل پر فائز ہوتا ہے۔

لیکن۔ آل فرعون، بجائے اس کے کہ ان الٰہی تنبیہوں سے نصیحت لیتے اور خوابِ خرگوش سے بیدار ہوتے انہوں نے اس سے سوء استفادہ کیا اور ان حوادث کی من مانی تفسیر کی: "جب حالات ان کے منشا کے مطابق ہوتے تھے تو وہ راحت و آرام میں ہوتے تھے اور کہتے کہ یہ حالات ہماری نیکی و لیاقت کی وجہ سے ہیں! فی الحقیقت ہم اس کے اہل و لائق ہیں (فاذا جاءتهم الحسنة قالوا لنا هذه)۔

"لیکن جس وقت وہ مشکل و مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو اس کو فوراً موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے سر باندھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ان کی بد قدمی کی وجہ سے ہوا ہے (وان تصبهم سيئة يطيروا بموسٰى ومن معه)۔

"يطيروا" مادّہ "تطیّر" سے ہے جس کے معنی بد فالی کرنے کے ہیں، اس کی اصل کلمہ "طیر" (پرندہ) ہے۔ چونکہ عربوں میں رسم تھی کہ وہ پرندوں کے ذریعہ فالِ بد لیا کرتے تھے، کبھی کوّے کی آواز کو منحوس جانتے تھے، کبھی کسی پرندہ کے چپ سے راست کی طرف اڑنے سے بد فالی لیتے تھے، اس لیے کلمہ "تطیّر" ہر بد فالی کے لیے بولا جانے لگا۔

لیکن قرآنِ کریم ان کے جواب میں کہتا ہے: "ان کی بد بختیوں اور تکلیفوں کا سر چشمہ خدا کی طرف سے ہے خدا نے یہ چاہا ہے کہ اس طرح ان کو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے سزا دے لیکن ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے" (الا انما طائرهم عند الله ولكن اكثرهم لا يعلمون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر کوئی فرعونیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا، آج کل کے زمانہ میں بھی خود خواہ اور خود پسند قوموں میں یہ صفتِ بد دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ حقیقتوں کو بدلنے کے لیے اور اپنے وجدان کو یا دوسرے لوگوں کو فریب دینے کے لیے جب بھی ان کو کوئی کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اس کو اپنی لیاقت کی طرف منسوب کرتے ہیں چاہے ان کی لیاقت و استعداد کو اس میں ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو، اور جس وقت کوئی بدبختی ان کا دامن پکڑتی ہے تو اس کو اپنے مخفی یا آشکار دشمن کی

طرف نسبت دیتے ہیں چاہے وہ خود اس کا اصل سبب ہوں۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ دشمنانِ پیغمبرِ اسلامؐ بھی ان کے خلاف ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے (سورۂ نساء آیت ۷۸) دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ گمراہ انسانوں کا یہی حال ہے (سورۂ فصلت آیت ۵۰) اور یہ درحقیقت خود خواہی، ضد اور غرور کا ایک زبردست مظہر ہے [1]

فالِ نیک و بد

مختلف قوموں میں فالِ نیک و بد کا رواج شاید پہلے سے چلا آرہا ہے، لوگ کچھ چیزوں سے "فالِ نیک" لیا کرتے تھے اور ان کو اپنی فتحیابی اور کامیابی کی دلیل خیال کرتے تھے اور کچھ چیزوں کو "فالِ بد" سمجھتے تھے اور ان کو اپنی شکست کی دلیل سمجھتے تھے حالانکہ کامیابی یا ناکامی کو ان چیزوں سے دُور کا لگاؤ بھی نہ تھا خصوصاً فالِ بد میں تو سراسر خرافاتی پہلو اور حد درجہ کی نامعقولیت تھی اور اب بھی ہے۔

ان دونوں طرح کی فالوں کا اگرچہ کوئی اثر طبیعی (NATURAL RESULT) حقیقت میں نہیں ہوتا لیکن بلاشبہ ان کا نفسیاتی اثر مرتب ہوسکتا ہے۔ فالِ نیک بالعموم پُرامید بناتی ہے اور سرگرم عمل ہونے کا سبب بنتی ہے جبکہ "فالِ بد" ناامیدی، سُستی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ روایاتِ اسلامی میں فالِ نیک سے نہیں روکا گیا ہے لیکن "فالِ بد" سے شدت سے منع کیا گیا ہے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا:

تفألوا بالخير تجدوه۔

کاموں میں فالِ نیک سے کام لیا کرو (اور پُرامید رہو) تاکہ مقصد تک پہنچ جاؤ۔

اس میں اس کا اثباتی پہلو نمایاں ہے، بلکہ خود پیغمبرِ اسلامؐ اور پیشوایانِ عالی مقام علیہم السلام کے واقعات میں ہے کہ وہ بعض اوقات مسائل میں فالِ نیک سے کام لیا کرتے تھے، مثلاً جب مسلمان واقعہ حدیبیہ میں کفارِ مکہ کے سامنے آئے تو اس میں سہیل بن عمرو کفار کا نمائندہ بن کر پیغمبرِ اسلامؐ کے پاس آیا اور حضرتؐ سے کسی نے کہا کہ سہیل آیا ہے تو آپؐ نے فوراً فرمایا:

"قد سهل عليكم امركم"

یعنی اس کا نام "سہیل" ہے میں یہ فال لیتا ہوں کہ تمہارے اوپر یہ کام سہل و

---

[1] ضمناً یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں پر "حسنہ" پر تو الف ولام آیا ہے اور "سیئۃ" پر تنوین آئی ہے اور نکرہ ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نعمتیں فراواں ان پر نازل ہوتی تھیں اور تکلیفیں کبھی کبھی آتی تھیں۔

آسان ہو جائے گا ۔[1]

مشہور تاریخ نویس " دمیری " جو آٹھویں صدی کا مورخ ہے وہ بھی اپنی ایک کتاب میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

پیغمبر اسلام فالِ نیک کو اس لیے پسند فرماتے تھے کہ انسان جب بھی فضلِ الٰہی کا امیدوار ہو گا تو نیکی کی راہ میں اپنے قدم آگے بڑھائے گا اور جب اس سے اپنی امید کو توڑ دے گا تو شر کے راستے پر چل پڑے گا فالِ بد لینا سبب ہے سوئے ظن ، انتظارِ بلا اور امیدِ بدبختی کا۔[2]

بہر حال ان وجوہ کی بنا پر " فالِ بد " جس کو عرب " تطیّر " اور " طیرہ " کہتے تھے ، جیسا کہ سابقاً اشارہ ہوا ہے روایاتِ اسلامی میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے ، قرآن مجید میں بھی بہ تکرار اس مطلب کا ذکر آیا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔[3] ایک حدیث پیغمبرِ اسلامؐ کی یہ ہے آپؐ نے فرمایا :

" الطیرة شرک "

فالِ بد نکالنا (اور اس کو انسانی تقدیر میں موثر جاننا) ایک طرح کا شرک ہے۔[4]

یہ بھی ہے کہ اگر فالِ بد کا بُرا اثر مرتب ہو بھی تو یہ اسی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ ہے جو فال لیتے وقت پیدا ہوئی ہے ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

" الطیرة علی ما تجعلها ان هونتها تهونت ، وان شددتها تشددت ، وان لم تجعلها شیئًا لم تکن شیئًا "

فالِ بد کا اثر اسی قدر ہے جتنا تم قبول کرو ، اگر اس کو سبک سمجھو تو اس کا اثر بھی سبک آسان ہو گا اور اگر اس کو سخت سمجھو تو نتیجہ بھی سخت نکلے گا اور اگر اس کی طرف اعتنا نہ کرو اور اس کی پرواہ نہ کرو تو اس کا کوئی اثر برآمد نہ ہو گا ۔[5]

اسلامی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" فالِ بد " سے مقابلے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی پرواہ نہ کی جائے ۔

نیز آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ فرمایا :

ثلاث لا یسلم منها احد ، الطیرة ، والحسد ، والظن ، قیل فما نصنع ؟ قال :

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۸۶ ۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۱۰۲ ۔

[3] جیسے سورۂ یٰسین آیت ۱۹ ، سورہ نمل آیت ۴۷ ، سورۂ اعراف آیت مورد بحث ۔

[4] المیزان در ذیل آیہ مورد بحث ۔

[5] المیزان در ذیل آیت مورد بحث ۔

اذا تطیرت فامض، واذا حسدت فلا تبغ، واذا ظننت فلا تحقق۔

تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے کوئی شخص محفوظ نہیں ہے (ان تین چیزوں کی وجہ سے عام لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے)، فالِ بد، حسد اور بدگمانی، لوگوں نے پوچھا تو پھر ہم کیا کریں؟ فرمایا: جب فالِ بد کا سامنا ہو تو اس کی پرواہ نہ کرو اور اپنا کام کر گزرو، اور جب دل میں حسد پیدا ہو تو اس کو عملی طور سے بجا نہ لاؤ اور جب کسی سے بدگمانی ہو تو تحقیق نہ کرو۔

عجیب بات یہ ہے کہ فالِ بد اور فالِ نیک کا رواج ترقی یافتہ اور صنعتی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے اور مشہور و معروف تاریخی شخصیتوں میں بھی یہ عادت موجود تھی اور ہے۔ جیسے مغربی ممالک میں ان چیزوں سے فال بد لی جاتی ہے: کسی سیڑھی کے نیچے سے گزرنا، نمکدان گر جانا، چاقو کا ہدیہ دینا۔

البتہ فالِ نیک کا مسئلہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا اکثر اس کا اثر مثبت نکلتا ہے لیکن فالِ بد کے رسم و رواج سے ہمیشہ مقابلہ کرنا چاہیئے اور اس بُری رسم کو لوگوں کے ذہنوں سے خارج کرنا چاہیئے۔ اس مقابلے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ روحِ ایمان کی تقویت کی جائے، دلوں میں خدا پر توکل و اعتماد پیدا کیا جائے۔ یہی روایاتِ اسلامی میں بھی وارد ہوا ہے۔

(۱۳۲) وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝

(۱۳۳) فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝

ترجمہ

(۱۳۲) اور انہوں نے کہا کہ (اے موسٰی) جب تم کوئی ایسی آیت ہمارے پاس لاؤ کہ اس سے تم ہم پر جادو کر دو ہم پھر بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۳۳) پس ہم نے ان پر (لگاتار بلائیں نازل کیں) طوفان، ٹڈیاں، زراعتی آفت،

مینڈک اور خون جو الگ الگ نشانیاں تھیں، بھیجیں (لیکن وُہ پھر بھی بیدار نہ ہوئے) اور انہوں نے تکبر کیا اور وہ گناہگار لوگ تھے۔

تفسیر

مختلف اور پیہم بلاؤں کا نزول

ان آیات میں ان بیدار کنندہ درسوں کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے جو خدا نے قوم فرعون کو دیئے۔ جب مرحلۂ اوّل یعنی قحط، خشک سالی اور مالی نقصانات نے ان کو بیدار نہ کیا تو دوسرے مرحلہ کی نوبت پہنچی جو پہلے مرحلہ سے شدید تر تھا۔ اس مرتبہ خدا نے ان کو پے در پے ایسی بلاؤں میں جکڑا جو ان کو اچھی طرح سے کچلنے والی تھیں۔ مگر افسوس ان کی اب بھی آنکھیں نہ کھلیں۔

پہلی آیت میں ان بلاؤں کے نزول کے مقدمہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں اپنے عناد کو بدستور باقی رکھا اور "کہا کہ تم ہرچند ہمارے لیے نشانیاں لاؤ اور ان کے ذریعے ہم پر اپنا جادو کرو ہم کسی طرح بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے" (وقالوا مهما تأتنا به من أية لتسحرنا بها فما نحن لك بمؤمنين)۔

لفظ "آیت" شاید انہوں نے ازراہِ تمسخر استعمال کیا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے معجزات کو آیاتِ الٰہی قرار دیا تھا، لیکن انہوں نے سحر قرار دیا۔

آیات کا لہجہ اور دیگر قرائن اس بات کے مظہر ہیں کہ فرعون کے پراپیگنڈہ کا محکمہ جو اپنے زمانے کے لحاظ سے ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا وہ حضرت موسیٰؑ کے خلاف ہر طرف سے حرکت میں آگیا تھا اس کے نتیجے میں تمام لوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا اور وہ یہ کہ اے موسیٰ! تم تو ایک زبردست جادوگر ہو! کیونکہ موسیٰؑ کی بات کو رد کرنے کا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا جس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں وہ گھر کرنا چاہتے تھے۔

٭

لیکن چونکہ خدا کسی قوم پر اس وقت تک اپنا آخری عذاب نازل نہیں کرتا جب تک کہ اس پر خوب اچھی طرح سے اتمامِ حجت نہ کرلے اس لیے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے پہلے طرح طرح کی بلائیں ان پر نازل کیں کہ شاید ان کو ہوش آجائے۔

پہلے "ہم نے ان پر طوفان بھیجا" (فارسلنا عليهم الطوفان)۔

"طوفان" مادّہ "طوف" (بروزن خوف) سے ہے جس کے معنی گھومنے اور طواف کرنے والی شے

کے ہیں۔ بعد ازاں ہر اس حادثے کو طوفان کہا جانے لگا جو انسان کو چاروں طرف سے گھیرے لیکن لغتِ عرب میں زیادہ تر "طوفان" ایسے تباہ کار سیلاب کو کہتے ہیں جو گھروں کو اجاڑ دے اور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دے (اگرچہ آج کل کی فارسی میں "طوفان" جھکڑ دار ہواؤں کو کہتے ہیں)[1]۔اس کے بعد ہم نے ان کی زراعتوں اور درختوں پر ٹڈیوں کو مسلط کر دیا" (والجراد)۔

روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ نے ان پر ٹڈیاں اس کثرت سے بھیجیں کہ انہوں نے درختوں کے شاخ و برگ کا بالکل صفایا کر دیا، حتیٰ کہ ان کے بدنوں تک کو وہ اتنا آزار پہنچاتی تھیں کہ وہ تکلیف سے چیختے چلاتے تھے۔

جب بھی ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ حضرت موسیٰ سے فریاد کرتے تھے کہ وہ خدا سے کہہ کر اس بلا کو مٹوا دیں طوفان اور ٹڈیوں کے موقع پر بھی انہوں نے جناب موسیٰ سے یہی خواہش کی جس کو موسیٰ نے قبول کر لیا اور یہ دونوں بلائیں برطرف ہو گئیں، لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی ضد پر اُتر آئے جس کے نتیجے میں تیسری بلا "قمل" کی ان پر نازل ہوئی (والقمل)۔

"قمل" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کے درمیان گفتگو ہوئی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی نباتاتی آفت تھی جو زراعت کو کھا جاتی تھی۔

جب یہ آفت بھی ختم ہوئی اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو اللہ نے مینڈک کی نسل کو اس قدر فروغ دیا کہ مینڈک ایک نئی بلا کی صورت میں ان کی زندگی میں داخل ہو گئے (والضفادع)[2]

جدھر دیکھتے تھے ہر طرف چھوٹے بڑے مینڈک نظر آتے تھے یہاں تک کہ گھروں کے اندر، کمروں میں، بچھونوں میں، دسترخوان پر کھانے کے برتنوں میں مینڈک ہی مینڈک تھے جس کی وجہ سے ان کی زندگی حرام ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے حق کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا اور ایمان نہ لائے۔

اس وقت اللہ نے ان پر خون مسلط کیا (والدّم)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خون سے مراد مرض نکسیر ہے جو ایک وبا کی صورت میں ان میں پھیل گیا، لیکن بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ دریائے نیل لہو رنگ ہو گیا اتنا کہ اس کا پانی کسی مصرف کے لائق نہ رہا!

آخر میں قرآن فرماتا ہے: ان معجزوں اور کھلی نشانیوں کو جو موسیٰ کی حقانیت پر دلالت کرتی تھیں ہم نے ان کو دکھلایا لیکن انہوں نے ان کے مقابلے میں تکبر سے کام لیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر

---

[1] جیسا کہ اردو میں بھی "طوفان" آج کل اسی مفہوم میں مروج ہے۔ (مترجم)

[2] "ضفادع" جمع ہے "ضفدع" کی جس کے معنی مینڈک کے ہیں یہ لفظ زیرِ بحث آیت میں جمع کے صیغہ میں آیا ہے لیکن دوسرے عذابوں کو واحد کے صیغہ میں ذکر کیا گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مینڈکوں کی مختلف قسموں کو خدا نے ان پر مسلط کیا تھا۔

دیا وہ ایک مجرم اور گنہگار قوم تھے (اٰیات مفصلات فاستکبروا وکانوا قوماً مجرمین)۔

بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلا ایک ایک سال کے لیے آتی تھی۔ یعنی ایک سال طوفان و سیلاب، دوسرے سال ٹڈیوں کے دل، تیسرے سال نباتاتی آفت اسی طرح آخر تک لیکن دیگر روایات میں ہے کہ ایک آفت سے دوسری آفت تک ایک مہینہ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ بہرکیف اس میں شک نہیں کہ ان آفتوں کے درمیان فاصلہ موجود تھا (جیسا کہ قرآن نے لفظ "مفصلات" سے تعبیر کیا ہے)، تاکہ ان کو تفکر کے لیے کافی موقع مل جائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ بلائیں صرف فرعون اور فرعون والوں کے دامن گیر ہوتی تھیں، بنی اسرائیل اس سے محفوظ تھے[1] بے شک یہ اعجاز ہی تھا لیکن اگر نکتۂ ذیل پر نظر کی جائے تو ان میں سے بعض کی علمی توجیہہ بھی کی جا سکتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مصر جیسی سرسبز و شاداب اور خوبصورت سلطنت جو دریائے نیل کے کناروں پر آباد تھی اس کے بہترین حصے وہ تھے جو دریا سے قریب تھے وہاں پانی بھی فراوان تھا اور زراعت بھی خوب ہوتی تھی تجارتی کشتیاں وغیرہ بھی دستیاب تھیں۔ یہ خطے فرعون والوں اور قبطیوں کے قبضے میں تھے جہاں انہوں نے اپنے قصر و باغات بنا رکھے تھے، اس کے برخلاف اسرائیلیوں کو دور دراز کے خشک اور کم آب علاقے دیئے تھے جہاں وہ زندگی کے یہ سخت دن گذارتے تھے کیونکہ ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔

بنا بریں یہ ایک طبیعی امر ہے کہ جب سیلاب اور طوفان آیا تو اس کے نتیجے میں وہ آبادیاں زیادہ متاثر ہوئیں جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھیں۔ اسی طرح مینڈک بھی پانی ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو قبطیوں کے گھروں کے آس پاس بڑی مقدار میں موجود تھا۔ یہی حال خون کا ہے کیونکہ رود نیل کا پانی خون ہوا تھا، ٹڈیاں اور زرعی آفتیں بھی باغات، کھیتوں اور سرسبز علاقوں پر حملہ کرتی ہیں لہٰذا ان عذابوں سے زیادہ تر نقصان قبطیوں ہی کا ہوتا تھا۔

جو کچھ آیاتِ فوق میں ذکر ہوا ہے اس کا ذکر موجودہ توریت میں بھی ملتا ہے لیکن کسی حد تک فرق کے ساتھ۔

(ملاحظہ ہو سفر خروج فصل ہفتم تا دہم توریت)۔

---

[1] مثلاً پانی جب خون ہوا ہے تو وہ صرف فرعون والوں کے لیے خون تھا مگر بنی اسرائیل کے لیے پانی تھا، حتیٰ کہ قبطی اسرائیلیوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے منہ میں پانی لے کر ہمارے منہ میں ڈال دو۔ جب اسرائیلی ایسا کرتے تھے تو وہ پانی جب تک ان کے منہ میں رہتا تھا پانی رہتا تھا لیکن جب وہ کسی قبطی کے منہ میں جاتا تھا تو خون ہو جاتا تھا، یہی حال مینڈکوں وغیرہ کا بھی تھا۔ (مترجم)

(۱۳۴) وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ج لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ ○

(۱۳۵) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَى أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ○

(۱۳۶) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ○

ترجمہ

(۱۳۴) جب ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے : اے موسٰی ! اپنے خدا سے کہو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اس کے مطابق کرے ، اگر اس بلا کو ہم سے دور کر دو گے تو ہم یقیناً تمہارے اوپر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے ۔

(۱۳۵) لیکن جب وہ ایک معینہ مدت تک پہنچتے تھے اور ہم ان سے بلا دُور کر دیتے تھے' تو وہ اپنے عہد کو توڑ دیتے تھے ۔

(۱۳۶) آخر کار ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو دریا میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے غافل رہے تھے ۔

تفسیر

بار بار کی عہد شکنیاں

ان آیات میں فرعونیوں کے اس ردّ عمل کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے پروردگارِ عالم کی عبرت انگیز

اور بیدار کنندہ بلاؤں کے نزول کے بعد ظاہر کیا، ان تمام آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت وہ بلا کے چنگل میں گرفتار ہو جاتے تھے، جیسا کہ عام طور سے تباہ کاروں کا دستور ہے، وقتی طور پر خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتے تھے اور فریاد و زاری کرنے لگتے تھے اور حضرت موسیٰؑ سے درخواست کرتے تھے کہ خدا سے ان کی نجات کے لیے دعا کریں۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ ان کے لیے دعا کرتے تھے اور وہ بلا ان کے سروں سے ٹل جاتی تھی۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جونہی وہ بلا سر سے ٹلتی تھی تو وہ تمام چیزوں کو بھول جاتے تھے اور وہ اپنی پہلی نافرمانی اور سرکشی کی حالت پر پلٹ جاتے تھے۔

پہلی آیت میں ہے جس وقت ان پر بلا مسلط ہوتی تھی تو کہتے تھے اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے خدا سے دعا کرو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اسے پورا کرے اور تمہاری دعا ہمارے حق میں قبول کرے (ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسی ادع لنا ربك بما عھد عندك)۔

"اگر تم یہ بلا ہم سے دُور کر دو تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم خود بھی تم پر ضرور ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی یقیناً تمہارے ہمراہ روانہ کر دیں گے" (لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لك ولنرسلن معك بنی اسرآئیل)۔

"رجز" بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً: سخت بلائیں، طاعون، بت اور بت پرستی وسوسۂ شیطانی، برف یا سخت اولے۔

لیکن یہ سب معانی اس ایک عام معنی کے مختلف مصداق ہیں جو اِن سب کی جڑ ہے کیونکہ اس لفظ کی اصل جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے "اضطراب" ہے اور علامہ طبرسی کی کتاب مجمع البیان کے مطابق اس کے اصلی معنی "انحراف از حق" کے ہیں۔ لہٰذا اگر سزاؤں اور عذابوں کو "رجز" کہا گیا ہے تو اس لیے کہ یہ سب حق سے روگردانی کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح بت پرستی بھی انحراف از حق اور اضطراب در عقیدہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اونٹ کی ایک بیماری کو بھی "رَجَز" (بروزن "مَرَض") کہتے ہیں۔ اس بیماری میں یہ ہوتا ہے کہ اونٹ کے پیر میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کوتاہ قدمی سے ٹھہرتا ہوا چلتا ہے۔ نیز اسی وجہ سے جنگی اشعار کو بھی "رجز" کہتے ہیں کیونکہ ان میں عام طور پر ہر "مقطع" کوتاہ اور نزدیک ہوتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا آیت میں لفظ "رجز" سے مراد بہ ظاہر اً وہی پانچ طرح کی بیدار کنندہ سزائیں ہیں جن کا آیاتِ گذشتہ میں تذکرہ کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے یہ بھی احتمال ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے اس سے بعض دوسری بلاؤں کی طرف اشارہ مقصود ہو، جو اللہ نے ان پر نازل فرمائیں اور گزشتہ آیات میں ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوا، جیسے طاعون، برف نیز شدید اور جان لیوا ژالہ باری۔ توریت میں بھی مؤخر الذکر عذابوں کا ذکر ہوا ہے۔

جملہ "بما عھد عندك" میں عہدِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان گفتگو ہے، زیادہ قرین صواب یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کا موسٰی سے یہ وعدہ ہے کہ جب بھی کوئی دعا کرو گے میں اسے پورا کردوں گا، لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "عہد" سے مراد وہی "عہدِ نبوت" ہے یعنی اے موسٰی! ہم تمہیں تمہارے عہدِ نبوت کا واسطہ دیتے ہیں کہ خدا سے ان بلاؤں کو دُور ہونے کی دعا کرو۔

※

اس کے بعد کی آیت میں ان کی پیمان شکنی کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: "جس وقت ہم ان پر سے بلاؤں کو تعیین شدہ مدت کے بعد ہٹا لیتے تھے تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے تھے" نہ خود ہی ایمان لاتے تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو اسیری سے آزاد کرتے تھے (فلما كشفنا عنهم الرجز الیٰ اجل هم بالغوه اذا هم ينكثون)[1]

جملہ "الیٰ اجل هم بالغوه" سے اشارہ اس مطلب کی طرف ہے کہ حضرت موسٰیؑ ان کے لیے ایک مدت معین کرتے تھے کہ فلاں وقت یہ بلا برطرف ہوجائے گی تاکہ ان پر اچھی طرح کھل جائے کہ یہ بلا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ حضرت موسٰیؑ کی دعا کی وجہ سے تھا۔

جملہ "اذا هم ينكثون" چونکہ مضارع کا صیغہ ہے اس لیے استمرار پر دلالت کررہا ہے۔ یعنی وہ لوگ ہر مرتبہ حضرت موسٰیؑ کے سامنے پیمان باندھتے تھے اس کے بعد اسے توڑ ڈالتے تھے یہاں تک کہ عہد شکنی ان کی زندگی کا ایک جزو ہوگیا تھا۔

※

آخری آیت میں ان کی اِس خیرہ سری، سرکشی اور پیمان شکنی کو دو مختصر جملوں میں بیان کردیا گیا ہے۔ پہلے مجمل طور سے فرماتا ہے: ہم نے ان سے انتقام لے لیا (فانتقمنا منهم)۔

بعد ازاں اس انتقام کی شرح اس طرح سے فرمائی ہے: ہم نے انہیں دریا میں ڈبو دیا، کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل تھے (فاغرقناهم في اليم بانهم كذبوا بآياتنا وكانوا عنها غافلين)[2]

---

[1] لفظ "نکث" (بروزن "مکث") دراصل اس کے معنی رسی کے بل کھولنے کے ہیں۔ بعد ازاں پیمان شکنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔

[2] جیسا کہ لغت اور احادیث کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے "یم" کا معنی ہے سمندر نیز اس کا اطلاق نیل جیسے عظیم دریاؤں پر بھی ہوتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں علماء میں اختلاف ہے کہ "یم" عربی زبان کا لفظ ہے یا سریانی یا ہیروگلیفی کا۔ المنار کے مصنف جو مصر کے معروف علماء میں سے ہیں نے ہیروگلیفی اور عربی لغات کی وجہِ اشتراک کو جمع کیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کتاب "معجم الکبیر" تالیف کی ہے نقل کرتے ہیں کہ "یم" قدیم مصری زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے سمندر۔ لہٰذا چونکہ زیر بحث معاملے کا تعلق سرزمینِ مصر سے ہے لہٰذا قرآن نے اس ضمن میں مصر ہی کی لغات سے استفادہ کیا ہے۔

ایسا نہ تھا کہ وہ واقعاً غافل ہوں کیونکہ مختلف طریقوں سے حضرت موسیٰ ان کو بیدار کرتے رہتے تھے، بلکہ عملی طور پر ان کا طریقہ غافلوں جیسا تھا کہ ذرا بھی آیاتِ الٰہی کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔

اللہ کے انتقام سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا کینہ ور اشخاص کی طرح ٹھان لیتا ہے اور جو جیسا اس کے ساتھ کرتا ہے وہ اس کا بدلہ چکاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ کا انتقام یہ ہے کہ پہلے وہ انسان کی اصلاح کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کرتا ہے، اتمام حجت کرتا ہے، سمجھاتا ہے جب اس سے پوری مایوسی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود بالکل فاسد اور معاشرے کے لیے خطرناک ہے اور اب اسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے تو اسے عذاب کے ذریعہ نابود کر دیتا ہے۔ "انتقام" کے لغوی معنی جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا سزا اور پاداش دینے کے ہیں۔ اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو فارسی میں اس سے سمجھے جاتے ہیں۔

(۱۳۷) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝

ع

ترجمہ

(۱۳۷) اور ہم نے وارث بنایا زمین کے شرق و غرب کا اس قوم کو جسے (ظلم و ستم کی زنجیروں میں جکڑ کے) کمزور کر دیا گیا تھا اور بنی اسرائیل نے چونکہ صبر کیا اس لیے تیرے رب کا نیک وعدہ ان کے لیے پورا ہوا، اور جو (قصرِ مجلل) فرعون اور اس کی قوم نے بنائے تھے اور جو مچان دار باغات انہوں نے تیار کیے تھے ان سب کو ہم نے مسمار کر دیا۔

تفسیر

قوم فرعون کا دردناک انجام

قوم فرعون کی نابودی کے بعد وہ بنی اسرائیل جو سالہائے دراز سے ان کے ظلم وستم کے پنجے میں دبے ہوئے تھے آزاد ہوگئے اور فرعونیوں کی وسیع وعریض سرزمین کے مالک بن گئے۔ آیت مذکورہ بالا میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے مشرق ومغرب کی پُر برکت زمینوں کا والی و وارث ان لوگوں کو بنا دیا جو مستضعف اور استعمار زدہ تھے (واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بارکنا فیھا)۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا کہ لفظ "ارث" کے معنی لغت میں اس مال کے ہیں جو کسی سے کسی کو بغیر تجارت یا دوسری طرح کے معاملہ کے مل جائے، چاہے وہ مردہ سے ملے یا زندہ سے۔

"یستضعفون" جس کا مادّہ "استضعاف" ہے کلمۂ "استعمار" کا الٹ ہے۔ لفظ "استعمار" کا استعمال تو ہمارے زمانہ میں عام ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ظالم قوم کسی دوسری قوم کی تضعیف کرے تاکہ اس کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرے، الآیہ کہ استضعاف و استعمار میں یہ فرق ہے کہ استعمار کے ظاہری معنی آباد کرنے کے ہیں اور باطنی معنی ویران کرنے کے، لیکن استضعاف کے ظاہری و باطنی دونوں معنی ایک ہیں۔

"کانوا یستضعفون" سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فرعون والے ان کو ہمیشہ ضعف و ناتوانی میں جکڑا رکھتے تھے۔ انہوں نے فکری، اخلاقی، اقتصادی ہر لحاظ سے انہیں ناتواں کر دیا تھا۔

"مشارق الارض ومغاربھا" سے مراد وہ وسیع وعریض زمینیں ہیں جو فرعون اور اس کے ماننے والوں کے قبضے میں تھیں، کیونکہ چھوٹی زمینیں متعدد مشرق ومغرب یا متعدد افق اپنے اندر نہیں رکھتیں، لیکن اگر وہ وسیع سرزمین ہو تو وہ زمین کے کروی ہونے کی وجہ سے ایسی ہوگی کہ اس میں مختلف مغرب ومشرق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس تعبیر کو وسیع سرزمین کے معنی میں کنایہ سمجھا۔

اس جملہ "بارکنا فیھا" سے اس سرزمین کی غیر معمولی آبادی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یعنی مصر و شام کا علاقہ جو اُس زمانے میں اور اِس زمانے میں بھی دنیا کے پُر برکت علاقوں میں شمار ہوتا ہے خصوصاً بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں مملکت مصر کی اتنی وسعت تھی کہ شامات (شام، فلسطین اور لبنان وغیرہ) کے علاقے بھی اس میں داخل تھے۔

بنا بریں پورے کرۂ زمین کی حکومت مراد نہ تھی کیونکہ یہ امر تاریخی مسلمات کے قطعاً خلاف ہے، بلکہ حکومت بنی اسرائیل سے مراد فرعونوں کی سرزمین تھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: بنی اسرائیل کی فتحیابی کے متعلق تیرے پروردگار کا نیک وعدہ ان کے صبر و استقلال کی وجہ سے پورا ہوا (وتمت کلمة ربك الحسنیٰ علیٰ بنیٓ اسرآئیل بما صبروا)۔

یہ وہی وعدہ ہے جس کا ذکر گذشتہ آیات (اسی سورہ کی آیت ۱۲۸- ۱۲۹) میں گزر چکا ہے۔

اگرچہ ان آیات میں صرف بنی اسرائیل اور فرعونیوں کے مقابلے میں ان کے صبر و استقلال کا تذکرہ ہوا ہے لیکن یہ بات کسی ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جو مستضعف قوم بھی قیام کرے گی اسیری و استعمار کے پنجہ سے آزاد ہونے کے لیے کوشش کرے گی اور اس راہ میں پامردی اور استقامت دکھائے گی وہ آخر میں فتحیاب ہوگی[1] اور ان کی جو زمینیں ظالموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں وہ آزاد ہوجائیں گے۔

آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے: ہم نے فرعون اور فرعونیوں کے خوبصورت قصروں، پُرشکوہ عمارتوں، ہرے بھرے باغات کو نابود کردیا (ودمرنا ما کان یصنع فرعون و قومہٗ وما کانوا یعرشون)۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "صنع" زیادہ تر خوبصورت صنعتوں کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا آیۂ مذکورہ بالا میں عصر فرعونی کی خوبصورت و دیدہ زیب تعمیروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"وما یعرشون" دراصل ان باغوں کے لیے ہے جو مچان اور پاڑوں کے ذریعے پھلتے پھولتے ہیں جیسے انگور، کدو وغیرہ اور ان کی وجہ سے مناظر بہت خوبصورت ہوجاتے ہیں۔

"دمرنا" کی اصل "تدمیر" ہے جس کے معنی فنا اور نابود کرنے کے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ان عمارتوں اور باغات کو کس طرح نابود کیا گیا، پھر یہ کہ ان کی نابودی کی کیا ضرورت پیش آئی؟!

جواب یہ ہے کہ یہ بات بعید نہیں کہ زلزلوں اور نت نئے سیلابوں کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوگئی ہو۔ یہ تباہی اس وجہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فرعون کے ساتھ تمام فرعون والے دریا میں غرق نہیں ہوئے تھے بلکہ خود فرعون اور اس کے کچھ خاص آدمی جو اس کے ساتھ موسیٰ کا پیچھا کرتے ہوئے گئے تھے غرق ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ بات مسلّم ہے کہ اگر باقی ماندہ افراد جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اُ

---

[1] بشرطیکہ اس قوم کو جائز قیادت بھی حاصل ہو، فرعون کے مقابلے میں بنی اسرائیل کو اس وقت تک کامیابی حاصل نہ ہوئی جب تک کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے ان کی رہنمائی نہ کی۔ (مترجم)۔

وہ مصر کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت پہلے جیسی ہوتی تو دوبارہ بنی اسرائیل کا ناطقہ بند کر دیتے اور جگہ جگہ ان کے لیے زحمت کا باعث بنتے لہٰذا مصلحت الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ مال دنیا سے ان کا ہاتھ خالی ہو جائے تاکہ ان کی سرکشی اور طغیان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

(۱۳۸) وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○

(۱۳۹) اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

(۱۴۰) قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○

(۱۴۱) وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ○

ترجمہ

(۱۳۸) اور بنی اسرائیل کو ہم نے دریا سے (صحیح و سالم) پار لگا دیا، پس وہ ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں کے چاروں طرف تعظیم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تو انہوں (بنی اسرائیل) نے کہا کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا

دو جیسے معبود ان لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔ (موسیٰ نے) کہا: تم جاہل و نادان لوگ ہو۔

(۱۳۹) ان لوگوں (کو جنہیں تم دیکھ رہے ہو ان) کا انجام نابودی ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب باطل اور لغو بات ہے۔

(۱۴۰) (اس کے بعد) اس نے کہا: کیا میں خدائے برحق کے علاوہ کوئی دوسرا معبود تمہارے لیے چاہوں، ایسا خدا جس نے تمہیں تمہارے عصر کے لوگوں پر برتری عطا کی ہے۔

(۱۴۱) تم یاد کرو اس زمانہ کو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں (کے پنجۂ ظلم) سے نجات دی، وہ تم پر مسلسل ظلم کر رہے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

تفسیر

حضرت موسیٰ سے بت سازی کی فرمائش

ان آیات میں بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ایک اور اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرعونیوں پر ان کی فتحیابی کے بعد ہوا۔ اس واقعہ سے بت پرستی کی جانب ان کی توجہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ابتداء کا ذکر ان آیات میں آیا ہے اور اس کے انجام کا مفصل ذکر سورۂ طٰہٰ کی آیات ۸۶ تا ۹۷ میں آیا ہے اور مختصر طور پر اسی سورہ کی آیت ۱۴۸ میں بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے جھگڑے سے نکل چکے تو ایک اور داخلی مصیبت شروع ہو گئی جو بنی اسرائیل کے جاہل، سرکش اور ضدی افراد کی وجہ سے پیش آئی۔ جیسا کہ آگے معلوم ہو گا حضرت موسیٰ کے لیے یہ داخلی کش مکش، فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے بدرجہا سخت اور سنگین تر تھی اور ہر داخلی کشمکش کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو دریا (نیل) کے اس پار لگا دیا (وجاوزنا ببنی اسرآئیل البحر)۔

لیکن "انہوں نے راستے میں ایک قوم کو دیکھا جو اپنے بتوں کے گرد خضوع اور انکساری کے ساتھ اکٹھا تھے (فاتوا علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لھم)۔

" عاکف " ، " عکوف " سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف احترام کے ساتھ توجہ کرنا۔

امتِ موسیٰ کے جاہل افراد یہ منظر دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً حضرت موسیٰ کے پاس آن کر " وہ کہنے لگے اے موسیٰ ! ہمارے واسطے بھی بالکل ویسا ہی معبود بنا دو جیسا معبود ان لوگوں کا ہے " (قالوا یا موسی اجعل لنآ الٰھًا کما لھم اٰلھة)۔

حضرت موسیٰ ان کی اس جاہلانہ اور احمقانہ فرمائش سے بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا : تم لوگ جاہل و بے خبر قوم ہو (قال انکم قوم تجھلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بُت پرستی کا اصل سبب بشر کا جہل اور نادانی ہے۔ اس کا ایک جہل تو اپنے خالقِ حقیقی سے ہے یعنی اس کی ذات پاک کو نہ جاننا اور یہ نہ جاننا کہ اس کی شبیہ و نظیر ہرگز ممکن نہیں ہے۔

دوسری طرف اس جہان کی اصل علت سے جہل ہے اور اس کے حوادث کی علتِ سے بے خبری ہے اسی جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ہر حادثے کی ایک خیالی علت تراش لیتا ہے یہاں تک کہ بتوں کو بھی علت مان لیتا ہے۔

اس کا تیسرا جہل عالم ماورار طبیعت سے ہے جس کے نتیجہ میں سوائے حسی اشیار کہ جن کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور حواس پنجگانہ سے محسوس کرتا ہے، اور کسی چیز کو نہیں مانتا۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان تین طرح کے جہلوں کی آمیزش سے بُت پرستی کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا انسان جو آگاہ و فہمیدہ ہو، خدا اور اس کی صفات ذاتی سے باخبر ہو، علل حوادث کا بھی اسے علم ہو، جہانِ طبیعت اور ماورار طبیعت کی بھی اطلاع رکھتا ہو پھر اپنے ہاتھوں سے پہاڑ میں سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو جدا کرے، اس کے ایک حصّہ کو اپنے مکان کے کسی حصّے مثلاً سیڑھی وغیرہ کے لیے استعمال کرے اور اسی پتھر کے دوسرے حصے سے ایک بُت تراشے اور اسے اپنا معبود قرار دے کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور اسے اپنی تقدیر کا مالک و مختار سمجھ بیٹھے ؟!

جالبِ توجہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم وہ گروہ ہو جو ہمیشہ جہالت کے اندر غوطہ زن رہا کرتا ہے (کیونکہ " تجھلون " فعل مضارع ہے جو زیادہ تر استمرار پر دلالت کرتا ہے)، خصوصاً یہ کہ اس میں جہالت کے متعلق بیان نہیں کیا گیا ہے اور یہ خود عموم پر دلالت کرتا ہے۔

سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے " اجعل لنآ الٰھًا " (ہمارے لیے

ایک معبود بنا دو) کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ایسی چیز جو کبھی بھی صاحب اثر و فعال نہ تھی، نہ اس میں کوئی ضرر تھا نہ فائدہ، انتخاب اور قرار داد کے ذریعے اور کسی بُت یا خدا کا نام رکھنے کے ذریعے اچانک وہ طرح طرح کے آثار کا سرچشمہ قرار پا جائے، اور اس کی پرستش انسان کو اس کے رب سے نزدیک کر دے۔ اس کی بے احترامی سے بندہ خدا سے دور ہو جائے، اس کی عبادت سرچشمۂ خیر و برکت اور اس کی تحقیر نقصان و خسران کا سبب بن جائے۔ یہ انتہائی درجے کی جہالت اور بے خبری کی بات ہے۔

یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ منشا نہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ ان کے لیے ایک ایسا معبودؐ بنا دیں جو پورے جہان کا خالق ہو بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان کے لیے ایک ایسا معبود بنا دیں جس کی پرستش کی وجہ سے وہ خدا کے نزدیک ہو جائیں اور وہ خیر و برکت کا سرچشمہ بنے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ صرف ایک نام رکھنے کی وجہ سے یا مجسمہ بنا دینے سے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک بے روح اور بے خاصیت ہستی یک بیک ان خواص و آثار کا سرچشمہ بن جائے؟ اس سے زیادہ بھی کوئی بات خرافات، جہالت اور بے بنیاد توہمات پر مبنی ہو سکتی ہے؟![1]

٭

۲۔ اس میں شک نہیں کہ بنی اسرائیل قبل اس کے کہ اس بُت پرست قوم کو دیکھیں مصریوں کے ساتھ طولانی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے خود بھی بت پرستی کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن یہ بات ان کے دلوں میں چنگاری کی طرح دبی ہوئی تھی۔ لہٰذا جونہی انہوں نے راستے میں بت پرستی کا منظر دیکھا تو یہ دبی ہوئی چنگاری یک بیک سلگ اٹھی، اس سے معلوم ہوا کہ ایک انسان جیسا بھی ہو وہ کس قدر ماحول کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ماحول اس پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ماحول ہے چاہے تو اسے خدا پرستی سے نزدیک کر دے اور چاہے تو صنم کے دروازے تک لے جائے۔ ماحول ہی بہت سی برائیوں اور بدبختیوں کا سبب بنتا ہے اور وہی نیکی و پارسائی کی طرف لے جاتا ہے (اگرچہ ماحول کا انتخاب ہی اصلی علت ہوتا ہے)، یہی وجہ ہے کہ ماحول کی اصلاح کو اسلام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

٭

۳۔ ایک اور جالبِ نظر بات جو آیت مذکورہ سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ناشکرگزار افراد کی کثرت تھی، باوجودیکہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے اتنے معجزے دیکھے۔ قدرت کے اتنے انعامات ان پر ہوئے، ان کا دشمن فرعون نابود ہوا ابھی کافی عرصہ بھی نہیں گذرا تھا۔ وہ غرق کر دیا گیا اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے لیکن انہوں نے ان تمام باتوں کو یکسر بھلا دیا اور حضرت موسیٰؑ سے

---

[1] بت پرستی کی تاریخ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم (صفحہ ۱۶۲ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

بُت سازی کا سوال کر بیٹھے ۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سامنے مسلمانوں پر اعتراض کیا :

ابھی تمہارے نبیؐ دفن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم لوگوں نے اختلاف کر دیا۔[1]

حضرت علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا :

انما اختلفنا عنه لا فيه ولكنكم ما جفت ارجلكم من البحر حتى قلتم لنبيكم اجعل لنا الٰها كما لهم اٰلهة فقال انكم قوم تجهلون ۔

ہم نے ان فرامین و اقوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو پیغمبرؐ سے ہم تک پہنچے ہیں، پیغمبر یا ان کی نبوّت سے متعلق ہم نے کوئی اختلاف نہیں کیا (چہ جائیکہ الوہیت کے متعلق ہم نے کوئی بات کہی ہو) لیکن تم (یہودی) ابھی تمہارے پیَر دریا کے پانی سے خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ تم نے اپنے نبی (حضرت موسیٰؑ) سے یہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے ایک ایسا ہی معبود بنا دو جس طرح کہ ان کے متعدد معبود ہیں، اور اس نبی نے تمہارے جواب میں تم سے کہا تھا کہ تم ایک ایسا گروہ ہو جو جہل کے دریا میں غوطہ زن ہے ۔

اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی بات کی تکمیل کے لیے بنی اسرائیل سے کہا : اس بت پرست گروہ کو جو تم دیکھ رہے ہو ان کا انجام ہلاکت ہے اور ان کا ہر کام باطل و بے بنیاد ہے (ان هٰؤلاء متبر ما هم فيه و باطل ما كانوا يعملون) ۔

یعنی ان کا عمل بھی عبث ہے اور ان کی زحمتیں بھی سب بے نتیجہ ہیں اور آخر میں جو ہر بت پرست قوم کا انجامِ بَد (ہلاکت) ہے وہی ان کا بھی انجام ہوتا ہے (کیونکہ "متبر" کا مادّہ "تبار" ہے جس کے معنی ہیں "ہلاکت")۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : آیا خدائے برحق کے علاوہ تمہارے لیے کوئی دوسرا معبود بنا لوں، وہی خدا جس نے اہلِ جہان (ہمعصر لوگوں) پر تم کو فضیلت دی (قال اغير الله ابغيكم الٰها و هو فضلكم على العالمين) ۔

مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کی پرستش کا اصل محرک شکر گزاری کا جذبہ ہو تو تمہیں یہ سوچنا چاہیئے کہ

---

[1] اس سے مراد خلافت کے بارے میں اختلاف ہے ۔ (مترجم)

تمہاری ساری نعمتیں خدا کی دی ہوئی ہیں، اور اگر اس کی پرستش اس وجہ سے ہے کہ وہ علۃ العلل اور منشاء اثر ہے، تب بھی اس کا تعلق خدائے وحدہٗ لاشریک سے ہے، بنا بریں جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے صرف اسی کی عبادت و پرستش کرنا چاہیئے اس کے غیر کی نہیں۔

✡

اس کے بعد کی آیت میں خداوند کریم اپنی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، تاکہ اس عظیم نعمت کا تصور کرکے ان میں شکرگزاری کا جذبہ بیدار ہو اور انہیں یہ احساس ہو کہ پرستش اور سجدے کا مستحق صرف خدائے یکتا و یگانہ ہے' اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ جو بت بے نفع اور بے ضرر ہیں ان کے سامنے سر تعظیم جھکایا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "یاد کرو اس وقت کو جبکہ ہم نے تمہیں فرعون کے گروہ کی شر سے نجات دے دی، وہ لوگ تم کو مسلسل عذاب دیتے چلے آرہے تھے (واذ انجیناکم من اٰل فرعون یسومونکم سوٓء العذاب)۔

"یسومون" کی اصل "سوم" ہے جس کے معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے کسی چیز کے پیچھے چلنے کے ہیں اور قاموس میں ہے کہ اس لفظ میں ایک طرح کا تسلسل و استمرار بھی پایا جاتا ہے، بنا بریں "یسومونکم سوٓء العذاب" کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ برابر اور مسلسل تم کو عذاب دیتے چلے آرہے تھے۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآنی قاعدہ ہے کہ اجمال کے بعد تفصیل سے کام لیتا ہے۔ اس عذاب و ایذا رسانی کی تفصیل یوں بیان فرماتا ہے: وہ تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں لڑکیوں کو (خدمت اور کنیزی کے لیے) زندہ چھوڑ دیتے تھے" (یقتلون ابنآءکم ویستحیون نسآءکم)۔

"اور اس مصیبت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی" (وفی ذالکم بلآء من ربکم عظیم)۔

گذشتہ اور آئندہ آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ جملہ بنی اسرائیل سے اس وقت کہا جب وہ دریا کو عبور کرنے کے بعد بُت پرستی کی خواہش میں گرفتار ہو گئے تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جملہ کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے میں موجود تھے، کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق اس میں ایک جملہ "قال ربکم" مقدر ماننا پڑے گا (یعنی موسیٰ نے کہا کہ تمہارا رب کہتا ہے) اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔

لیکن اگر اسے زمانۂ پیغمبرؐ کی بات مانا جائے تو یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ اس طرح ماقبل اور مابعد

پہلے فرمایا گیا ہے : ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (پورے ایک مہینہ) کا وعدہ کیا، اس کے بعد مزید دس راتیں بڑھا کر اس وعدہ کی تکمیل کی، چنانچہ موسیٰ سے خدا کا وعدہ چالیس راتوں میں پورا ہوا (وواعدنا موسیٰ ثلاثین لیلة واتممناها بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلة)۔

"میقات" کی اصل "وقت" ہے جس کے معنی اس "وقت" کے ہیں جو کسی کام کے کرنے کے لیے پہلے سے طے کر لیا جائے۔ اس کا اطلاق عام طور سے "زمانہ" کے لیے ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس مکان کو بھی میقات کہتے ہیں جہاں کوئی خاص کام انجام پائے، جیسے "میقاتِ حج" یعنی وہ جگہ جہاں سے کسی شخص کو بغیر احرام کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس کے بعد اس طرح بیان کیا گیا ہے : موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا : میری قوم میں تم میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو اور کبھی مفسدوں کی پیروی نہ کرنا (وقال موسیٰ لاخیہ هارون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین)۔

چند قابلِ توجّہ نکات

۱۔ وعدہ کتنی راتوں کا تھا ؟ : آیہ مذکورہ بالا کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے ہی سے چالیس راتوں کا وعدہ کیوں نہ کیا بلکہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا اس کے بعد دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا، حالانکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۱ میں ایک جگہ چالیس راتوں کا ذکر ہے ؟!

مفسرین کے درمیان اس تفریق کے بارے میں بحث ہے۔ لیکن جو بات بیشتر قرینِ قیاس ہے، نیز روایاتِ اہلبیت علیہم السلام کے بھی موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ میعاد اگرچہ واقع میں چالیس راتوں کا تھا لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کرنے کے لیے پہلے موسیٰ کو تیس راتوں کی دعوت دی پھر اس کے بعد اس کی تجدید کر دی تاکہ منافقین مومنین سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

> جس وقت حضرت موسیٰ وعدہ گاہ الٰہی کی طرف گئے تو انہوں نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کی غیبت تیس روز سے زیادہ طولانی نہ ہوگی لیکن جب خدا نے اس پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا تو بنی اسرائیل نے کہا : موسیٰ نے اپنا وعدہ توڑ دیا اس کے نتیجہ میں انہوں نے وہ کام کیے جو ہم جانتے ہیں (یعنی گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے)[1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۳۔ نور الثقلین جلد ۲ ص ۶۱۔

رہا یہ سوال کہ یہ چالیس روز یا چالیس راتیں، اسلامی مہینوں میں سے کونسا زمانہ تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے لے کر ذی الحجہ کی دس تاریخ تک تھی۔ قرآن میں چالیس راتوں کا ذکر ہے نہ کہ چالیس دنوں کا۔ تو شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت موسیٰ کی اپنے رب سے جو مناجاتیں تھیں وہ زیادہ تر رات ہی کے وقت ہُوا کرتی تھیں۔

٭

۲۔ **پیغمبر اور جانشینی؟**: دوسرا سوال جو یہاں درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ تو خود پیغمبر تھے لہٰذا انہیں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کی رہبری اور امامت کے لیے اپنا جانشین کیونکر مقرر کیا؟

اس سوال کا جواب ایک نکتہ پر غور کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مقام نبوّت کچھ اور ہے اور مقام امامت کچھ اور۔ حضرت ہارونؑ اگرچہ خود پیغمبر تھے مگر بنی اسرائیل کی عام رہبری کے منصب دار نہ تھے۔ یہ منصب وہ تھا جو صرف حضرت موسیٰ کو ملا ہُوا تھا لیکن جب آپ نے چاہا کہ ایک مدت کے لیے اپنی قوم سے جدا ہوں تو اپنے بھائی کو مقام امامت و پیشوائی کے لیے انتخاب کیا۔

اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام امامت بالاتر از مقام نبوّت ہے۔ ہم نے اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول صـ۳۲۲ اردو ترجمہ)۔

۳۔ **حضرت ہارونؑ کو تلقین؟**: اس کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ نے کس طرح اپنے بھائی ہارون سے یہ کہا کہ: قوم کی اصلاح کی کوشش کرنا اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا، جبکہ حضرت ہارونؑ ایک نبیٔ برحق اور معصوم تھے وہ بھلا مفسدوں کی پیروی کیوں کرنے لگے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ درحقیقت اس بات کی تاکید کے لیے تھا کہ حضرت ہارونؑ کو اپنی قوم میں اپنے مقام کی اہمیت کا احساس رہے اور شاید اس طرح سے خود بنی اسرائیل کو بھی اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی غیبت میں حضرت ہارونؑ کی رہنمائی کا اچھی طرح اثر لیں اور ان کا کہنا مانیں اور ان کے اوامر و نواہی (احکامات) کو اپنے لیے سخت نہ سمجھیں، اس سے اپنی تحقیر خیال نہ کریں اور ان کے سامنے اس طرح مطیع و فرمانبردار رہیں جس طرح وہ خود حضرت موسیٰ کے فرمانبردار تھے۔

٭

۴۔ **ایک میقات یا کئی میقات؟**: چوتھا سوال جو درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا

حضرت موسیٰ صرف اسی چالیس روزہ میقات پر ایک ہی دفعہ گئے تھے اور انہی چالیس دنوں میں توریت اور تمام شریعت واحکامات نازل ہو گئے ۔ نیز کیا انہی چالیس دنوں کی بات ہے کہ اپنی قوم کے کچھ منتخب شدہ افراد کو بطور نمائندہ اپنے ہمراہ لے گئے تھے کہ وہ نزولِ توریت کے گواہ بنیں اور انہیں حضرت موسیٰ یہ بتلادیں کہ وہ ذاتِ خداوندی کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ کوئی دوسرا ہی اسے دیکھ سکتا ہے ؟! یا یہ کہ متعدد چلّے گذرے ؟ ایک چلّہ صرف احکام الٰہی لینے کے لیے، پھر دوسرا چلّہ بزرگانِ بنی اسرائیل کو لے جانے کے لیے ، پھر شاید تیسرا چلّہ دیگر مقاصد کے لیے (جیساکہ موجودہ توریت کے سفرِ خروج باب ۱۹ تا ۲۴ میں مذکور ہے)۔

ایک مرتبہ پھر مفسّرین کے درمیان اس موضوع کے بارے میں بحث ہوئی ہے ۔لیکن آیات قبل و بعد پر اگر نظر کی جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان سب کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے کیونکہ ایک تو یہ جملہ : ولما جآء موسٰی لمیقاتنا : (جب موسیٰ ہماری وعدہ گاہ میں آئے) اچھی طرح سے ان دونوں واقعات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے ۔علاوہ برایں اسی سورہ کی آیت ۱۴۵ ہمیں پورے طور سے بتلاتی ہے کہ "الواحِ توریت" اور "نزول احکام شریعتِ موسٰی" یہ دونوں واقعات اسی سفر میں ہوئے تھے ۔

اس سورہ میں صرف ایک آیت (نمبر ۱۵۵) ایسی ہے جس سے تعدد میقات کا احتمال ہوتا ہے (واختار موسٰی قومہٗ سبعین رجلا لمیقاتنا) انشاء اللہ ہم جب اس کی تفسیر بیان کریں گے تو وہاں تحریر کریں گے کہ یہ آیت بھی مذکورہ مطلب کے خلاف نہیں ہے ۔

ٌ

۵۔ حدیث منزلت : بہت سے سُنّی اور شیعہ مفسّرین نے اس مقام پر حدیثِ منزلت (یا علی انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسٰی) کی طرف اشارہ کیا ہے ،بس اتنا فرق ہے کہ شیعہ مفسرین نے اسے حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل پر ایک زندہ دلیل مانا ہے جبکہ بعض مفسّرین اہلسنت نے اسے ردّ کرتے ہوئے شیعوں پر بے رحمی اور تعصب کے ساتھ اعتراضات کیے ہیں ۔

اس بحث کی مزید وضاحت کے لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس حدیث کی اسناد اور متن کو مختصر طور پر پیش کردیں ، اس کے بعد ان اعتراضات کے متعلق بحث کریں جو فریقِ مخالف نے اس جگہ ہم پر کیے ہیں ۔

حدیثِ منزلت کے اسناد

۱۔ اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک بڑی تعداد نے جنگِ تبوک کے واقعہ کو اس

طرح نقل کیا ہے :

ان رسول اللہ خرج الی تبوک واستخلف علیاً فقال اتخلفنی فی الصبیان والنسآء قال الاترضیٰ ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسیٰ الا انه لیس نبی بعدی۔

پیغمبرِ اسلام تبوک کی جانب جب روانہ ہوئے تو آپؐ نے اپنی جگہ پر علی کو مقرر کیا۔ علی نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑے جاتے ہیں (اور اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں آپ کے ہمراہ جنگ کے لیے آؤں) پیغمبرؐ نے فرمایا: یا علی! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری حیثیت مجھ سے وہی ہو جو ہارون کی موسیٰ سے تھی مگر یہ فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

مذکورہ عبارت معتبر ترین کتبِ اہلسنت میں وارد ہوئی ہے یعنی یہ روایت صحیح بخاری میں سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوئی ہے[1]

نیز صحیح مسلم میں جو اہلسنت کی درجہ اوّل کی کتب میں شمار ہوتی ہے' باب "فضائل الصحابہ" میں یہ حدیث سعد سے منقول ہوئی ہے کہ پیغمبرؐ نے علیؑ سے فرمایا:

انت منی بمنزلة ھارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔

تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کی موسیٰ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا[2]

صحیح مسلم کی اس حدیث میں مطلب کو کلّی طور پر بیان کیا گیا ہے اس میں جنگِ تبوک کی طرف کوئی اشارہ نظر نہیں آتا۔

نیز صحیح مسلم ہی میں اس حدیث کو بطور کلّی بیان کرنے کے بعد پیغمبرؐ کی جنگِ تبوک والی حدیث کو بھی مثل صحیح بخاری کے جداگانہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں بھی بعینہٖ یہی مطلب آیا ہے[3]

سنن ترمذی میں اس مطلب کا اضافہ ملتا ہے کہ ایک روز معاویہ نے سعد سے کہا کہ تم "ابو تراب" (یعنی حضرت علیؑ) کو بُرا کیوں نہیں کہتے؟ سعد نے جواب دیا: مجھے یاد ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے علیؑ کے بارے میں تین باتیں فرمائی تھیں، جب مجھے یہ تینوں باتیں یاد آتی ہیں تو میں علیؑ کو بُرا نہیں

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص۳ طبع دار احیاء التراث العربی۔

[2] صحیح مسلم جلد ۴ ص۱۸۷۱ طبع دار احیاء التراث العربی طبع دوم سال ۱۹۷۲ء۔

[3] جلد اوّل ص۴۲ طبع دار احیاء الکتب العربیہ۔

کہہ سکتا، اس کے بعد سعد نے ان تین باتوں میں سے ایک وہی جنگِ تبوک میں حضرت علیؑ کے متعلق مذکورہ جملے کا ذکر کیا ہے[1]

کتاب مسند احمد بن حنبل میں تقریباً دس مقامات پر اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، کبھی تو جنگِ تبوک کے بیان میں اس کا ذکر آیا ہے اور کہیں اس کے علاوہ بھی[2]

ان مقامات میں سے ایک مقام پر درج ہے کہ:

ایک دفعہ ابنِ عباس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ باہر آجایئے یا ان لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے باہر بھیج دیجئے کیونکہ ہم آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ابنِ عباس نے کہا میں تمہارے ساتھ باہر چلتا ہوں یہاں تک کہ ابنِ عباس نے ان سے جنگِ تبوک کا واقعہ اور رسول اللہؐ کا علیؑ کے بارے میں مذکورہ قول نقل کیا۔ اس کے بعد اتنا اور اضافہ کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

انہ لا ینبغی ان اذھب الا و انت خلیفتی:

مناسب نہیں ہے کہ میں سفر کروں سوائے اس صورت کے کہ تم میرے جانشین ہو[3]

کتاب خصائص نسائی میں بھی یہ حدیث وارد ہوئی ہے[4] اسی طرح کتاب مستدرک حاکم[5]، تاریخ الخلفاء سیوطی[6]، صواعق محرقہ ابنِ حجر[7]، سیرۃ ابنِ ہشام[8]، سیرۃ حلبی[9] اور دیگر بہت سی کتابوں میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔

یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ کتابیں اہلِ سنت کی مشہور و معروف اور درجہ اوّل کی کتابوں میں سے ہیں۔

---

[1] جلد ۵ ص ۶۳۸ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، مالک مکتبہ حاج ریاض شیخ۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد اوّل ص ۱۷۳، ص ۱۷۵، ص ۱۷۷، ص ۱۷۹، ص ۱۸۲، ص ۱۸۵، ص ۲۳۱ نیز جلد ۶ ص ۳۶۹ اور ص ۴۳۸۔

[3] مسند احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۳۱۔

[4] خصائص نسائی ص ۷ و ص ۱۴۔

[5] جلد ۳ ص ۱۰۸ و ص ۱۰۹۔

[6] جلد اوّل ص ۶۵۔

[7] ص ۱۷۷۔

[8] سیرت ابنِ ہشام جلد ۳ ص ۱۶۳ طبع مصر۔

[9] سیرت حلبی جلد ۳ ص ۱۵۱ طبع مصر۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کو صرف سعد بن ابی وقاص نے نقل نہیں کیا ہے بلکہ ان کے علاوہ دیگر صحابہ نے بھی اس حدیث کی روایت کی ہے جن کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ ان صحابہ میں سے بعض یہ ہیں : جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، اسماء بنت عمیس، ابن عباس، ام سلمہ، عبداللہ بن مسعود، انس بن مالک، زید بن ارقم اور ابو ایوب انصاری۔

اس سے بھی زیادہ جالب بات یہ ہے کہ معاویہ اور عمر بن خطاب نے بھی اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

محب الدین طبری اپنی کتاب ذخائر عقبیٰ میں نقل کرتے ہیں کہ :

ایک شخص معاویہ کے پاس آیا اور اس نے معاویہ سے کوئی سوال کیا، معاویہ نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ علیؑ سے پوچھو کیونکہ وہ بہتر جانتے ہیں، اس شخص نے کہا: اے امیرالمؤمنین (اس کا اشارہ معاویہ کی طرف تھا) آپ ہی جواب دیں کیونکہ آپ کا جواب مجھے علیؑ کے جواب سے زیادہ پسند ہے۔ معاویہ نے کہا: تُو نے بہت بُری بات کہی۔ اس کے بعد معاویہ نے کہا: پیغمبرؐ نے علیؑ کے بارے میں یہ جملہ فرمایا ہے: انت منّی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی، اس کے بعد معاویہ نے کہا: جب کبھی عمر کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تھی تو وہ علیؑ کی طرف رجوع کرتے تھے[1]

ابوبکر بغدادی اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں تحریر کرتے ہیں : عمر نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ علی کو بُرا کہہ رہا ہے۔ عمر نے کہا: میرا خیال ہے کہ تُو ایک منافق انسان ہے کیونکہ میں نے پیغمبرؐ کو فرماتے سنا ہے : انما علی منّی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی[2]

حدیثِ منزلت کے سات مواقع

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے اس حدیث کو جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے صرف جنگِ تبوک کے موقع پر نہیں فرمایا بلکہ دیگر متعدد مقامات پر بھی آپ نے علیؑ کے بارے میں یہ جملہ فرمایا ہے، ان مقامات میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ **پہلی مواخات کے دن** : یعنی جب مکہ میں رسول اللہؐ نے پہلی مرتبہ اپنے اصحاب کے درمیان بھائی چارہ قرار دیا، اس وقت آنحضرتؐ نے علیؑ کو اپنے بھائی کی حیثیت سے منتخب کیا اور فرمایا:

---

[1] ذخائر عقبیٰ صـ۷۹ طبع مکتبہ قدس، صواعق محرقہ صـ۱۷۷ طبع مکتبہ قاہرہ۔

[2] تاریخ بغداد جلد ۷، صـ۴۵۲ طبع مکتبہ سعادت۔

انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبیّ بعدی[1]

۲۔ دوسری مواخات کے دن: یعنی دوسری دفعہ جب آنحضرتؐ نے مدینہ میں مہاجرین انصار کے درمیان برادری قائم کی، یہاں بھی آپؐ نے اپنے لیے علیؑ کا انتخاب کیا اور ان کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

وانت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ غیرانہ لا نبیّ بعدی وانت اخی ووارثی[2]

۳۔ ام سلیم سے فرمایا: "ام سلیم" جو تاریخ اسلام کی ایک مشہور خاتون اور مبلغہ اسلام ہیں رسول اسلام کی صحابیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے باپ اور بھائی رسول اللہؐ کی نصرت میں شہید ہو چکے ہیں، چونکہ ان کے شوہر نے اسلام قبول نہ کیا اس لیے اس سے جدا ہو گئی تھیں۔ ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مکان پر ان سے ملنے آیا کرتے تھے (اور ان کو تسلی دیتے تھے)، ایک روز آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا:

یا ام سلیم: ان علیاً لحمہٗ من لحمی ودمہٗ من دمی وھو منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ[3]

اے ام سلیم! علی کا گوشت میرے گوشت سے ہے اور اس کا خون میرے خون سے ہے، اور اس کی نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ سے تھی۔

۴۔ اصحاب کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا: ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک روز عمر بن خطاب نے مجھ سے کہا:

علی کا نام برائی کے ساتھ نہ لینا کیونکہ میں نے ان کے بارے میں تین جملے ایسے سُنے ہیں کہ ان میں سے ایک اگر میرے بارے میں ہوتا تو وہ ہر اس چیز سے میرے لیے محبوب تر تھا جس پر سورج چمکتا ہے، ایک مرتبہ میں، ابوبکر، ابوعبیدہ اور اصحاب کی ایک جماعت ہم سب پیغمبر کے پاس تھے اور پیغمبرؐ علیؑ پر تکیہ کیے ہوئے تھے، اس وقت رسول اللہؐ نے علی کے شانہ پر اپنا ہاتھ مارا اور فرمایا:

انت یا علی اول المؤمنین ایماناً واولھم اسلاماً ثم قال انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ:

۱۔ کنز العمال حدیث ۶۰۱۰ جلد ۵ ص۴۰ و جلد ۶ ص۳۹۰۔

۲۔ منتخب کنز العمال (در حاشیہ مسند احمد جلد ۵ مسند احمد ص۳۱۔

۳۔ کنز العمال جلد ۶ ص۱۵۴۔

یعنی اے علی تم وہ پہلے مومن ہو جو ایمان لاتے، اور پہلے مسلمان ہو جو اسلام لائے
اور تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسٰی سے تھی[1]

۵. **نسائی کی روایت:** نسائی اپنی کتاب خصائص میں نقل کرتے ہیں کہ علی، جعفر اور زید کے درمیان حضرت حمزہ کے بیٹے کی سرپرستی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ یہ خدمت وہی انجام دے اس موقع پر پیغمبرؐ نے علی سے فرمایا: انت منی بمنزلة هارون من موسٰی[2]

۶. **مسجد نبوی کے دروازوں کی بندش کے موقع پر:** جس روز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ جس جس کے دروازے مسجد (یعنی مسجد رسول) کے اندر ہیں وہ سب بند کر دیے جائیں صرف علی کا دروازہ باقی رہے، جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہؐ نے علیؑ سے فرمایا:

انہٗ یحل لک من المسجد ما یحل لی وانک منی بمنزلة
هارون من موسٰیؑ الا انہٗ لا نبی بعدی[3]

"جو چیز میرے لیے مسجد میں حلال ہے (اے علی) وہ تمہارے لیے بھی حلال ہے
کیونکہ تم میرے لیے ویسے ہی ہو جیسے ہارون موسٰی کے لیے تھے"

مذکورہ بالا چھ مواقع جنگ تبوک کے علاوہ ہیں اور ان سب کو ہم نے اہلسنت کی مشہور کتابوں سے نقل کیا ہے ورنہ شیعہ کتب میں اس سے زیادہ مواقع کا تذکرہ ہے جہاں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا یہی حدیث حضرت علیؑ کے بارے میں فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ "حدیثِ منزلت" ایسی حدیث نہیں ہے جو صرف واقعہ تبوک سے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت علیؑ کے متعلق ایک عام اور ہمیشہ باقی رہنے والا فرمان ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علمائے اہلسنت جیسے "آمدی" نے اس حدیث کے متعلق جو یہ کہا ہے کہ یہ حدیث ایک خاص حکم پر مشتمل ہے اور اس سے صرف جنگِ تبوک کے موقع پر حضرت علی کی جانشینی ثابت ہوتی ہے اور اس کا ربط دوسرے مقامات سے نہیں ہے، یہ خیال بالکل بے بنیاد

---

[1] کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۳۹۵۔

[2] خصائص نسائی صفحہ ۱۹۔

[3] ینابیع المودہ باب ۱۷ کا آخری حصہ صفحہ ۸ طبع دوم دار الکتب العراقیہ۔

ہے کیونکہ حضرت رسول اللہؐ نے مختلف مناسبتوں سے مختلف مواقع پر اس جملہ کی تکرار کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کے بارے میں حضرت رسول اللہؐ کا ایک عام حکم تھا۔

٭

حدیث منزلت کے مفہوم کی وسعت

اگر بغیر کسی تعصب کے حدیث مذکورہ بالا کے معنی میں غور کریں اور ہر قسم کے تعصب کی عینک اتار دیں تو ہمیں یہ حدیث بتلائے گی کہ نبوت کو چھوڑ کر جتنے مناصب حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ کی نسبت سے حاصل تھے وہ سب حضرت علی علیہ السلام کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل تھے کیونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں اور "الّا انّہ لا نبیّ بعدی" کے استثناء نے اس عموم کی مزید تاکید کر دی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں اور کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے جس کی وجہ سے تخصیص کا قائل ہوا جائے۔ بنا برین اس حدیث سے امور ذیل کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ حضرت علی علیہ السلام بعد پیغمبرؐ امتِ محمدی میں سب سے افضل و اعلیٰ ہیں بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بعد امتِ موسوی میں سب سے افضل و اعلیٰ تھے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام وزیر پیغمبرؐ اور ان کے خاص معاون، ان کے مددگار اور رسول اللہؐ کی رہبری کے کام میں ان کے شریک تھے کیونکہ قرآن کی رُو سے یہ سب منصب حضرت ہارونؑ کے لیے ثابت ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی زبانی ارشاد ہوتا ہے:

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ۙ ھٰرُوْنَ اَخِی ۙ اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ ۙ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۙ (طٰہٰ ۲۹ تا ۳۲)۔

میرے خاندان سے میرا ایک وزیر قرار دے، میرے بھائی ہارون کو میری قوت کو اس کے ذریعہ بڑھا دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام عمومی اسلامی اخوت کے علاوہ پیغمبرؐ کی خصوصی و معنوی اخوت کے بھی حامل تھے۔

۴۔ علی علیہ السلام خلیفہ اور جانشین پیغمبرؐ تھے۔ ان کے ہوتے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ بنے، جس طرح حضرت ہارونؑ کے ہوتے کوئی دوسرا خلیفہ نہ تھا۔

٭ ٭ ٭

حدیثِ منزلت کے متعلق کچھ سوال اور ان کے جواب

بعض متعصبین نے حدیث مذکور پر کچھ ایسے واہی اعتراض کیے ہیں جو واقعاً اس لائق نہیں کہ انہیں کتابوں میں لکھا جائے۔ بس اس طرح کے اعتراضوں کو سُن کر صرف یہ افسوس کرنا چاہیئے کہ بعض لوگ کتنی جلدی یکطرفہ رائے قائم کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ ختم ہو جاتی ہے اور وہ روشن حقائق کو نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ اعتراضات جو تحریر کیے جانے اور گفتگو کیے جانے کے لائق ہیں ان میں سے بعض کو ہم اس جگہ حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض : یہ حدیث صرف ایک محدود اور خاص حکم بیان کرتی ہے کیونکہ یہ غزوۂ تبوک کے موقع پر وارد ہوئی ہے۔ وہ بھی اس وقت جبکہ حضرت علیؑ عورتوں اور بچوں کے درمیان مدینہ میں باقی رہنے پر کبیدۂ خاطر تھے اس موقع پر حضرت رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کا دل رکھنے کے لیے یہ جملہ فرمایا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمہاری حکومت و سرداری صرف ان عورتوں اور بچوں تک محدود ہے!!

اس اشکال کا جواب گذشتہ بحثوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس معترض کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ حدیث صرف جنگِ تبوک کے موقع پر صادر ہوئی ہے۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق یہ جملہ متعدد مواقع پر بطور ایک قانون کلی کے ارشاد فرمایا تھا جس میں سے سات مواقع کو کتب علمائے اہلسنت سے ہم اپنی گذشتہ بحثوں میں نقل کر آئے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ کا مدینہ میں رہنا صرف بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے لیے نہ تھا، کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اسے تو دوسرے بہت سے افراد پورا کر سکتے تھے۔ اس کے لیے حضرت علیؑ جیسے شجاع اور بہادر کی کیا ضرورت تھی وہ بھی ایسے موقع پر جبکہ رسول اللہؐ کو ایک زبردست معرکہ درپیش تھا (شاہِ روم شرقی سے جنگ کا معرکہ)، ظاہر ہے کہ علیؑ کو اپنی جگہ پر مقرر کرنے سے غرض یہ تھی کہ وہ دشمن جو مدینہ کے اطراف میں تھے اور وہ منافقین جو خود مدینہ کے اندر موجود تھے آنحضرتؐ کی طولانی غیبت سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر قابض نہ ہو جائیں، جو شخص اس اہم مرکز کی حفاظت کر سکتا تھا وہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی ذات والا صفات تھی۔

دوسرا اعتراض : یہ بات سب کو معلوم ہے اور تاریخ کی مشہور کتابوں میں بھی لکھی ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے لہٰذا علیؑ کی ہارونؑ سے تشبیہ اس بات کو ثابت نہیں کرتی کہ علیؑ پیغمبر کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ تھے۔

شاید یہ اعتراض ان تمام اعتراضوں میں زیادہ اہم ہے جو اس حدیث پر کیے جاتے ہیں لیکن

اس حدیث کا آخری ٹکڑا " الآ انہٗ لا نبیّ بعدی " (میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) اس اعتراض کا روشن جواب ہے کیونکہ پیغمبرؐ کے اس فرمان " انت منی بمنزلة ھارون من موسٰی " کا تعلق اگر صرف آنحضرتؐ کی حیات سے ہوتا اور آپؐ کے بعد پر اس کی کوئی نظر نہ ہوتی تو " الآ انہٗ لا نبیّ بعدی " کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اگر بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کی ہو تو آپؐ کے بعد کی کوئی بات کہنا بالکل نامناسب ہے (اصطلاحاً اسے یوں کہنا چاہیئے کہ اس طرح کا استثناء منقطع ہو جائے گا جو خلاف ظاہر ہے۔)

بنا بریں اس طرح کے استثناء کا اس حدیث میں ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ پیغمبرؐ کے فرمان کا تعلق آپؐ کی وفات کے بعد کے زمانہ سے بھی ہے، اِلّا یہ کہ کسی کو شبہ نہ ہو اور کچھ لوگ علیؑ کو بعد از نبی، نبی نہ ماننے لگیں اس لیے حضرتؐ نے فرمایا کہ تم ان تمام مرتبوں کے مالک ہو سوائے اس کے کہ تم میرے بعد نبی نہ ہوگے۔ بنا بریں کلام پیغمبرؐ کا یہ مفہوم ہوگا کہ یا علی! تم ہارونؑ کے تمام مدارج و مناصب کے مالک ہو، نہ صرف میری زندگی میں بلکہ میری وفات کے بعد بھی تمہارے یہ درجے اور منصب باقی رہیں گے (سوائے مقام نبوّت)۔

اس طرح یہ واضح ہوگیا کہ حضرت علیؑ کی حضرت ہارونؑ سے تشبیہ بہ لحاظ مقامات ہے نہ بہ لحاظ مدتِ مقامات۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ بھی اگر بعد حضرت موسٰیؑ زندہ رہ جاتے تو مسلّم طور سے حضرت موسٰیؑ کے جانشین بھی ہوتے اور نبوّت پر بھی باقی رہتے۔

لہٰذا اگر قرآن کے ان نصوص کو دیکھا جائے جن میں قرآن نے حضرت ہارونؑ کے لیے حضرت موسٰیؑ کی وزارت و معاونت کے درجہ کو ثابت کیا ہے، ان کو حضرت موسٰیؑ کے کار رہبری میں شریک بھی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک پیغمبر بھی تھے، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام مناصب سوائے پیغمبری کے حضرت علی علیہ السلام کے لیے ثابت ہیں حتیٰ کہ وفاتِ پیغمبر کے بعد بھی جس کی تائید " الآ انہٗ لا نبیّ بعدی " کے جملہ سے ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض: ایک اور اشکال اس حدیث پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ استدلال کا لازمہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے لیے منصب ولایت و رہبریٔ امت رسول اللہؐ کی حیات کے زمانہ میں بھی مانا جائے جبکہ دو امام اور دو رہبر ایک زمانے میں ممکن نہیں ہیں!

لیکن اگر ایک نکتہ پر توجہ کی جائے تو اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسٰیؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی رہبری کے منصب کے مالک تھے، لیکن ایک مستقل اور علیحدہ رہبر نہ تھے بلکہ آپ ایک ایسے رہبر تھے جو حضرت موسٰیؑ کے زیرِ نظر اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؑ بھی پیغمبرؐ کی زندگی میں امتِ مسلمہ کی رہبری میں ان

کے معاون تھے، لہٰذا آپ کی وفات کے بعد آپ کی حیثیت ایک مستقل رہبر کی ہو جائے گی۔

بہر حال، حدیثِ منزلت، جو از روئے سند اسلام کی مضبوط ترین روایات میں سے ایک ہے اور اہلسنت کے تمام گروہوں کی کتابوں میں بلا استثناء اس کا ذکر ہے، دلالت کے لحاظ سے بھی اہلِ انصاف کی نظر میں حضرت علی علیہ السلام کی تمام امت پر فضیلت اسی طرح آپ کی خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے کافی و وافی ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے نہ صرف حدیث کی دلالت کو خلافت پر قبول نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ اس حدیث سے حضرت علیؑ کی کمترین فضیلت بھی ظاہر نہیں ہوتی ہے یہ بات واقعاً حیرت ناک ہے۔

(۱۴۳) وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۚ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۴۳) اور جس وقت موسیٰ ہماری میعاد گاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے بات کی، انہوں نے عرض کی کہ اے پروردگار! تو اپنے کو مجھے دکھلادے تاکہ مَیں تجھے دیکھ لوں (پروردگار نے) کہا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ پاؤ گے لیکن (ذرا) پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو مجھے دیکھ سکو گے لیکن جب پروردگار نے پہاڑ پر (اپنا) جلوہ کیا تو اسے (گراکر) زمین کے برابر کر دیا اور موسیٰ بے ہوش

ہو کر گر گئے، جب وہ ہوش میں آتے تو انہوں نے عرض کی : خدایا ! تُو اس بات سے منزّہ ہے (کہ تجھے کوئی دیکھ سکے) مَیں تیری جانب واپس آتا ہوں مَیں مومنوں میں سے پہلا ہوں ۔

تفسیر

دیدارِ پروردگار کی خواہش

ان آیات میں نیز اس کے بعد کی آیات میں بنی اسرائیل کی زندگی کے بعض دیگر مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰ سے بڑے اصرار کے ساتھ یہ خواہش کی کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے ان کے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنے ہمراہ پروردگار کی میعادگاہ کی طرف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں کی درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کیا۔ خدا کی طرف سے اس کا ایسا جواب ملا جس سے بنی اسرائیل کے لیے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہو گئی۔ اس واقعہ کا کچھ حصّہ سورۂ بقرہ کی آیات ۵۵ اور ۵۶ میں اور کچھ حصّہ سورۂ نساءَ کی آیت ۱۵۳ میں اور کچھ حصّہ زیرِ بحث آیات میں اور باقی حصّہ اسی سورہ کی آیت ۱۵۵ میں بیان کیا گیا ہے۔

زیرِ بحث آیات میں پہلے ارشاد ہوتا ہے: جس وقت موسیٰ ہماری میعادگاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے باتیں کیں تو انہوں نے کہا: اے پروردگار خود کو مجھے دکھلا دے تاکہ مَیں تجھے دیکھ لوں (ولما جآء موسٰی لمیقاتنا وکلّمہٗ ربّہٗ قال رب ارنی انظر الیک)۔

لیکن موسیٰ نے فوراً خدا کی طرف سے یہ جواب سنا: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے (قال لن ترانی)۔

"لیکن پہاڑ کی جانب نظر کرو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تب مجھے دیکھ سکو گے" (ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہٗ فسوف ترانی)۔

"جس وقت خدا نے پہاڑ پر جلوہ کیا تو اسے فنا کر دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا" (فلما تجلّٰی ربہٗ للجبل جعلہٗ دکًّا) [1]

---

[1] "دکّ" کے معنی دراصل صاف اور ہموار زمین کے ہیں بنا بریں اس جملے "جعلہ دکا" سے مراد یہ ہے کہ پہاڑ کو اس تجلی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

موسیٰ نے جب یہ ہولناک منظر دیکھا تو ایسا اضطراب لاحق ہوا کہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے (وخر موسٰی صعقا)۔

۔اور جب ہوش میں آئے تو خدا کی بارگاہ میں عرض کی پروردگارا! تو منزّہ ہے، میں تیری طرف پلٹتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا ہوں مومنین میں سے۔ (فلما افاق قال سبحانك تبت الیك وانا اوّل المؤمنین)۔

چند قابلِ غور نکات

۱۔ **حضرت موسٰی نے رویت کی خواہش کیوں کی؟**: یہاں پر پہلا سوال جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم نبی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ذاتِ خداوندی قابلِ دید نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے، نہ اس کے لیے کوئی مکان وجہت ہے اس کے باوجود انہوں نے ایسی خواہش کیسے کر دی جو فی الحقیقت ایک عام انسان کی شان کے لیے بھی مناسب نہیں ہے؟

اس سوال کے جواب میں اگرچہ مفسرین نے مختلف جواب دیئے ہیں لیکن سب سے واضح جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے یہ خواہش دراصل اپنی قوم کی طرف سے کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل کے جہلاء میں سے ایک گروہ کا یہ اصرار تھا کہ وہ خدا کو کھلم کھلا دیکھیں گے تب جا کے ایمان لائیں گے (سورہ نساء کی آیت ۱۵۳ اس مطلب کی گواہ ہے)۔ حضرت موسیٰ کو اللہ کی جانب سے یہ حکم ملا کہ وہ اس درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کریں تاکہ سب اس کا جواب سن لیں۔ کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام سے جو حدیث مروی ہے وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہے[1]

اس تفسیر کے روشن قرائن میں سے ایک یہ ہے کہ اسی سورہ کی آیت ۱۵۵ میں وارد ہوا ہے کہ اس ماجرا کے بعد حضرت موسیٰ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی: اتھلکنا بما فعل السفھاء منا: "کیا تو اس عمل کی وجہ سے جو ہمارے نادانوں نے کیا ہے ہلاک کر دے گا؟" اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ حضرت موسیٰ نے یہ خواہش نہیں کی تھی بلکہ جو ستر آدمی ان کے ساتھ میعاد گاہ میں گئے تھے ان کی بھی یہ خواہش نہ تھی وہ حضرت موسیٰ کے منتخب شدہ علماء بنی اسرائیل تھے ان کے لانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ واپس جاکر اپنے مشاہدات ان سے بیان کریں۔

۲۔ **کیا خدا کو دیکھا جانا ممکن ہے؟**: آیہ مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے حضرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: نے اس طرح صاف اور نرم کر دیا کہ وہ ریزہ ریزہ ہوکر صاف و ہموار زمین کی طرح ہوگیا، حتیٰ کہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ وہ پہاڑ کئی حصوں میں تقسیم ہوکر مختلف جہات میں اڑ گیا، یا یہ کہ پورے کا پورا زمین کے اندر سما گیا۔

[1] تفسیر نور الثقلین جلد دوم ص۶۵۔

موسیٰ سے فرمایا: پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر باقی رہا تو مجھے دیکھ سکو گے" آیا اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا دیکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات ناممکن ہے جیسے ایک دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے:

حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط

کافر جنت میں نہیں جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے گزر جائے۔

چونکہ خدا کے جلوہ کے مقابلہ میں پہاڑ کا اپنی جگہ پر باقی رہنا محال تھا اس لیے یہ تعبیر استعمال کی گئی۔

۳۔ **خدا کے جلوہ سے کیا مراد ہے؟** : اس جگہ مفسّرین کے درمیان بہت بحث ہوئی ہے لیکن جو بات آیات کے موضوع سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپنی مخلوقات میں سے کسی ایک کا پرتو پہاڑ پر ڈال دیا تھا (اور اس کے آثار کا آشکار ہونا خود اس کے آشکار ہونے کی طرح ہے) سوال یہ ہے کہ آیا یہ مخلوق خدا کی عظیم آیات میں سے کوئی ایسی آیت تھی جو ہمارے لیے ناشناختہ ہے؟ یا اٹامک انرجی کا کوئی عظیم نمونہ تھا یا مرموز لہروں میں سے کوئی زلزلہ انگن لہر تھی یا کوئی عظیم صاعقہ[1] تھی جو اس پہاڑ پر گری اور اس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور مہیب آواز نکلی اور عظیم طاقت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

گویا خداوند کریم اس عمل سے دو چیزیں حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو دکھلانا چاہتا تھا:

اوّل : یہ کہ بندہ جب خدا کی ایک مخلوق کو نہیں دیکھ سکتا تو وہ خالق کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

دوم : یہ کہ یہ مخلوق جو کوئی بھی تھی اللہ کی ایک عظیم آیت تھی اور خود قابلِ رویت نہ تھی بلکہ اس کے آثار دیکھے گئے تھے۔ جیسے زلزلہ عظیم، مہیب آواز، روشنی لیکن ان چیزوں کی اصل جو ان آثار کا مرکز تھا چاہے وہ مرموز امواج ہوں یا کوئی ایٹمی طاقت ہو، قابلِ رویت نہ تھی نہ اسے حواس سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود کیا کوئی اس طاقت کے وجود سے انکار کر سکتا ہے یا اس کے وجود میں شک کر سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ یہ طاقت دکھائی نہیں دیتی صرف اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں اس لیے ہم اس پر ایمان نہیں لاتے۔ جب ایک مخلوق کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا تو خدائے بزرگ کے بارے میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ وہ قابلِ مشاہدہ نہیں ہے اس لیے ہم اس پر

---

[1] "صاعقہ" اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے ٹکڑوں اور کرۂ زمین کے درمیان بجلی (EIECTRicitY) کا تبادلہ ہوتا ہے وہ بادل جن کے اندر مثبت بجلی ہوتی ہے جب زمین جس میں منفی بجلی مخفی ہے کے نزدیک پہنچتے ہیں تو ان کے درمیان یعنی سطح زمین کے نزدیک ایک شعلہ نکلتا ہے جو بہت خطرناک اور ہلاکت آفرین ہوتا ہے لیکن "برق" اور "رعد" بادل کے دو ٹکڑوں کے درمیان الیکٹریسی کے تبادلے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ایک بادل میں مثبت اور دوسرے میں منفی الیکٹریسٹی ہوتی ہے اور چونکہ یہ ٹکراؤ آسمان پر ہوتا ہے اس لیے اس سے سوائے ہوائی جہازوں کے اور کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

ایمان نہیں لاتے جبکہ اس کے آثار سے جہان بھرا ہوا ہے ۔

اس آیت کے بارے میں ایک احتمال اور بھی ذکر کیا گیا ہے ، وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے واقعاً اپنے واسطے تمنائے دید کی تھی لیکن ان کا مقصد ان آنکھوں سے دیکھنا نہ تھا جس کا لازمہ جسمیت ہے اور یہ حضرت موسیٰؑ کے مقام کے مناسب نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد خدا کا مشاہدۂ باطنی تھا ایک روحانی اور کامل فکری دیدار تھا، کیونکہ اس معنی میں کلمۂ رویت بہت استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: میں اپنے میں یہ قدرت دیکھتا ہوں کہ اس کام کو انجام دوں ۔ حالانکہ " قدرت " قابلِ دید نہیں ہے ۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ میں اس حالت کو اپنے میں پاتا ہوں ۔

حضرت موسیٰؑ یہ چاہتے تھے کہ شہود و معرفت کے اس مقام پر فائز ہوں جس کا دنیا میں حاصل کرنا محال ہے ۔ یہ مرتبہ صرف آخرت کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ وہ عالمِ شہود و بروز ہے ۔

لیکن خدا نے حضرت موسیٰؑ کے جواب میں فرمایا : اس طرح کی رویت تمہارے لیے دنیا میں ہرگز ممکن نہیں ہے ۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے اللہ نے پہاڑ پر جلوہ دکھایا جس کی وجہ سے پہاڑ چکنا چور ہوگیا ۔ آخر میں حضرت موسیٰؑ نے اپنی اس خواہش سے پشیمانی اور توبہ کا اظہار کیا [1]

لیکن یہ تفسیر کئی جہت سے زیرِ بحث آیت کے ظاہر کے خلاف ہے اور اس کا لازمہ چند جہت سے مجاز کا استعمال ہے [2] علاوہ ازیں یہ تفسیر ان کئی احادیث کے بھی خلاف ہے جو اس آیت کی شرح میں وارد ہوئی ہیں لہٰذا وہی پہلی تفسیر ہی درست ہے ۔

۴۔ **حضرت موسیٰؑ نے کس چیز سے توبہ کی ؟ :** اس بارے میں آخری سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ ہوش میں آئے تو انہوں نے کیوں کہا ۔ " سبحانك تبت الیك " حالانکہ انہوں نے کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی ۔ کیونکہ اگر انہوں نے یہ درخواست اپنی امت کی طرف سے کی تھی تو اس میں ان کا کیا قصور تھا اللہ کی اجازت سے انہوں نے یہ درخواست خدا کے سامنے پیش کی اور اگر اپنے لیے شہود باطنی کی تمنا کی تھی تو یہ بھی خدا کے حکم کی مخالفت نہ تھی ، لہٰذا توبہ کس بات کی تھی ؟ ۔

دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے :

---

[1] خلاصہ از تفسیر میزان جلد ۸ ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۴ ۔

[2] کیونکہ مذکورہ تفسیر مخالف ہے کلمۂ " رویت " اور جملہ " لن ترانی " اور جملۂ " اتھلکنا بما فعل السفھآء منا " کی ، اس کے علاوہ یہ کہ شہود باطنی کی درخواست کوئی بُری درخواست نہ تھی جس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کو توبہ کرنے کی حاجت ہو کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی معاد کے متعلق خدا سے یہی درخواست کی تھی اور خدا نے اس کا مثبت جواب دیا تھا ، اور اگر شہود باطنی کے متعلق خدا کا جواب منفی بھی ہو تب بھی اس پر مؤاخذہ (عقاب) کرنے کی دلیل نہیں ہوگا ۔

اول : یہ کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کی نمائندگی کے طور پر خدا سے یہ سوال کیا تھا، اس کے بعد جب خدا کی طرف سے سخت جواب ملا جس میں اس سوال کی غلطی کو بتلایا گیا تھا تو حضرت موسیٰ نے توبہ بھی انہی کی طرف سے کی تھی۔

دوم : یہ کہ حضرت موسیٰ کو اگرچہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی درخواست کو پیش کریں لیکن جس وقت پروردگار کی تجلی کا واقعہ رونما ہوا اور حقیقت آشکار ہوگئی تو حضرت موسیٰ کی یہ ماموریت ختم ہو چکی تھی اب حضرت موسیٰ کو چاہیئے کہ پہلی حالت (یعنی قبل از ماموریت) کی طرف پلٹ جائیں اور اپنے ایمان کا اظہار کریں تاکہ کسی کے لیے جائے شبہ باقی نہ رہے، لہٰذا اس حالت کا اظہار موسیٰ نے اپنی توبہ اور اس جملہ " انی تبت الیك وانا اول المؤمنین " سے کیا۔

۵۔ خدائے متعال کسی صورت میں قابل رویت نہیں ہے : یہ آیت قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ خدا کی رویت ممکن نہیں ہے کیونکہ لفظ " لن " بربنائے مشہور دائمی نفی کے لیے آتا ہے۔ بنابریں اس جملہ " لن ترانی " کا مفہوم یہ ہے کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے نہ اِس جہان میں نہ اُس جہان میں۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی اس بات کو ماننے سے انکار کر دے کہ " لن " نفیٔ ابد کے لیے آتا ہے تب بھی آیت کا اطلاق نفیٔ رویت کے لیے باقی رہتا ہے کیونکہ آیت میں رویت کی بغیر کسی قید و شرط کے نفی کی گئی ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ذاتِ خداوندی کسی زمانے میں اور کسی حال میں قابل رویت نہیں ہے۔

عقلی دلائل بھی ہماری رہنمائی اسی امر کی طرف کرتے ہیں کہ اس کی رویت محال ہے کیونکہ رویت اجسام کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا اگر بعض آیات قرآنی یا روایاتِ اسلامی میں " لقائے پروردگار " کا ذکر ہوا ہے تو اس سے مراد وہی " چشم باطنی " اور " دیدۂ خرد " ہے کیونکہ قرینۂ عقلی و نقلی اس مدعا کے بہترین شاہد ہیں (سورۂ انعام کی آیت ۱۰۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر آئے ہیں)۔
(تفسیر نمونہ جلد ۵)

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ (۱۴۴)

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا (۱۴۵)

سَاُورِيكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۴۴) (خدا نے) کہا: اے موسیٰ میں نے تمہیں لوگوں پر اپنی رسالت کے ذریعے اور (تم سے) اپنے کلام کے ذریعے منتخب کیا، پس جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ۔

(۱۴۵) اور ہم نے ان کے لیے الواح میں ہر قسم کی نصیحت لکھی تھی اور ہر چیز کا بیان کیا تھا۔ پس (ہم نے ان سے کہا کہ) اسے مضبوطی سے تھام لو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اچھی طرح اس پر عمل کریں (اور وہ لوگ جو مخالفت کریں ان کا انجام دوزخ ہے) جلد ہی فاسقوں کی (یہ) جگہ ہم تمہیں دکھلا دیں گے۔

تفسیر

الواحِ توریت

آخرکار اس عظیم میعاد گاہ میں اللہ نے حضرت موسیٰ پر اپنی شریعت کے قوانین نازل فرمائے۔ پہلے ان سے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تمہیں لوگوں پر منتخب کیا ہے، اور تم کو اپنی رسالتیں دی ہیں، اور تم کو اپنے ساتھ گفتگو کا شرف عطا کیا ہے (قال یا موسیٰ انی اصطفیتك علی الناس برسالاتی و بکلامی)۔

اب جبکہ ایسا ہے تو، جو میں نے تم کو حکم دیا ہے اسے لے لو اور ہمارے اس عطیہ پر شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ (فخذ ما اٰتیتك وکن من الشاکرین)۔

کیا اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا سے کلام کرنے کا جو شرف حاصل ہوا وہ صرف انہی کا طرۂ امتیاز تھا کسی دوسرے نبی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا؟

حق یہ ہے کہ یہ آیت اس مطلب کا اثبات نہیں کرتی بلکہ لفظ "رسالات" کا قرینہ اس بات کا مظہر ہے کہ یہ دونوں امتیاز عام انسانوں کے مقابلے میں تھے کیونکہ رسالت کا شرف صرف

حضرت موسیٰؑ کے لیے مخصوص نہ تھا ۔

اس کے بعد اضافہ کیا گیا ہے کہ : ہم نے جو الواح موسیٰ پر نازل کی تھیں ان پر ہر موضوع کے بارے میں کافی نصیحتیں تھیں اور ضرورت کے مسائل کی شرح او بیان تھا (وکتبنا لہٗ فی الالواح من کل شیٔ موعظة وتفصیلا لکل شیٔ) ۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ " بڑی توجہ اور قوت ارادی کے ساتھ ان فرامین کو اختیار کرو " (فخذها بقوة) ۔

" اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان میں جو بہترین ہیں انہیں اختیار کریں " (وأمر قومك يأخذوا باحسنها) ۔

اور انہیں خبردار کر دو کہ ان فرامین کی مخالفت اور ان کی اطاعت سے فرار کرنے کا نتیجہ دردناک ہے اور اس کا انجام دوزخ ہے اور " میں جلد ہی فاسقوں کی جگہ تمہیں دکھلا دوں گا " (ساوریکم دار الفاسقین) ۔

چند اہم نکات

۱۔ **الواح کس چیز کی بنی ہوئی تھیں :** اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ خداوند کریم نے حضرت موسیٰؑ پر جو الواح نازل کی تھیں ان میں توریت کی شریعت اور قوانین لکھے ہوئے تھے ، ایسا نہ تھا کہ یہ لوحیں حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں تھیں اور اس میں فرامین منعکس ہو گئے تھے ۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لوحیں کیسی تھیں ؟ کس چیز کی بنی ہوئی تھیں ؟ قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے ۔ صرف کلمہ " الواح " سربستہ طور پر آیا ہے ۔ جو در اصل " لاح یلوح " کے مادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں ۔ چونکہ صفحہ کے ایک طرف لکھنے سے حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور مطالب آشکار ہو جاتے ہیں ، اس لیے اس صفحہ کو جس پر کچھ لکھا جائے " لوح " کہتے ہیں[1] لیکن روایات و اقوال مفسرین میں ان الواح کی کیفیت کے بارے میں اور ان کی جنس کے بارے میں گوناگوں احتمالات ذکر کیے گئے ہیں ۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی یقینی نہیں ہے اس لیے ان کے ذکر سے ہم اعراض کرتے ہیں ۔

۲۔ **کلام کیسے ہوا :** قرآن کریم کی مختلف آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا ، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا اس طرح تھا کہ اس نے صوتی امواج کو فضا میں

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۴ صـ ۵۳۹ ۔

یا کسی جسم میں پیدا کر دیا تھا۔ کبھی یہ امواجِ صوتی "شجرۂ وادیٔ ایمن" سے ظاہر ہوتی تھیں اور کبھی "کوہِ طور" سے حضرت موسیٰ کے کان میں پہنچتی تھیں۔ جن لوگوں نے صرف الفاظ پر نظر کی ہے اور اس پر غور نہیں کیا کہ یہ الفاظ کہاں سے نکل سکتے ہیں انہوں نے یہ خیال کیا کہ خدا کا کلام کرنا اس کے تجسم کی دلیل ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ خدا کے کلام کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود اس سے کلام صادر ہوا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کسی جسم میں کلام پیدا کیا۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ جب بھی یہ کلام سنتے تھے تو انہیں اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا تھا کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ انہیں یہ علم یا تو الہام کے ذریعے حاصل ہو گیا تھا یا بعض دیگر قرائن کے ذریعے۔

۳۔ **توریت پیامِ کامل نہ تھا:** چونکہ توریت کے متعلق یہ تعبیر کی گئی ہے کہ "من کل شیٔ موعظہ" اس لیے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مواعظ، نصیحتیں اور مسائل ضروری اس میں نہ تھے کیونکہ فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے لیے ہر چیز میں سے نصیحت لکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ کا آئین ایک آخری آئین تھا اور نہ وہ خود آخری نبی تھے لہٰذا اس زمانے میں جتنی لوگوں کی استعداد تھی اسی کی مناسبت سے احکام خدا نازل ہوئے تھے۔ لیکن جب انسان تعلیماتِ انبیاء کی وجہ سے استعدادِ بشری کے آخری مرحلے پر پہنچ گئے تو اس وقت اللہ کا آخری فرمان جو نوع بشر کی تمام مادی و معنوی ضروریات پر مشتمل ہے نازل ہوا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ بعض روایات میں جو وارد ہوا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا مقام حضرت موسیٰ سے بڑا تھا کیونکہ آپ تمام قرآن کے عالم تھے اور قرآن میں تمام چیزوں کا علم ہے (نزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیٔ) جبکہ توریت میں بعض مسائل کا ذکر ہے[1] وہ اسی مطلب کے مطابق ہے۔

۴۔ **"جو فرامین بہترین ہیں" سے کیا مراد ہے؟:** یہ جو مذکورہ بالا آیت میں آیا ہے کہ "ان فرامین میں جو بہترین ہیں ان کو لے لو" اس کے یہ معنی ہیں کہ ان احکام میں خوب و بد موجود تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جو احکام خوب ہیں انہیں لے لیں اور بد کو چھوڑ دیں، یا یہ کہ ان احکام میں خوب و خوب تر موجود تھا اور ان سے کہا گیا کہ جو احکام خوب تر ہیں ان کو لے لو اور جو خوب ہیں ان کو چھوڑ دو، ایسا نہیں ہے بلکہ کبھی کلمہ "افعل التفضیل" بہ معنی صفت مشبہ بھی آتا ہے، زیر بحث آیت بظاہر اسی قبیل سے ہے، یعنی "احسن" بمعنی "حسن" آیا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سب فرامین "حسن" اور نیک ہیں۔

---

[1] ان روایات کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ملاحظہ ہو۔

یہ احتمال بھی اس آیت میں ہے کہ "احسن" کے معنی وہی بہتر کے ہوں اور "افعل تفضیل" کے معنی میں ہو جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس (توریت) میں کچھ امور ایسے ہیں جن کی صرف اجازت ہے (جیسے قصاص وغیرہ) اور کچھ امور وہ ہیں جن کو بہتر کہا گیا ہے (جیسے عفو اور بخش دینا) یعنی اپنی امت سے کہہ دو کہ جتنا بھی ہو سکے جو امور بہتر ہیں ان کو انتخاب کریں (یعنی عفو کو قصاص پر ترجیح دیں)۔[1]

۵۔ "سأوریکم دار الفاسقین" (جلد ہی فاسقوں کا ٹھکانا میں تمہیں دکھلا دوں گا)

بظاہر اس سے دوزخ مراد ہے جو ان لوگوں کا ٹھکانا ہے جو خدا اور اس کے فرامین کی اطاعت سے خارج ہو گئے ہیں۔

یہ احتمال بھی بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اگر ان فرامین سے اختلاف کرو گے تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو قوم فرعون اور دیگر گنہگاروں کا ہوا تھا اور تمہاری سرزمین فاسقوں کے ٹھکانے میں تبدیل ہو جائے گی۔[2]

⁂

(۱۴٦) سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ۝

(۱۴۷) وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ‌ ؕ هَلۡ يُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ؔ

رکوع ۱۷

---

[1] یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "احسنہا" کی ضمیر "قوۃ" کی طرف پلٹتی ہو اس سے مراد یہ ہو کہ وہ بہترین قوۃ کے ساتھ احکام پر عمل کریں۔

[2] تفسیر المنار جلد ۹ صہ ۱۹۳۔

ترجمہ

(۱۴۶) جو لوگ زمین میں ناحق تکبّر کرتے ہیں ان کو مَیں اپنی آیتوں سے جلد ہی پلٹ دوں گا (اس طرح کہ) وہ جس آیت کو بھی دیکھیں گے اس پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں گے تو اس پر نہ چلیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں گے تو اس کو اختیار کریں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا اور وہ ان سے غافل تھے۔

(۱۴۷) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے کیا اس کے علاوہ کی ان کو سزا ملے گی؟

تفسیر

متکبروں کا انجام

ان دو آیتوں میں جو بحث کی گئی ہے اس میں درحقیقت ان گذشتہ آیتوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے جن میں فرعون، فرعونیوں اور بنی اسرائیل کے سرکش افراد کا انجام مذکور ہؤا ہے۔ خداوندکریم نے ان آیتوں میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اگر فرعون یا بنی اسرائیل کے سرکش افراد اتنے معجزات دیکھنے کے بعد اور اس قدر آیاتِ الٰہی سننے کے بعد راہِ راست پر نہ آئے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارا یہ قانون ہے کہ جو لوگ حق کے مقابلے کے لیے صف آرا ہوتے ہیں، ہم انہیں ان کے اعمال کے جرم میں، حق کے قبول کرنے سے روک دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ سرکشی اور تکذیبِ آیاتِ الٰہی میں اصرار انسان کی روح میں اس قدر اثر انداز ہوتا ہے کہ حق کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ایک ایسے سخت موجود کی ہو جاتی ہے جس پر کوئی شے اثر انداز نہیں ہوتی۔

اس لیے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم عنقریب ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق تکبّر کرتے ہیں اپنی

آیتوں سے پلٹا دیں گے (ساصرف عن ایاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق) ۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا آیت دلائل عقلی کے خلاف نہیں ہے کہ اس کی توجیہ کے لیے ہمیں دیگر مفسرین کی طرح ارتکابِ خلافِ ظاہر کی ضرورت پڑے ۔ یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ جو اس کے مقابلہ میں ضد سے کام لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتے ہیں، خدا ان سے ہر طرح کی توفیق کو سلب کر لیتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ خود ان کی بداعمالیوں کی خاصیت ہے لیکن چونکہ خدا کی ذات علۃ العلل اور مسبب الاسباب ہے اس لیے ان کی نسبت اللہ نے اپنی طرف دی ہے ۔

یہ موضوع نہ تو مستلزم جبر ہے اور نہ دوسرا کوئی محذور لازم آتا ہے کہ کسی توجیہ کی ضرورت ہو ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ لفظ "تکبر" کے بعد "بغیر الحق" کی قید تاکید کے لیے ہے، کیونکہ تکبر، خود بینی اور دیگر بندگانِ خدا کی تحقیر ہمیشہ ناحق ہی ہوتی ہے ۔

یہ تعبیر بالکل ایسی ہی ہے جیسے سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ میں آیا ہے :

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔

وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے ۔

خاص کر یہ کہ کلمہ " فی الارض " کے ہمراہ ہے جس کے معنی زمین پر سرکشی اور طغیان برپا کرنے کے ہیں اور یقیناً یہ عمل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے ۔

اس کے بعد اس طرح کے " متکبّر و سرکش " افراد کی تین صفتوں کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح ان سے حق کو قبول کرنے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

وہ اگر تمام آیاتِ الٰہی کو بھی دیکھیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے (و ان یروا کل ایۃ لا یؤمنوا بھا) ۔

" اور اگر راہِ راست کو دیکھیں گے تب بھی اسے اختیار نہ کریں گے (و ان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا) ۔

اس کے برعکس " اگر غلط اور ٹیڑھے راستے کو دیکھیں گے تو اس کو اختیار کریں گے (و ان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا) ۔

ان صفات کا ذکر کرنے کے بعد جو ان کی حق قبول کرنے کی حکایت ہیں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے : یہ سب اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور

ان سے غفلت برتی (ذالك بانهم كذبوا بآياتنا وكانوا عنها غافلين)۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف ایک مرتبہ یا چند مرتبہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب انسان میں قبولِ حق کی توفیق سلب کرنے کا استحقاق نہیں پیدا کرتی، بلکہ اس کے لیے راہ توبہ اب بھی کھلی ہوتی ہے لیکن اگر اس حالت میں اصرار و استمرار رہے تو آخر میں یہ نوبت آجاتی ہے کہ اس میں نیک و بد ("رشد" و "غی") کی تشخیص کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

بعد کی آیت میں ایسے لوگوں کی سزا کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کریں گے اور روزِ آخرت کی ملاقات کے منکر ہوں گے ان کے تمام اعمال بالکل حبط اور نابود ہو جائیں گے (والذين كذبوا بآياتنا ولقآء الآخرة حبطت اعمالهم)۔
"حبط" کے معنی عمل کو باطل اور بے اثر کر دینے کے ہیں۔ یعنی اس طرح کے افراد اگر کوئی کارِ خیر بھی کریں گے تو اس سے ان کے لیے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا (اس کی مزید توضیح کے لیے سورۂ بقرہ آیت ۲۱۷ کی تفسیر ملاحظہ ہو جو ہم اسی کتاب کی جلد دوم میں لکھ آئے ہیں)۔
آیت کے آخر میں اس طرح اضافہ فرمایا گیا ہے: ان کا جو یہ انجام ہوا ہے اس میں کسی جذبۂ انتقام کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو ان کے سامنے آیا ہے "آیا انہیں سوائے اپنے اعمال کے کسی اور چیز کی سزا دی جائے گی؟" (هل يجزون الا ما كانوا يعملون)
یہ آیت ان آیتوں میں سے ایک ہے جو اس بات کی دلیل ہیں کہ بروزِ قیامت انسان کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی (برخلاف مذہب جبر کے جو یہ کہتا ہے کہ جزا و سزا میں اعمال کو دخل نہیں ہے)۔

(۱۴۸) وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○

(۱۴۹) وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۴۸) قوم موسیٰ نے اس کے (میعاد گاہ الٰہی کی طرف جانے کے) بعد اپنے زیور اور آلات سے ایک گوسالہ بنایا، ایک (بے جان) جسد جس میں گائے کی آواز تھی کیا وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا اور راہ (راست) کی طرف ہدایت نہیں کر سکتا تھا، انہوں نے اس کو (بطور اپنے خدا کے) انتخاب کر لیا اور وہ ظالم تھے۔

(۱۴۹) اور جب انہیں حقیقت کا پتہ چلا اور انہوں نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو انہوں نے کہا: اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں میں گوسالہ پرستی کا آغاز

ان آیات میں افسوسناک اور تعجب خیز واقعات میں سے ایک واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے میقات کی طرف جانے کے بعد بنی اسرائیل میں رونما ہوا۔ وہ واقعہ ان لوگوں کی گوسالہ پرستی ہے۔ جو ایک شخص بنام "سامری" نے زیور و آلاتِ بنی اسرائیل کے ذریعے شروع کیا۔

اس داستان کی اہمیت اس قدر ہے کہ قرآن نے اس کا چار سورتوں میں ذکر کیا ہے' سورۂ بقرہ آیت ۵۱، ۵۴، ۹۲، ۹۳، سورۂ نساء آیت ۱۵۳، سورۂ اعراف زیرِ بحث آیات اور سورۂ طٰہٰ آیت ۸۸ اور اس کے بعد کی آیات۔

اتنا ضرور ہے کہ یہ حادثہ مثل دیگر اجتماعی حوادث کے بغیر کسی آمادگی اور مقدمہ کے وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ اس میں متعدد اسباب کار فرما تھے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

بنی اسرائیل عرصہ دراز سے اہلِ مصر کی بُت پرستی دیکھتے چلے آرہے تھے۔

جب دریائے نیل کو عبور کیا تو انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بت کی پرستش کرتی تھی. جیسا کہ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ آیات میں اس کا ذکر گزرا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے ان کی طرح کا بُت بنانے کی فرمائش کی جس پر حضرت موسیٰ نے انہیں سخت سرزنش کی۔

حضرت موسیٰ کے میقات کا پہلے تیس راتوں کا ہونا اس کے بعد چالیس راتوں کا ہو جانا اس سے بعض منافقوں کو یہ موقع ملا کہ حضرت موسیٰ کی وفات کی افواہ پھیلا دیں۔

قوم موسیٰ میں بہت سے افراد کا جہل و نادانی سے متصف ہونا اس کے مقابلے میں سامری کی مکاری و مہارت کیونکہ اس نے بڑی ہوشیاری سے بُت پرستی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔ بہرحال ان تمام باتوں نے اکٹھا ہو کر اس بات کے اسباب پیدا کیے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت بت پرستی کو قبول کرلے اور "گوسالہ" کے چاروں طرف اس کے ماننے والے ہنگامہ برپا کر دیں۔

آیت مذکورہ بالا میں پہلے قرآن اس طرح فرماتا ہے: قوم موسیٰ نے موسیٰ کے میقات کی طرف جانے کے بعد اپنے زیورات و آلات سے ایک گوسالہ بنایا جو ایک بے جان جسد تھا جس میں سے گائے کی آواز آتی تھی، اسے انہوں نے اپنے واسطے انتخاب کیا (واتخذ قوم موسٰی من بعدہ من حلیھم عجلاً جسداً لہ خوار)۔

اگرچہ یہ عمل سامری سے سرزد ہوا تھا (جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیات میں آیا ہے) لیکن اس کی نسبت قوم موسیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کام میں سامری کی مدد کی تھی اور وہ اس کے شریکِ جرم تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی بڑی تعداد اس کے فعل پر راضی تھی۔

ظاہر آیت یہ ہے کہ تمام قوم موسیٰ اس گوسالہ پرستی میں شریک تھی لیکن اگر اسی سورہ کی آیت ۱۵۹ پر نظر کی جائے جس میں آیا ہے کہ:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ٥

قوم موسیٰ میں ایک امت تھی جو لوگوں کو حق کی ہدایت کرتی تھی اور اسی کی طرف متوجہ تھی۔

اس سے معلوم ہوگا کہ زیر بحث آیت سے مراد تمام امت موسیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی اکثریت اس گوسالہ پرستی کی تابع ہو گئی تھی جیسا کہ آئندہ آیات میں آنے والا ہے کہ وہ اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام مع اپنے ساتھیوں کے ان کے مقابلے میں ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے۔

⁂

طلائی گوسالہ سے کس طرح آواز پیدا ہوئی؟

کلمہ "خوار" کے معنی اس مخصوص آواز کے ہیں جو گائے یا گوسالہ سے نکلتی ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سامری جو کہ ایک صاحبِ فن انسان تھا اس نے اپنی معلومات سے کام لے کر طلائی گوسالہ کے سینے میں کچھ مخصوص نل (PIPE) اس طرح مخفی کر دیئے تھے جن کے اندر سے دباؤ کی وجہ سے جب ہَوا نکلتی تھی تو گائے کی آواز آتی تھی۔

کچھ کا خیال ہے کہ گوسالہ کا منہ اس طرح کا پیچیدہ بنایا گیا تھا کہ جب اسے ہَوا کے رُخ پر رکھا جاتا تھا تو اس کے منہ سے یہ آواز نکلتی تھی۔

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں پر توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ سامری کو چونکہ اس بات کا احساس تھا کہ قومِ موسیٰ عرصۂ دراز سے محرومی اور مظلومی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس وجہ سے اس میں مادہ پرستی اور حُبِّ زر کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی ان کی یہی صفت ہے لہٰذا اس نے یہ چالاکی کی کہ وہ مجسمہ سونے کا بنایا کہ اس طرح ان کی توجہ کو زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مبذول کرا سکے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس محروم و فقیر ملت کے پاس اس روز اتنی مقدار میں زر و زیور کہاں سے آگیا کہ اس سے یہ مجسمہ تیار ہوگیا؟ اس کا جواب روایات میں اس طرح ملتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے ایک تہوار کے موقع پر فرعونیوں سے زیورات مستعار لیے تھے یہ اس وقت کی بات ہے جس کے بعد ان کی غرقابی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ زیورات ان عورتوں کے پاس باقی رہ گئے تھے[1]

❊

اس کے بعد قرآن سرزنش کے طور پر ان سے کہتا ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ گوسالہ ان سے باتیں نہیں کر سکتا تھا نہ ان کی رہنمائی کر سکتا تھا (الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلاً)۔

مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقی خدا کو کم از کم ایسا تو ہونا چاہیئے کہ اسے نیک و بد کی تمیز ہو اور وہ اپنے ماننے والوں کی ہدایت کر سکے، اپنی عبادت کرنے والوں سے بات کر سکے اور عبادت کے طریقے انہیں سکھا سکے۔

اصولی طور پر عقلِ انسانی کس طرح انسان کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ایسے بے جان

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکورہ ملاحظہ ہو۔

معبود کی پرستش کرے جو خود اس کا ساختہ پرداختہ ہے، حتیٰ کہ اگر بالفرض وہ سونا ایک زندہ بچھڑے کی شکل میں بھی تبدیل ہو جائے تب بھی وہ کسی طرح قابلِ پرستش نہیں ہوگا۔ گوسالہ جو بالکل نہیں سمجھتا بلکہ نافہمی میں ضرب المثل ہے۔

اس طرح ان لوگوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

انہوں نے گوسالہ کو اپنے معبود کے طور پر انتخاب کر لیا، اور وہ ظالم و ستمگر تھے (اتخذوہ وکانوا ظالمین)۔

لیکن جب حضرت موسیٰ واپس آئے اور مسائل واضح ہو گئے تو بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے۔ انہوں نے خدا سے اپنے اس بُرے عمل کی معافی چاہی۔ چنانچہ انہوں نے کہا: اگر پروردگار ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں نہ بخشے تو ہم یقینی طور پر گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (ولما سقط فی ایدیھم ورأوا انھم قد ضلوا قالوا لئن لم یرحمنا ربنا ویغفرلنا لنکونن من الخاسرین)۔

یہ جملہ "ولما سقط فی ایدیھم" (یعنی جب حقیقت ان کے ہاتھ لگی، یا جب ان کے اعمالِ شوم کا نتیجہ ان کے ہاتھ لگا، یا جب چارۂ کار ان کے ہاتھ سے نکل گیا) ادب عربی میں ندامت و پشیمانی سے کنایہ ہے، کیونکہ واقعات انسان کے ہاتھ لگتے ہیں اور وہ حقائق سے آگاہ ہو جاتا ہے، یا یہ کہ کسی کام کے ناپسندیدہ نتائج سے دوچار ہوتا ہے یا اس کے اوپر راہِ چارہ مسدود ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت پشیمان ہوتا ہے۔ بنا بریں پشیمانی اس جملے کے لوازم میں سے ہے۔

بہر حال بنی اسرائیل اپنے کیے پر نادم ہوئے، لیکن اتنی بات پر مطلب کا خاتمہ نہیں ہوا جیسا کہ بعد کی آیات میں آنے والا ہے۔

۞

(۱۵۰) وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي ۚ

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

(۱۵۱) قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ ع ۸

ترجمہ

(۱۵۰) جب موسٰی اپنی قوم کی طرف غضبناک اور رنجیدہ پلٹے تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ میرے بعد میرے بُرے جانشین نکلے (اور تم نے میرے آئین کو ضائع کر دیا) کیا تم نے اپنے رب کے فرمان کے (اور مدّت میعاد کی تمدید اور فیصلہ کے) بارے میں عجلت سے کام لیا؟! اس کے بعد انہوں نے الواح کو ڈال دیا اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ لیا اور (غصہ میں اسے) اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کہا اے میرے ماں جائے! اس قوم نے مجھے کمزور کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں، لہٰذا کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ دشمن میری شماتت کریں اور مجھے ظالم گروہ میں قرار نہ دو۔

(۱۵۱) (موسٰی نے) کہا پروردگارا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تُو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

تفسیر

گوسالہ پرستوں کے خلاف شدید ردِّ عمل

ان دو آیتوں میں اس کشاکش اور نزاع کا ماجرا بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسٰیؑ اور گوسالہ پرستوں کے درمیان اس وقت واقع ہوئی جب وہ میعاد گاہ سے واپس ہوئے جس کی طرف

گذشتہ آیت میں صرف اشارہ کیا گیا تھا، ان آیتوں میں تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ کے اس ردِ عمل کو بیان کیا گیا ہے جو اس گروہ کے بیدار کرنے کے لیے ان سے ظاہر ہوا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جس وقت موسیٰ غضبناک و رنجیدہ اپنی قوم کی طرف پلٹے اور گوسالہ پرستی کا نفرت انگیز منظر دیکھا تو ان سے کہا کہ تم لوگ میرے بعد بُرے جانشین نکلے تم نے میرا آئین ضائع کر دیا (ولما رجع موسٰی الیٰ قومہ غضبان اسفًا قال بئسما خلفتمونی من بعدی)[1]

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ میعادگاہ پروردگار سے پلٹتے وقت قبل اس کے کہ بنی اسرائیل سے ملتے، غضبناک اور اندوہگین تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے میعادگاہ میں انہیں اس کی خبر دے دی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۔ (سورہ طٰہٰ آیت ۸۵)

مَیں نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کی آزمائش کی لیکن وہ اس آزمائش میں پوری نہ اتری اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ نے انہیں کہا: آیا تم نے اپنے پروردگار کے فرمان کے بارے میں جلدی کی (اعجلتم امر ربکم)۔

اگرچہ مفسّرین نے اس جملے کی تفسیر میں بہت بحث کی ہے اور گوناگوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ تم نے خدا کے اس فرمان، کہ اس نے میعاد کا وقت تیس شب سے چالیس شب کر دیا، جلدی کی اور جلد فیصلہ کر دیا، میرے نہ آنے کو میرے مرنے یا وعدہ خلافی کی دلیل سمجھ لیا، حالانکہ لازم تھا کہ تھوڑا صبر سے کام لیتے اور چند روز اور انتظار کر لیتے تاکہ حقیقت واضح ہو جاتی۔

اس وقت جبکہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی زندگی کے ان طوفانی و بحرانی لمحات سے گزر رہے تھے، سر سے پیر تک غصّہ اور افسوس کی شدت سے بھڑک رہے تھے، ایک عظیم اندوہ نے ان کے وجود پر سایہ ڈال دیا تھا اور انہیں بنی اسرائیل کے مستقبل کے بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی، کیونکہ تخریب اور تباہ کاری آسانی سے ہو جاتی ہے۔ کبھی صرف ایک انسان کے ذریعے بہت بڑی خرابی

---

[1] «اسف» کے معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے اس «اندوہ» کے ہیں جس میں «غیظ و غضب» کی آمیزش ہو۔ نیز یہ کلمہ ان دونوں معنی میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے بہت زیادہ ناراض ہو جائے۔ یہ بات طبیعی ہے اگر یہ ناراضی ان افراد سے ہو جو ماتحت ہیں تو غصہ کی شکل میں ظاہر ہوگی اور اگر ان افراد سے ہو جو اس سے اوپر ہیں، جن پر اس کا کوئی زور نہیں تو رنج و اندوہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ چنانچہ ابن عباس سے روایت ہے کہ غیظ و غضب اور رنج و اندوہ ان سب کی اصل ایک ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

اور تباہی واقع ہو جاتی ہے لیکن اصلاح اور تعمیر میں دیر لگتی ہے۔
خاص طور پر جب کسی نادان، متعصب اور ہٹ دھرم قوم کے درمیان کوئی غلط ساز بجا دیا جائے تو اس کے بعد اس کے بُرے اثرات کا زائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔
قرآن نے حضرت موسیٰ کا وہ شدید ردِ عمل بیان کیا ہے جو اس طوفانی و بحرانی منظر کو دیکھنے کے بعد ان سے ظاہر ہوا: "موسیٰ نے بے اختیارانہ طور پر اپنے ہاتھ سے توریت کی الواح کو زمین پر ڈال دیا اور اپنے بھائی ہارون کے پاس گئے اور ان کے سر اور داڑھی کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا"۔ (والقی الالواح واخذ برأس اخیه یجرهٗ الیه)۔
جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات بالخصوص سورہ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے علاوہ ہارون کو بڑی شدت سے سرزنش کی اور بآواز بلند چیخ کر پکارے:
کیا تم نے بنی اسرائیل کے عقائد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور میرے فرمان کی مخالفت کی؟![1]
درحقیقت حضرت موسیٰ کا یہ ردِ عمل ایک طرف تو ان کی اس واردات قلبی، بے قراری اور شدید ناراضی کی حکایت کرتا ہے جو بنی اسرائیل کی بت پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئی، دوسری طرف یہ اس بات کا ایک مؤثر سبب بنا کہ بنی اسرائیل کی عقل میں ایک حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے اس عمل کی قباحت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔
بنا بریں اگرچہ بالفرض۔ الواحِ توریت کا پھینک دینا قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہو، اور بھائی کی شدید سرزنش نادرست ہو لیکن اگر حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ اگر حضرت موسیٰ اس شدید اور پُرہیجان ردِ عمل کا اظہار نہ کرتے تو ہرگز بنی اسرائیل اپنی غلطی کی سنگینی اور اہمیت کا اندازہ نہ کر سکتے ممکن تھا کہ اس بت پرستی کے آثارِ بد ان کے ذہنوں میں باقی رہ جاتے لہٰذا حضرت موسیٰ نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف غلط نہ تھا بلکہ ایک امر لازم تھا۔
اس بنا پر واضح ہوا کہ ان تمام توجیہوں کی ضرورت نہیں ہے جو اس مقام پر بعض مفسرین حضرت موسیٰ کے ردِ عمل کو مقامِ عصمتِ انبیاء سے سازگار کرنے کے لیے کرتے ہیں۔
لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ اس واقعہ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ تاریخ بنی اسرائیل میں کبھی اس قدر ناراض نہ ہوئے تھے کیونکہ ان کے سامنے بدترین منظر تھا۔ یعنی بنی اسرائیل خدا پرستی کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی اختیار کر چکے تھے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی وہ تمام زحمتیں جو انہوں نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے کی تھیں سب برباد ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ایسے موقع پر الواح کا ہاتھوں سے

---

[1] سورۂ طٰہٰ ۹۲ - ۹۳۔

گر جانا اور بھائی سے سخت مواخذہ کرنا ایک طبعی امر تھا۔

اس شدید ردِ عمل اور غیظ و غضب کے اظہار نے بنی اسرائیل پر بہت زیادہ تربیتی اثر مرتب کیا اور منظر کو بالکل پلٹ دیا۔ جبکہ اگر حضرت موسیٰ نرم زبان استعمال کرتے تو شاید اس کا تھوڑا سا اثر بھی مرتب نہ ہوتا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہارونؑ نے موسیٰ کی محبت کو برانگیختہ کرنے کے لیے اور اپنی بے گناہی بیان کرنے کے لیے کہا: اے میرے ماں جائے! اس نادان امت کے باعث ہم اس قدر قلیل ہو گئے کہ نزدیک تھا کہ مجھے قتل کر دیں لہٰذا میں بالکل بے گناہ ہوں لہٰذا آپ کوئی ایسا کام نہ کریں کہ دشمن ہنسی اڑائیں اور مجھے اس ستمگر امت کی صف میں قرار نہ دیں (قال ابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعدآء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین)۔

اس آیت میں جو "ابن ام" کی تعبیر آئی ہے یا سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۴ میں "یابن ام" کی آئی ہے (جس کے معنی اے میری ماں کے بیٹے کے ہیں) حالانکہ موسیٰ اور ہارونؑ دونوں ایک والدین کی اولاد تھے یہ اس لیے تھا کہ حضرت ہارونؑ چاہتے تھے کہ حضرت موسیٰ کا جذبۂ محبت بیدار کریں۔

بہرحال حضرت موسیٰ کی یہ تدبیر کارآمد ہوئی اور بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے توبہ کی خواہش کا اظہار کیا۔

٭

اب حضرت موسیٰ کی آتش غضب کم ہوئی اور وہ درگاہِ خداوندی کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کی: پروردگارا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت بے پایاں میں داخل کر دے تُو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (قال رب اغفرلی ولاخی وادخلنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین)۔

اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرنا اس بنا پر نہیں تھا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا بلکہ یہ پروردگار کی بارگاہ میں ایک طرح کا خضوع و خشوع تھا اور اس کی طرف بازگشت تھی۔ اور بت پرستوں کے اعمالِ زشت سے اظہارِ تنفر تھا۔ اسی طرح اس میں سب کے لیے ایک طرح کا نمونۂ عمل ہے تاکہ وہ یہ سوچیں کہ جبکہ حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی جن سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی تھی وہ اس کی بارگاہ میں اس قدر لرزہ بر اندام ہیں، اس سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے اور اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر کرنا چاہیے اور پروردگارِ عالم کی طرف پلٹنا چاہیے، اپنے گناہوں کی معافی اس سے طلب کرنا چاہیے جیسا کہ گذشتہ دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

٭

قرآن اور موجودہ توریت کا موازنہ

جیسا کہ آیاتِ مذکورہ بالا اور سورۂ طٰہٰ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "گوسالہ" کو نہ تو بنی اسرائیل نے بنایا تھا نہ حضرت ہارونؑ نے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات کے مطابق بنی اسرائیل میں سے ایک شخص سامری نے یہ حرکت کی تھی، جس پر حضرت ہارونؑ جو حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور ان کے معاون تھے خاموش نہ بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کی، انہوں نے اتنی کوشش کی کہ نزدیک تھا کہ لوگ انہیں قتل کر دیتے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ توریت میں گوسالہ سازی اور بُت پرستی کی طرف دعوت کو حضرت ہارونؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے، چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل ۳۲ میں یہ عبارت ملتی ہے:

> جس وقت قوم موسیٰ نے دیکھا کہ موسیٰ کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا کہ اٹھو اور ہمارے لیے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ یہ شخص موسیٰ جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری ہارون نے ان سے کہا: طلائی بُندے (گوشوارے) جو تمہاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انہیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کر کے ہارون کے پاس لائی، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیا اور کندہ کرنے کے ایک آلہ کے ذریعے تصویر بنائی اور اس سے ایک گوسالہ کا مجسمہ ڈھالا اور کہا کہ اے بنی اسرائیل! یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں سرزمینِ مصر سے باہر لایا ہے...

اسی کے ذیل میں ان مراسم کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت ہارونؑ نے اس بت کے سامنے قربانی کرنے کے بارے میں بیان کیے تھے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے واپس آنے اور غیظ و غضب کرنے کے سلسلہ میں اس طرح لکھا ہے:

> اور موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ اس قوم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں مبتلا کر دیا؟

اور ہارون نے کہا:

> میرے آقا کا غصہ نہ بھڑکے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ قوم (ہمیشہ) بدی کی طرف مائل ہے....

جو کچھ سطور بالا میں بیان ہوا یہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی داستان کا ایک حصہ ہے جو توریت

میں مذکور ہے اس کی عبارت بعینہٖ نقل کی گئی ہے حالانکہ خود توریت نے حضرت ہارونؑ کے مقام بلند کو متعدد فصول میں بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعض معجزات حضرت ہارونؑ کے ذریعے ظاہر ہوئے تھے (فصل ۸ از سفر خروج توریت) اور ہارون کا حضرت موسیٰؑ کے ایک رسول کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے (فصل ۸ از سفر خروج)۔

ہرکیف حضرت ہارونؑ جو حضرت موسیٰؑ کے جانشین برحق تھے اور ان کی شریعت کے سب سے بڑے عالم و عارف تھے توریت ان کے لیے مقام بلند کی قائل ہے۔ اب ذرا ان خرافات کو بھی دیکھ لیجئے کہ انہیں ایک بت ساز ہی نہیں بلکہ ایک مؤسس بت پرستی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے بلکہ "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مقولہ کے مطابق ان کی جانب سے ایک غلط عذر پیش کیا کیونکہ جب حضرت موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ یہ قوم بدی کی طرف مائل تھی اس لیے میں نے بھی اسے اس راہ پر لگا دیا۔ جبکہ قرآن ان دونوں بلند پایہ پیغمبروں کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے پاک و صاف سمجھتا ہے۔

صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں قرآنی تاریخ انبیاء و مرسلین کی پاکی و تقدس کا مظہر ہے جبکہ موجودہ توریت کی تاریخ انبیاء و مرسلین کی ساحت قدس کے متعلق انواع و اقسام کی خرافات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق حقانیت و اصالتِ قرآن اور موجودہ توریت و انجیل کی تحریف کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں انبیاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کا موازنہ کر لیا جائے اس سے اپنے آپ پتہ چل جائیگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

⁂

۱۵۲ إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۝

۱۵۳ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

۱۵۴ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي

نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۲) وہ لوگ جنہوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنایا عنقریب اپنے رب کے غضب میں مبتلا ہوں گے، اور حیاتِ دنیا میں گرفتارِ ذلت ہوں گے اور ہم ان لوگوں کو جو (خدا پر) بہتان باندھتے ہیں، سزا دیتے ہیں۔

(۱۵۳) اور وہ لوگ جو گناہ کریں اور اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لائیں (انہیں بخشش کی امید ہے کیونکہ) تیرا رب اس (توبہ) کے بعد ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(۱۵۴) اور جب موسٰی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے (توریت کی) الواح کو اٹھایا اور اس کے اندر ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ہدایت اور رحمت لکھی ہوئی تھی۔

تفسیر

جیساکہ ہم سابقاً لکھ آئے ہیں حضرت موسٰیؑ کے اس شدید ردِّ عمل نے اپنا اثر دکھایا اور جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی تھی اور ان کی تعداد اکثریت میں تھی وہ اپنے کام سے پشیمان ہوئے ان کی پشیمانی کا ذکر سابقہ آیت ۱۴۹ میں بھی آچکا ہے، لیکن چونکہ یہاں پر یہ توہم ہوتا ہے کہ ان کی بخشش کے لیے شاید مذکورہ پشیمانی کافی تھی، قرآن نے یہ اضافہ کیا ہے:

"وہ لوگ جنہوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنایا جلد ہی انہیں پروردگار کا غضب اور اس جہان میں ذلت وخواری نصیب ہوگی" (ان الذین اتخذوا العجل سینالهم غضب من ربهم وذلة فی الحیٰوة الدنیا)۔

نیز اس تصور کو دُور کرنے کے لیے کہ یہ قانون صرف ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے فرماتا ہے:

"وہ تمام لوگ جو (خدا پر) بہتان باندھتے ہیں انہیں ہم ایسی ہی سزا دیں گے" (وکذالک نجزی المفترین)۔

لفظ "اتخذوا" کی تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ "بُت" کی کوئی حقیقت نہیں

ہے، صرف بُت پرستوں کی قرار داد اور انتخاب ہے جو بُتوں کو مزعومہ شخصیت و مقام دیتی ہے۔ اسی بنا پر اس لفظ کے بعد ہی لفظ "عجل" آیا ہے یعنی وہ گوسالہ برائے پرستش انتخاب کے بعد بھی وہی گوسالہ ہی رہا۔

باقی رہتا ہے یہ سوال کہ اس "غضب" اور "ذلت" سے کیا مراد ہے؟ قرآن نے آیہ فوق میں اس امر کی کوئی توضیح نہیں کی ہے۔ صرف سربستہ کہہ کر بات آگے بڑھا دی ہے لیکن ممکن ہے اس سے ان بدبختیوں اور پریشانیوں کی جانب اشارہ مقصود ہو جو اس ماجرے کے بعد اور بیت المقدس میں ان کی حکومت سے پہلے انہیں پیش آئیں۔

یا اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہو جو اس گناہ کے بعد انہیں دیا گیا کہ وہ بطور پاداش ایک دوسرے کو قتل کریں جس کی تفصیل اسی کتاب کی جلد اوّل میں گذر چکی ہے۔

اس جگہ ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ حقیقی توبہ کا تحقق ہو جاتا ہے، جب انہوں نے اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کر دیا تو اللہ کی عفو و بخشش ان کے شامل حال کیوں نہ ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ صرف پشیمانی ہر گناہ کے معاف ہونے کے لیے کافی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ندامت ارکانِ توبہ میں سے ایک اہم رکن ہے لیکن یہ ارکان میں سے ایک رکن ہے رکنِ کامل نہیں ہے۔

گناہ بت پرستی اور گوسالہ کے آگے سجدہ، وہ بھی اس وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ، پھر اس ذرا سی مدت (چالیس روز) میں ان کا بے دین ہو جانا، وہ بھی اس قوم و ملت کا جس نے اتنے معجزات دیکھے ہوں یہ ایک ایسا چھوٹا سا گناہ نہ تھا جو ایک "استغفراللہ" سے دُھل جاتے۔

بلکہ چاہیئے یہ ہے کہ یہ قوم غضب پروردگار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، ذلت کا مزہ اس دنیاوی زندگی میں چکھے اور اس تازیانے کو اپنے بدن پر محسوس کرے جو ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں تاکہ آئندہ اتنے عظیم گناہ کا تصور بھی نہ آنے پاتے۔

اس کے بعد کی آیت میں اس موضوع کی تکمیل کر دی گئی ہے اور اسے ایک کلّی قانون کے طور پر یوں بیان کیا گیا ہے: لیکن وہ لوگ جو اعمالِ بد بجا لائیں اور اس کے بعد توبہ کرلیں (اور توبہ کی تمام شرائط پوری کر دیں)، اور خدا پر ایمان کی تجدید کریں اور ہر قسم کے شرک اور نافرمانی سے باز رہیں، تمہارا پروردگار ان سب کے بعد انہیں بخش دے گا وہ بخشنے والا اور مہربان ہے (والذین عملوا السیئات ثم تابوا من بعدها و اٰمنوا ان ربک من بعدها

لغفور رحیم)۔

دو سوالوں کا جواب

۱۔ آیا مذکورہ بالا دونوں آیتیں ایک جملہ معترضہ ہیں جو داستان بنی اسرائیل کے درمیان تذکر کے طور پر پیغمبر اسلامؑ پر نازل ہوئیں، یا یہ دونوں آیتیں واقعۂ گوسالہ پرستی کے بعد حضرت موسیٰؑ کے لیے خدا کا ایک پیام ہیں؟۔

بعض مفسّرین نے پہلا احتمال ذکر کیا ہے دوسروں نے دوسرا احتمال قبول کیا ہے، جن لوگوں نے پہلا احتمال اختیار کیا ہے انہوں نے جملہ: "ان ربك من بعدها لغفور رحیم" (تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخشنے والا مہربان ہے) سے استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ جملہ پیغمبر اسلامؑ سے ایک خطاب ہے۔ اور جن لوگوں نے دوسرا احتمال اختیار کیا ہے انہوں نے جملۂ "سینالهم غضب" (جلد ہی انہیں خدا کا غضب آئے گا) سے استدلال کیا ہے جو فعل مضارع کی صورت میں ہے۔

لیکن آیت کا ظاہر یہ کہتا ہے کہ ماجرائے گوسالہ پرستی کے بعد یہ خدا کے موسیٰؑ سے خطاب کا ایک حصّہ ہے، اور فعل مضارع "سینالهم" اس کا ایک قوی شاہد ہے، جبکہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ "ان ربك" کا خطاب حضرت موسیٰؑ سے ہو[1]

۲۔ مندرجہ بالا آیہ میں توبہ کے بعد ایمان کا کیوں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اگر ایمان نہ ہو تو توبہ نہیں ہوتی؟

اس سوال کا جواب بھی اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کے ستون گناہ کے بعد کمزور ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلامی روایات میں ہے:

"شراب خور جب شراب پیتا ہے اس وقت ایمان نہیں رکھتا، اسی طرح زنا کرنے والا بھی زنا کرتے وقت ایمان سے خالی ہوتا ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ اس وقت ایمان اپنی تازگی کو کھو دیتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ تاریک کم نور اور کم اثر ہو جاتا ہے۔

لیکن جس وقت بندہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان کی لَو دوبارہ بھڑک اٹھتی ہے اور ایمان دوبارہ تازہ ہو جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالنا چاہیئے کہ اس آیت میں صرف ذلتِ دنیوی کا ذکر کیا گیا ہے

---

[1] اس آیت کی تقدیر اس طرح ہے: "قال الله لموسٰی ان الذین ..."

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان لوگوں نے شرک و بُت پرستی سے اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا اور اس دنیا کی سزا کو قبول کیا تو بنی اسرائیل کے اس گناہ سے ان کی توبہ قبول ہوگئی اور آخرت کی سزا معاف ہوگئی اگرچہ دوسرے گناہوں کا جو بار تھا وہ ان کے کاندھوں پر باقی رہا۔

آیاتِ زیرِ بحث کی آخری آیت کہتی ہے : جب موسٰی کے غضب کی آگ ٹھنڈی ہوئی (اور جس نتیجہ کی انہیں توقع تھی وہ ظاہر ہوگیا)، موسٰی نے زمین پر سے الواحِ توریت اٹھالیں، ایسی الواح جن کے نوشتہ میں سراسر ہدایت و رحمت تھی، لیکن ہدایت و رحمت ان افراد کے لیے جو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (ولما سکت عن موسی الغضب اخذ الالواح وفی نسختها هدی ورحمة للذین هم لربهم یرهبون)۔

(۱۵۵) وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝

(۱۵۶) وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۵۵) اور موسٰی نے ہماری میعادگاہ کے لیے اپنی قوم میں سے ستر مردوں کو چُنا، پھر

جب زلزلہ نے انہیں آلیا (اور وہ ہلاک ہوگئے) تو کہا : میرے پروردگار ! اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس (واقعہ) سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا ، آیا تو ہمیں اس چیز کی وجہ سے ہلاک کرے گا جو ہم میں سے بعض نادانوں نے کی ہے ۔ یہ صرف تیری ایک آزمائش ہے ، جسے تو چاہے (مستحق گمراہی جانے) گمراہ کر دے ، اور جسے تو چاہے (اور مستحق ہدایت جانے اسے) ہدایت عطا کر دے تو ہمارا ولی ہے لہٰذا ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو تمام بخشنے والوں سے بہتر ہے ۔

(۱۵٦) اور ہمارے لیے اس دار دنیا میں اور دوسری دنیا میں بھی نیکی لکھ دے کیونکہ ہم نے تیری طرف بازگشت کی ہے (اللہ نے) کہا : میرا عذاب جسے میں چاہوں گا پہنچے گا اور میری رحمت نے ہر چیز کو اپنی وسعت میں لیا ہوا ہے ، پس میں اسے ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں ۔

تفسیر

میعاد گاہ الٰہی میں بنی اسرائیل کے نمائندوں کا حضور

آیات مذکورہ بالا میں قرآن مجید نے دوبارہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے کچھ منتخب افراد کے میعاد گاہ الٰہی میں جانے کا ذکر کیا ہے ۔

حضرت موسیٰؑ ایک مرتبہ میعاد گاہ میں گئے یا یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے ۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اسی سورہ کی آیت ۱۴۲ کے ذیل میں یاد دہانی کروائی ہے کہ آیات قرآنی اور احادیثِ نبوی سے جو قرائن حاصل ہوئے ہیں ان سب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ہی مرتبہ میقات پر گئے تھے وہ بھی بنی اسرائیل کے کچھ نمائندوں کو لے کر ، اسی میقات میں خدا نے

موسیٰ پر الواح توریت کو نازل کیا اور ان سے گفتگو کی، نیز اسی میقات کی بات ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے یہ پیشنہاد کی کہ وہ خدا سے اس بات کی درخواست کریں کہ وہ اپنے کو دکھلائے۔ یہی وہ جگہ بھی جہاں زلزلہ آیا یا صاعقہ آئی اور موسیٰ بے ہوش ہو گئے اور بنی اسرائیل زمین پر گر گئے، نیز علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں جو حدیث نقل کی ہے اس میں بھی اس مطلب کی تصریح موجود ہے۔

اگر ان آیات کے محل وقوع اور ترتیب کے لحاظ سے کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ ان آیات میں پہلے تو اللہ نے حضرت موسیٰ کی میعاد کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد گوسالہ پرستی کا واقعہ بیان کیا ہے، اس کے بعد دوبارہ میعاد کا ذکر چھیڑ دیا ہے، آیا اس طرح کی طرزِ ادا اس فصاحت و بلاغت سے مطابقت رکھتی ہے جو قرآن کا طرۂ امتیاز ہے؟ لیکن اگر اس بات کو زیرِ نظر رکھا جائے کہ قرآن کریم کوئی تاریخی کتاب تو ہے نہیں جس میں واقعات کے تسلسل کا لحاظ کیا جائے بلکہ اس کتاب کا اصل موضوع ہدایت اور انسان سازی ہے لہٰذا اس قسم کی کتاب میں کبھی اس کے موضوع کی اہمیت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کے تسلسل کو وقتی طور پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی بجائے کسی دوسری ضروری بات کو بیان کر دیا جائے، جب وہ بات تمام ہو جائے تو دوبارہ پہلے واقعہ کی طرف پلٹا جائے۔

اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ ہم زیرِ بحث آیت کو قصہ گوسالہ پرستی کا تتمہ جانتے ہوئے یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ اس ماجرے کے بعد دوبارہ بنی اسرائیل کو معذرت خواہی اور توبہ کے لیے کوہِ طور پر لے گئے تھے جیسا کہ بعض مفسرین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، ایسا صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اگر دیگر جہات سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اتنا تو ماننا پڑے گا کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ گئے ، وہ بجلی یا زلزلے کے بعد ہلاک ہو گئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو لوگ حضرت موسیٰ کی نمائندگی میں عذرخواہی کیلئے گئے تھے خدا انہیں معاف کرنے کی بجائے وہیں ہلاک کر دے؟

٭

بہرحال مذکورہ بالا آیات میں پہلے ارشاد ہوتا ہے: "موسیٰ نے ستر آدمیوں کو اپنی قوم میں سے ہماری میعاد کے لیے انتخاب کیا (واختار موسٰی قومہٗ سبعین رجلًا لمیقاتنا)۔

لیکن بنی اسرائیل نے جب خدا کا کلام سنا تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس بات کی خواہش کی کہ وہ اپنے کو دکھلا دے" اس وقت ایک عظیم زلزلہ رونما ہوا جس کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے[1] جب وہ ہوش میں آئے تو انہوں نے عرض کی: خدایا! اگر

---

[1] حضرت موسیٰ صرف اس زلزلہ کی وجہ سے بے ہوش نہیں ہوئے تھے بلکہ اس زلزلے سے پہلے ایک نور بھی ظاہر ہوا تھا جس کی تاب نہ لا

(باقی اگلے صفحہ پر)

تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس سے پیشتر ہلاک کر دیتا، مطلب یہ ہے کہ میں باقی لوگوں کو کیا جواب دوں جن کے نمائندوں پر یہ افتاد آپڑی (فلما اخذتھم الرجفة قال رب لو شئت اھلکتھم من قبل و ایای)۔

اس کے بعد موسیٰ نے کہا: پروردگارا! یہ بے جا درخواست میری قوم میں سے جو نادان تھے ان کی تھی، کیا تو ان کی وجہ سے ہمیں ہلاک کر دے گا؟ (اتھلکنا بما فعل السفھآء منا)۔

چونکہ اس آیت میں یہ ہے کہ میعادگاہ میں زلزلہ آیا تھا۔ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۵۵ (جو رویت پروردگار کے بارے میں نازل ہوئی ہے) میں "صاعقہ" کا کلمہ آیا ہے اس لیے بعض مفسرین نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ میقات کا واقعہ دو مرتبہ رونما ہوا، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر آئے ہیں کہ جب بجلی گرتی ہے تو اس کے ساتھ اکثر زلزلہ بھی آجایا کرتا ہے، کیونکہ جب مثبت اور منفی الیکٹریسٹی آپس میں متصادم ہوتی ہے (مثبت ابر میں اور منفی زمین میں پائی جاتی ہے)، تو اس کی وجہ سے دھماکہ ہوتا ہے، شعلہ نکلتا ہے اور زمین ہل جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ جگہ بھی پاش پاش ہو جاتی ہے جہاں یہ واقعہ رونما ہوتا ہے۔ حضرت صالحؑ کے قصہ میں بھی (سورہ فصلت آیت ۱۷ میں) جب ان کی گناہگار قوم پر عذاب نازل ہوا تھا تو اس میں بھی "صاعقہ" کا ذکر ہے اور کبھی "رجفہ" سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۷۸ میں ہے)۔

نیز بعض مفسرین نے اس جملہ "بما فعل السفھآء منا" (اس عمل کے بدلے میں جو ہمارے نادانوں نے کیا ہے)، کو اس بات کی دلیل سمجھا ہے کہ یہ سزا ان لوگوں کو ان کے عمل کی وجہ سے ملی تھی جیسے گوسالہ پرستی نہ کہ اس وجہ سے کہ انہوں نے خدا کی رویت کی خواہش کی تھی کیونکہ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنے قول سے کیا تھا اور قول کو عمل نہیں کہا جاتا۔

اس بات کا جواب ظاہر ہے کیونکہ انسان کا بات کرنا بھی اس کے افعال میں داخل ہے "سخن" پر "فعل" کا اطلاق کوئی غیر معمولی اور نئی بات نہیں ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ انسان کے تمام افعال کی پاداش دے گا تو یقیناً اس میں ہمارے اقوال بھی داخل ہیں کیونکہ ان پر بھی جزا و سزا دے گا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: اے پروردگار! ہمیں معلوم ہے یہ تیری ایک آزمائش تھی جسے تو چاہے (اور اسے گمراہی کا مستحق سمجھے) گمراہ کر دے اور جسے تو چاہے (اور

(بقیہ حاشیہ): کہ حضرت موسیٰ بیہوش ہو گئے تھے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف۔ ۱۴۳)۔

جب اس کے رب نے پہاڑ کے سامنے اپنی تجلی دکھلائی تو اس پہاڑ کو منہدم کر دیا اور موسیٰ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ (مترجم)

اسے ہدایت کے لائق سمجھے) ہدایت کردے (ان ھی الا فتنتك) ۔
یہاں پر بھی مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہے کہ لفظ "فتنة" سے کیا مراد ہے، لیکن اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ لفظ "فتنة" قرآن مجید میں آزمائش اور امتحان کے معنی میں بہت آیا ہے جیسا کہ سورہ انفال کی آیت ۲۸ میں فرمایا گیا ہے:

اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۔

تمہارے سرمائے اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں ۔

اسی طرح سورہ عنکبوت کی آیت ۲ اور سورہ توبہ کی آیت ۱۲۶ میں بھی ہے لہٰذا اس کا مفہوم بھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنی اسرائیل کی اس واقعہ میں شدید آزمائش ہوئی تھی اور خدا نے ان پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی خواہش (تمنائے رویت) ایک نامناسب اور محال خواہش تھی ۔

اس آیت کے آخر میں حضرت موسیٰ عرض کرتے ہیں: بار الٰہا! صرف تو ہی ہمارا ولی سرپرست ہے، ہمیں بخش دے اور اپنی رحمت ہمارے شامل حال کر دے، تو بہترین بخشنے والا ہے (انت ولینا فاغفر لنا وارحمنا وانت خیر الغافرین) ۔

ان تمام آیتوں اور دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام ہلاک ہونے والوں کو پھر نئے سرے سے زندگی مل گئی اور وہ لوگ حضرت موسیٰ کے ہمراہ ہی بنی اسرائیل کی طرف پلٹ کر آگئے اور انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ان سے بیان کیا اور ان بے خبر لوگوں کی ہدایت میں مشغول ہوگئے ۔

❊

اس کے بعد کی آیت حضرت موسیٰ کی درخواست کے تتمہ کے طور پر ہے جس میں مسئلہ توبہ جس کی طرف سابقہ آیت میں اشارہ ہو چکا ہے، کی تکمیل کی غرض سے حضرت موسیٰ عرض کرتے ہیں:

خداوندا! اس دنیا میں اور آخرت میں ہمارے لیے نیکی مقرر کر دے (واکتب لنا فی ھٰذہ الدنیا حسنة و فی الاخرة)۔

"حسنة" کے معنی ہر طرح کی نیکی، زیبائی اور خوبی کے ہیں۔ اس بنا پر تمام نعمتیں، عمل صالح کی توفیق، بخشا جانا، جنت کا ملنا، اور ہر طرح کی سعادت "حسنة" میں داخل ہے لہٰذا اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ "حسنة" کو کسی ایک فائدے کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے ۔

اس کے بعد اس درخواست کی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں : ہم نے تیری طرف بازگشت کی ہے اور جو کلام ہمارے نادانوں نے کیا تھا اور وہ تیرے مقام کے مناسب نہ تھا اس سے ہم معافی کے خواستگار ہیں (انا ھدنا الیک) ۔

" ھدنا " کا مادہ " ھود " (بروزن " صَوت ") ہے جس کے معنی نرمی اور آہستگی کے ساتھ واپس لوٹنے کے ہیں ۔ اس طرح کہ بعض اہلِ لغت نے اس کے معنی میں کہا ہے کہ خیر سے شر کی طرف اور شر سے خیر کی طرف لوٹنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے[1] ۔ لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ " توبہ " اور خدا کی اطاعت کی طرف پلٹنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

راغب اپنی کتاب " مفردات " میں بعض علماء سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ : قوم یہود کو یہود جو کہا جاتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے ۔ اس نام سے ان کی تعریف ظاہر ہوتی ہے یعنی یہ وہ قوم ہے جس نے خدا کی طرف بازگشت کی تھی ، کثرتِ استعمال سے اس کے اصلی معنی فراموش ہوگئے اور صرف ایک نام کی حیثیت سے یہ لفظ باقی رہ گیا ۔

لیکن اگر بعض علماء کے سابق قول کا لحاظ کیا جائے جس میں کہا گیا ہے کہ شر سے خیر کی طرف یا خیر سے شر کی طرف دونوں طرح کی بازگشت کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس معنی میں یہ لفظ یہودیوں کے لیے کسی خاص تعریف کا حامل نہ ہوگا بلکہ ممکن ہے اس لفظ سے ان کی متلون مزاجی کی حکایت کرنا مقصود ہو اور یہ بتلانا ہو کہ یہ قوم اخلاقی اعتبار سے پائیدار نہیں ہے ۔

دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس قوم کا نام " یہود " جو رکھا گیا ہے اس سے اس کے مادہ " ہَود " کو کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ در اصل یہ لفظ " یہوذا " سے ہے جو حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں سے ایک کا نام ہے ، بعد ازاں " ذال " کو " دال " سے تبدیل کر دیا گیا اور " یہودا " ہوگیا اسی کی طرف قوم " یہودی " منسوب ہے[2] ۔

بہر حال آخرکار اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول فرمائی اور ان کی توبہ قبول ہوئی لیکن کسی قید و شرط کے بغیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ بعض شرطیں تھیں جن کا ذکر آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے ، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

میں اپنا عذاب اور سزا جسے چاہوں گا (اور اسے اس سزا کا مستحق پاؤں گا) پہنچاؤں گا (قال عذابی اصیب بہ من اشآء) ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بارہا بیان کیا ہے کہ ان مواقع پر یہ جو لفظ " مشیت " استعمال کیا جاتا

---

[1] تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۲۲۱ ۔ اس کے مؤلف نے اس بات کو ابن الاعرابی سے نقل کیا ہے ۔

[2] تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۵ صفحہ ۳۰ ۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

ہے، بلکہ دیگر تمام مقامات پر جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے معنی مطلقاً چاہنے کے نہیں ہیں یعنی بغیر قید و شرط کے چاہنا، بلکہ اس سے مراد ایسا چاہنا ہے جو حکمت اور اہلیت کے ساتھ مقید ہے اس طرح اس بارے میں جو اشکال بھی وارد ہو وہ دُور ہو جائے گا۔

اس کے بعد اضافہ فرمایا گیا ہے : لیکن میری رحمت ہر چیز کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے (ورحمتی وسعت کل شیء)۔

خدا کی اس وسیع رحمت سے ممکن ہے دنیادی نعمتوں کی طرف اشارہ مقصود ہو جو تمام مخلوقات کے شامل حال ہیں، نیک و بد مومن و کافر سب ہی ان سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

نیز ممکن ہے اس سے مادّی و معنوی ہر طرح کی نعمتیں مراد ہوں کیونکہ خدا کی معنوی نعمتیں کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے کچھ شرطیں ہیں جن کے بغیر وہ کسی کو نہیں ملتیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ کی رحمت کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہیں۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ ان دروازوں کے اندر داخل ہونا ہے کہ نہیں، اب اگر کوئی اپنے میں وہ شرطیں پیدا نہ کرے جن کی وجہ سے وہ ان دروازوں میں داخل ہو سکے تو یہ خود اس کی کوتاہی ہوگی اس سے اللہ کی رحمت پر کوئی حرف نہ آئے گا (دوسری تفسیر آیہ مذکورہ کے مفہوم سے زیادہ نسبت رکھتی ہے)۔

لیکن اگر کسی کو یہ خیال گزرے کہ اللہ کی رحمت ہر ایک کے لیے ہے اور ہر شخص بلا کسی قید و شرط کے اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے تو اس توہم کو دُور کرنے کے لیے اس آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے : مَیں عنقریب اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جن میں تین صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تقویٰ کو اختیار کرتے ہوں، زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہوں" (فساکتبھا للذین یتقون و یؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بأیاتنا یؤمنون)۔

"تقویٰ" سے ہر قسم کی آلائش اور گندگی سے بچنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"زکوٰۃ" سے اس کے تمام اور ہمہ گیر معنی مراد ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے "لکل شیءٍ زکوٰۃ" ہر چیز کے لیے ایک زکوٰۃ ہوتی ہے، بنا بریں اس کے معنی ہر عمل نیک کے ہوں گے۔

یہ جملہ "والذین ھم بأیاتنا یؤمنون" تمام مذہبی مقدسات و عقائد پر ایمان لانے کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس طرح سے یہ آیت ایک ایسے نظام عمل پر مشتمل ہے جو ہر حیثیت سے کامل و جامع ہے۔

اور اگر "زکوٰۃ" سے اس کے خاص معنی یعنی "زکوٰۃ مال" مراد لیے جائیں تو تمام الٰہی فرائض میں سے صرف اس کا انتخاب کیا جانا اس اہمیت کی وجہ سے ہے جو اسے عدالتِ اجتماعی میں حاصل ہے۔

ایک حدیث شریف میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک دفعہ مشغول نماز تھے کہ ایک اعرابی کو یہ کہتے سنا وہ یہ کہہ رہا تھا :

اللّٰھم ارحمنی و محمدا ولاترحم معنا احدًا۔

یعنی خدایا ! صرف مجھے اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو اپنی رحمت کے دامن میں لے لے اور ہم دونوں کے علاوہ کسی اور کو اپنی رحمت میں داخل نہ کرنا۔

جب حضرت رسول اللہؐ نے نماز ختم کی اور سلام پڑھا تو اس شخص کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا :

"لقد تحجرت واسعا"

یعنی تُو نے ایک لامحدود شے کو محدود کردیا اور اسے ایک اختصاصی پہلو دے دیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خداوند کریم کی رحمت لامحدود و بے پایاں ہے اسے کسی عالم میں بھی میرے اور تیرے درمیان محدود نہیں کیا جاسکتا [1]

(١٥٧) اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۤئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِىْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰۤئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۠

ترجمہ

(١٥٧) جو لوگ (خدا کے اس) فرستادہ نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کی صفات وہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اپنے پاس توریت و انجیل میں پاتے ہیں اور یہ نبی انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے ، پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے ، ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے ، پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی ، اور اس نور کی پیروی کی جو اس پر نازل ہوا ہے ، وہ کامیاب ہیں ۔

تفسیر

ایسے پیمبر کی پیروی کرو

موجودہ آیت در اصل اس گذشتہ آیت کی تفصیل وتکمیل ہے جس میں ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جنہیں اللہ کی وسیع رحمت میسر ہے ، یعنی تقوے ، ادائے زکوٰۃ اور آیاتِ الٰہی پر ایمان ، ان صفات سہ گانہ کو ذکر کرنے کے بعد ، اس آیت میں توضیح کے طور پر کچھ مزید صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ پیغمبرِ اسلامؐ کی پیروی کرنا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا ، پیغمبر پر ایمان لانے اور اور ان کی پیروی کرنے سے جدا نہیں ہے ، اسی طرح تقویٰ اور زکوٰۃ بھی رسول اللہؐ کی پیروی اور رہبری کے بغیر مکمل نہیں ہے ۔

اس لیے فرمایا گیا ہے : وہ لوگ اس رحمتِ الٰہی میں داخل ہیں جو پروردگارِ عالم کے اس فرستادہ رسول کی پیروی کریں (الذین یتبعون الرسول) ۔

اس کے بعد اس رسول کے متعلق خداوند کریم رسالت کے علاوہ چھ صفتیں بیان فرماتا ہے :

۱۔ وہ اللہ کا پیغمبر ہے (النبی) ۔

نبی اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام بیان کرے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے چاہے اسے دعوت الی الحق اور تبلیغ کا حکم نہ دیا جائے ۔ لیکن رسول وہ شخص ہے جسے مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے ساتھ ، دعوت الی الحق اور آئینِ الٰہی کی تبلیغ کرنے اور اس راہ میں قیام کرنے کا حکم بھی ملا ہو ۔

درحقیقت رسالت کا درجہ نبوّت سے بالاتر ہے اس بنا پر رسالت میں نبوت کا درجہ بھی شامل ہے ، لیکن چونکہ آیہ مذکورہ مقامِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریح و توضیح کرنا چاہتی ہے لہٰذا اس نے ان دونوں کا مستقلاً ذکر کیا ہے ۔ واقع میں جو معنی لفظ " رسول " میں پوشیدہ ہیں اسے مستقل اور

واضح طور پر اس کی تحلیل کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ ایسا پیغمبر جس نے کسی سے درس نہیں پڑھا اور وہ عام لوگوں میں سے مبعوث ہوا، اس نے سرزمین مکہ ام القریٰ سے توحیدِ الٰہی کا حقیقی آفتاب بن کر طلوع کیا ہے (الامی)۔

لفظ "اُمی" (جو یا تو مادہ "ام" جس کے معنی ماں کے ہیں، یا مادہ "امت" جس کے معنی مجمع اور گروہ کے ہیں، سے ماخوذ ہوا ہے) کے بارے میں مفسرین میں بحث ہے۔ کچھ لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اُمی وہ شخص ہے جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو یعنی جس حالت میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی طرح باقی رہا ہو کسی استاد کے مدرسہ میں داخل نہ ہوا ہو۔

بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اُمی وہ ہے جو عام افراد کے گروہ سے نکلا ہو۔ اشراف عیاش اور جبار طبقہ سے نہ نکلا ہو۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ لفظ "اُمی" "مکی" کے مترادف ہے یعنی ام القریٰ (مکہ) کا رہنے والا کیونکہ مکہ کا ایک نام "ام القریٰ" بھی ہے۔

اسلامی روایات جو مختلف ماخذوں سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں بھی "اُمی" بمعنی "ان پڑھ" نہیں ہے بلکہ ان میں سے بعض روایات میں "اُمی" کی تفسیر "مکی" سے کی گئی ہے [1]

لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ لفظ "اُمی" سے تینوں مفہوموں کی طرف اشارہ مقصود ہو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ ایک لفظ کا استعمال چند معنی میں جائز ہے ادبیاتِ عرب میں اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں (پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمی ہونے کے معنی پر اس آیت کی تفسیر کے بعد تفصیلی طور سے روشنی ڈالی جائے گی انشاءاللہ)۔

۳۔ "نیز یہ ایسا پیغمبر ہے جس کی صفات، علامتیں اور اس کی حقانیت کی نشانیاں گذشتہ آسمانی کتابوں (توریت و انجیل وغیرہ) میں لوگ پاتے ہیں" (الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل)۔

اس آیت کی تفسیر مکمل ہونے کے بعد ہم اس بارے میں بھی مفصل طور پر بحث کریں گے کہ کتب عہدین (توریت و انجیل) میں حتیٰ کہ موجودہ تحریف شدہ کتب میں کہاں کہاں ہمارے نبی کی حقانیت کی مختلف بشارتیں اور پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔

۴۔ وہ ایسا پیغمبر ہے جس کی دعوت کا مفہوم عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ وہ ان نیکیوں کی طرف جن کی عقل گواہی دیتی ہے لوگوں کو دعوت دیتا ہے، اور تمام بُرے کاموں سے جن سے عقل منع کرتی

---

[1] مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص۸۲، ص۷۹، اور تفسیر روح المعانی جلد ۹ ص۸۰ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ہے روکتا ہے (یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر)۔

۵۔ اس کی دعوت کا مفہوم فطرتِ سلیم سے بھی ہم آہنگ ہے چنانچہ وہ تمام پاک و پاکیزہ چیزوں کو جن کو طبعِ سلیم پسند کرتی ہے لوگوں کے لیے پسند کرتا ہے اور وہ ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے اور جو چیز خبیث اور قابلِ نفرت ہے اسے لوگوں پر حرام قرار دیتا ہے (ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبآئث)۔

۶۔ وہ ان جھوٹے نبیوں کی طرح نہیں ہے جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ سادہ لوح افراد کو پھانسیں اور ان سے ناجائز فوائد حاصل کریں، یہ نبی صرف اتنا ہی نہیں کہ ان کے کندھے پر کسی قسم کا بار نہیں رکھتا بلکہ ان کے دوش سے بھاری بوجھ اتارتا ہے اور ان تمام طوق و سلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے جنھوں نے بشریت کے ہاتھوں اور پیروں کو (جاہلانہ عقائد و رسوم کی زنجیروں سے) جکڑ دیا تھا (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم)[1]

چونکہ یہ چھ صفات مقامِ رسالت کو ملانے کے بعد سات صفتیں بنتی ہیں، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دعوے کی روشن دلیلیں ہیں اس لیے اضافہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کے درجہ کو بلند سمجھیں اور تبلیغ رسالت میں اس کی مدد کریں اور اس آشکار نور (یعنی قرآن مجید) کی پیروی کریں جو اس پر نازل ہوا ہے بلاشبہ ایسے افراد کامیاب ہیں (فالذین اٰمنوا بہٖ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذیٓ انزل معہٗٓ اولٓئک ھم المفلحون)۔

"عزّروہ" مادّہ "تعزیر" سے ہے جس کے معنی اس طرح کی حمایت و مدد کرنے کے ہیں جس میں احترام کی آمیزش بھی ہو، بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے منع کرنے اور روکنے کے ہیں، اگر دشمن سے بچایا اور روکا جائے تو اس کا مفہوم مدد کرنے کا ہوگا اور اگر یہ منع کرنا گناہ سے ہو تو اس کے معنی سزا اور تنبیہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہلکی سزاؤں کو "تعزیر" کہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "انزل الیہ" کے بجائے کلمۂ "انزل معہ" (اس کے ساتھ نازل ہوا) آیا ہے جبکہ ہمیں پتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آسمان سے نازل نہیں ہوتے تھے، لیکن چونکہ آپ کی نبوّت و رسالت قرآن کے ساتھ خدا کی جانب سے نازل ہوئی ہے لہٰذا لفظ "معہ" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔[2]

---

[1] "اصر" کے معنی لغت میں نگہداشت کرنے اور محبوس کرنے کے ہیں اس بنا پر اس سنگین کام کو جو انسان کو دوسرے کاموں سے روک دے "اصر" کہتے ہیں اگر عہد و پیمان یا کیفر و سزا کو بھی "اصر" کہتے ہیں تو وہ ان محدودیتوں کی بنا پر ہے جو یہ چیزیں انسان کیلئے پیدا کرتی ہے۔

[2] تفسیر برہان میں علی بن ابراہیم قمی سے منقول ہے کہ "النور الذی انزل معہ" سے مراد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہیں نیز اس کی
(باقی اگلے صفحہ پر)

چند قابلِ توجّہ امور

۱۔ آنحضرتؐ کی نبوّت پر ایک آیت میں پانچ دلیلیں : قرآنِ کریم کی کسی آیت میں آنحضرتؐ کی حقانیت پر اتنی دلیلیں اکٹھا نہیں ملیں گی جتنی اس آیت میں موجود ہیں۔

اگر ہم پیغمبر آخرالزمانؐ کی ان سات صفتوں پر غور کریں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں تو ہمیں آنحضرتؐ کی حقانیت کی پانچ روشن دلیلیں ملیں گی۔

اوّل : یہ کہ وہ "اُمّی" تھے یعنی انہوں نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا، اس کے باوجود انہوں نے ایسی کتاب پیش کی جس نے نہ صرف اہلِ حجاز کی قسمت بدل دی بلکہ وہ تاریخِ بشریّت میں سب کی توجہ کا مرکز بنی۔ حتّیٰ کہ وہ لوگ جو آپ کی نبوّت کے قائل نہیں ہیں انہیں بھی اس کتاب کی عظمت اور اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری میں کوئی شک نہیں ہے۔

ایک ایسا انسان جس نے نہ تو کسی سے درس پڑھا، نہ وہ مدرسہ گیا، بلکہ اس نے ایک انتہائی جاہلانہ ماحول اور بربریت کی فضا میں پرورش پائی، کیا بر بنائے عادت و معمول یہ ممکن ہے کہ ایسا شخص اتنا بڑا کام انجام دے ؟!

دوم : یہ کہ اس کی نبوّت کی دلیلیں مختلف الفاظ میں گذشتہ آسمانی کتابوں میں پائی جاتی ہیں جس سے ایک حق طلب انسان کو اس کی حقانیت کا پتہ ملتا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے، یہ ایسی بشارتیں ہیں جو صرف اس کی ذات اور اس کے صفات پر منطبق ہوتی ہیں۔

سوم : یہ کہ اس کی دعوت کے جو اصول ہیں وہ عقل و دانش کے مطابق ہیں، کیونکہ اچھائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا عقل کے مطابق ہے یہی اس کی دعوت کا مقصد ہے جو اس کی تعلیمات سے حاصل ہوتا ہے۔

چہارم : یہ کہ اس کی دعوت کے اصول طبعِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔

پنجم : یہ کہ اگر آپؐ اللہ کے فرستادہ نہ ہوتے تو یہ بات حتمی ہے کہ آپؐ اتنے بڑے کام کے پردہ میں اپنے ذاتی منافع کو پیشِ نظر رکھتے، اور اگر ایسا ہوتا تو آپؐ نہ صرف لوگوں کو ان کے قید و بند سے آزاد نہ کرواتے بلکہ انہیں اسی عالمِ غفلت و بے خبری میں پڑا رہنے دیتے، اس طرح سے آپؐ ان سے زیادہ ناجائز فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے بشریت کے

بقیہ حاشیہ : تائید حدیث "انا و علی من نور واحد" سے بھی ہوتی ہے۔ (مترجم)

ہاتھ پاؤں سے بھاری زنجیروں کو الگ کر دیا ہے:

جن زنجیروں کو آپؐ نے کاٹا ان میں سے بعض یہ ہیں:

جہل و نادانی کی زنجیریں، جنہیں آپؐ نے اس طرح کاٹا کہ لوگوں کو علم و دانش کی طرف مسلسل اور ہمہ گیر دعوت دی۔

بت پرستی اور خرافات پرستی کی زنجیریں: جنہیں آپؐ نے دعوتِ توحید کے ذریعے کاٹا۔

قبائلی تعصب کی زنجیریں: جنہیں آپؐ نے یوں ختم کیا کہ انہیں اخوتِ اسلامی کی تعلیم دی۔

دنیاوی لحاظ سے پستی و بلندی کی زنجیریں: جنہیں آپؐ نے مساوات کی تعلیم کے ذریعے کاٹ دیا۔

اس کے علاوہ دیگر طرح طرح کی زنجیریں جن کو آپؐ نے بیک قلم قلم کر دیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود آپؐ کی حقانیت کی زبردست دلیل ہے۔

۲۔ پیغمبرؐ کے "اُمّی" ہونے کا کیا مطلب ہے؟ : لفظ "اُمّی" کے مفہوم کے بارے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے عام طور پر تین احتمال بیان کیے جاتے ہیں:

اوّل۔ اس کے معنی "اَن پڑھ" کے ہیں۔

دوم۔ "اُمّی" وہ ہے جو "اُم القریٰ" یعنی سرزمینِ مکہ میں پیدا ہوا اور وہاں اس کی پرورش ہوئی ہو۔

سوم۔ وہ شخص جو عوام الناس میں سے اٹھا ہو، لیکن سب سے زیادہ مشہور پہلی تفسیر ہے جو اس کلمہ کے مواردِ استعمال سے بھی زیادہ تعلق رکھتی ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ممکن ہے کہ تینوں معنی مراد لیے گئے ہوں۔

یہ بات کہ آنحضرتؐ نے نہ تو کسی معلم سے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی آپؐ کسی مدرسہ میں گئے، اس میں مؤرخین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، قرآن کریم میں بھی سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸ میں پیغمبرؐ کی قبل بعثت حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۔

یعنی تم اس (اعلانِ رسالت) سے قبل نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے جس کی وجہ سے دشمنوں کو یہ موقع ملے کہ وہ تمہاری رسالت میں شک و شبہ ڈال سکیں۔

سرزمینِ حجاز میں عام طور پر پڑھے لکھے لوگ اس قدر کم تھے کہ وہ تمام سرزمین میں گنتی کے ہونے کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے تھے، یہاں تک کہ سرزمینِ مکہ جو حجاز کا مرکز سمجھی جاتی تھی اس

میں پڑھے لکھے مردوں کی تعداد کُل ۱۷ عدد تھی اور عورتوں میں سے صرف ایک عورت لکھنا پڑھنا جانتی تھی ؎۱

یہ بات واضح اور مسلّم ہے کہ ان چند محدود افراد میں سے کسی ایک سے بھی اگر پیغمبر پڑھنا لکھنا سیکھتے تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہتی بلکہ سب کے زبان زد ہو جاتی۔

اگر ہم آپؐ کی نبوت کو تسلیم نہ بھی کریں، تب بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ آپؐ نے مکہ کے محدود افراد میں سے کسی سے پڑھا ہو اور اس کے بعد آپؐ نے اس سے انکار کر دیا ہو۔ اگر آپؐ نے پڑھا ہوتا تو اہلِ مکہ میں سے کوئی تو کہتا کہ اے محمد! تم غلط کہتے ہو کہ تم نے کسی سے نہیں پڑھا، تم نے تو فلاں شخص سے تعلیم حاصل کی ہے۔

بہر حال پیغمبرؐ کی یہ صفت (اَن پڑھ ہونا) آپؐ کی نبوّت کی بنیاد کو مستحکم کرتی ہے تاکہ آپؐ کو ذاتِ خداوندی اور دنیائے ماوراء الطبیعت سے جو تعلق حاصل ہے اس کا لوگوں کو یقین حاصل ہو اور اس سلسلہ میں آپؐ جو دعوت دیں اسے لوگ قبول کرلیں۔

آپؐ کا یہ حال قبل از بعثت کا تھا، بعثت کے بعد بھی کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ آپؐ نے اپنے اعلانِ نبوّت کے بعد کسی سے تعلیم حاصل کی ہو، بنا بریں آپؐ اپنی اسی سابقہ اُمّی حالت میں آخر عمر تک باقی رہے۔

لیکن ایک بڑی غلط فہمی جو یہاں پر پیدا ہوتی ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے یہ ہے کہ درس نہ پڑھنا الگ چیز ہے اور جاہل ہونے کا الگ مفہوم ہے۔ لہٰذا اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیئے کہ آپؐ معاذ اللہ کوئی جاہل شخص تھے۔ اس لیے جن لوگوں نے "اُمّی" کی یہ تفسیر کی ہے کہ آپؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے گویا ان کی توجہ اس نکتے کی طرف نہیں ہے۔

اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم الٰہی تعلیم کے ذریعے سے پڑھنا یا پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے بغیر اس کے کہ آپؐ نے کسی بشر سے ان امور کو سیکھا ہو کیونکہ اس صفت کا بلاشبہ کمالاتِ انسانی میں شمار ہوتا ہے اور اس سے مقامِ نبوّت کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس مطلب کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم سے مروی ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا آپؐ میں اس کی صلاحیت موجود تھی ؎۲

لیکن اس لیے کہ آپؐ کی نبوّت میں کسی کو چھوٹے سے چھوٹا شبہ بھی نہ ہونے پائے آپؐ اپنی

؎۱ فتوح البلدان بلاذری ط مصر ص ۴۵۹۔

؎۲ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۳۲ سورۂ جمعہ کی ابتدائی آیات کے ذیل میں۔

اس صفت سے کام نہیں لیتے تھے۔

اس مقام پر یہ جو کہا گیا ہے کہ لکھنے اور پڑھنے کی قوت بذاتِ خود کوئی کمال نہیں ہے بلکہ یہ دونوں علم حقیقی اور کمالات تک پہنچنے کی سیڑھی ہیں، یہ خود حقیقی علم نہیں ہیں، اس بات کا جواب خود اس میں پوشیدہ ہے کیونکہ کسی کمال کے وسیلے سے آگاہی بذاتِ خود ایک کمال شمار ہوتی ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آئمہ طاہرینؑ کی بعض روایات میں "اُمّی" کے ان معنی (ان پڑھ) کی صریحی طور سے نفی کی گئی ہے، بلکہ اس کے معنی "مکی" بیان کیے گئے ہیں؟ اور "اُمّی" کو ام القریٰ سے لیا گیا ہے[1]

اس کے جواب میں ہم کہیں گے اس مفہوم کی دو روایتیں ہیں جن میں سے ایک روایت وہ ہے جسے اصطلاح میں "مرفوعہ" کہا جاتا ہے لہٰذا وہ سند کے لحاظ سے بے وقعت ہے۔ دوسری روایت میں ایک راوی بنام "جعفر بن محمد صوفی" ہے جو علمِ رجال کی رُو سے مجہول شخص ہے۔

اب رہا یہ امر کہ بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ سورۂ جمعہ میں خدا فرماتا ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

نیز اسی مطلب کی دیگر آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ پیغمبرؐ قرآن کو دیکھ کر لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے، یہ غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ لفظ "تلاوت" دیکھ کر پڑھنے کو بھی کہتے ہیں اور حافظہ سے پڑھنے کو بھی کہتے ہیں، جو لوگ قرآن کی آیات، یا اشعار یا دعائیں اپنی یادداشت سے پڑھتے ہیں اس پر بھی تلاوت کا اطلاق بکثرت ہوا ہے۔

بہر حال جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے حسبِ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ پیغمبرؐ نے یقیناً کسی شخص سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا اور نہ وہ سوائے خدا کی ذات کے کسی کے شاگرد تھے۔

۲۔ کوئی معتبر دلیل اس بات کی موجود نہیں ہے کہ آپؐ نے اپنی نبوت کے اعلان سے پہلے یا اس کے بعد "عملی طور پر" کبھی کچھ پڑھا یا لکھا ہو۔

۳۔ یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ آپؐ پروردگارِ عالم کی تعلیم کی بنا پر لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھے۔

کتب عہدین میں پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور کی بشارتیں

اگرچہ اس بات کے یقینی قرائن موجود ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابیں (توریت و انجیل) وہ اصل کتابیں نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر آسمان سے نازل ہوئی تھیں، بلکہ انسان کا دستِ تحریف ان کی طرف دراز ہوا ہے ان کتابوں میں سے کچھ حصہ بالکل ضائع ہو گیا ہے اور اس

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ صفحہ ۳۳۲ و تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

وقت جو لوگوں کے پاس موجود ہے وہ ایک مخلوط و مرکب کتاب ہے جس میں کچھ ایسے افکار ہیں جو ذہن انسانی کی پیداوار ہیں اور کچھ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی وہ تعلیمات ہیں جو ان دو نبیوں پر نازل ہوئی تھیں اور ان کے شاگردوں کے پاس موجود تھیں[1]

اس بنا پر اگر موجودہ کتب میں آنحضرتؐ کی پیشین گوئی کے متعلق کوئی صریح جملہ نہ ملے تو اس میں کوئی جائے تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن اس کے باوجود انہی تحریف شدہ کتابوں میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں جن سے اس پیغمبر عالیمقامؐ کے ظہور کا کھلا اشارہ ملتا ہے۔ ان عبارتوں کو ہمارے بعض علماء نے اپنی کتابوں یا مقالوں میں جو اس موضوع پر تحریر کیے ہیں، اکٹھا کیا ہے۔ چونکہ ان سب کا تذکرہ طول کا باعث ہے اس لیے نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض کا ہم یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں:

۱۔ توریت سفر تکوین فصل ۱۷، نمبر ۱۷ تا ۲۰ میں ہے:

اور ابراہیم نے خدا سے کہا کاش اسماعیل تیرے حضور میں زندہ رہے (خدا نے جواب دیا) اے ابراہیم! ہم نے اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا سن لی۔ ہم نے اسے برکت دی اور اسے بہت زیادہ پھولنے پھلنے والا قرار دیا چنانچہ اس کی نسل سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور انہیں ہم بہت بڑی امت قرار دیں گے۔

۲۔ سفر پیدائش باب ۴۹ نمبر ۱۰ میں ہے:

عصای سلطنت یہودا سے اور ایک فرمان روا اس کے پیروں کے آگے سے قیام کریگا تا اینکہ "شیلوہ" آجائے کہ اس پر تمام امتیں اکٹھا ہو جائیں گی۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ "شیلوہ" کے ایک معنی "رسول" یا "رسول اللہ" کے ہیں جیسا کہ مسٹر ہاکس نے اپنی کتاب "قاموس مقدس" میں تصریح کی ہے۔

۳۔ انجیل یوحنا باب ۱۴ نمبر ۱۵ و ۱۶ میں ہے:

اگر تم مجھے دوست رکھتے ہو تو میرے احکام کو محفوظ رکھنا اور میں باپ سے سوال کروں گا تو وہ ایک دوسرا تسلی دینے والا تم کو عطا کر دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہیگا۔

۴۔ انجیل یوحنا باب ۱۴ نمبر ۲۶ میں ہے:

وہ تسلی دینے والا آئے گا کہ جسے میں اپنے باپ کی طرف سے بھجواؤں گا یعنی وہ ایک صحیح روح کہ جو باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں گواہی دے گی۔

۵۔ نیز اسی انجیل یوحنا باب ۱۶ نمبر ۷ میں ہے:

---

[1] مزید آگاہی کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "رہبر سعادت یا دین محمدؐ" اور کتاب "قرآن و آخرین پیامبر"۔

لیکن مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ مَیں چلا جاؤں کیونکہ اگر مَیں نہ جاؤں گا تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر مَیں چلا جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھجوا دوں گا ... لیکن جب "وہ" یعنی راستی کا روح رواں آجائے گا تو وہ تم کو راستی (صراطِ مستقیم) کی طرف ہدایت کرے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہے گا بلکہ جو (خدا سے) سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ ہونے والے واقعات کی خبر دے گا۔[1]

یہاں پر جس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فارسی انجیلوں میں مذکورہ بالا جملوں میں جو انجیل یوحنا سے لیے گئے ہیں کلمہ "تسلی دہندہ" آیا ہے لیکن عربی انجیل مطبوعہ لندن (مطبعہ ولیم وٹیس ـ سال ۱۸۵۷ء) میں اس کے بجائے فارقلیط کا لفظ مذکور ہے۔

(۱۵۸) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاِۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۸) کہہ دو: اے لوگو! مَیں تم سب کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں، وہ اللہ جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کی حکومت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جلاتا اور مارتا ہے، پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جس نے کسی کے آگے درس نہیں پڑھا ہے وہ اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پا جاؤ۔

---

[1] یہ تمام عبارتیں جو اوپر کتب عہد قدیم و جدید سے نقل کی گئیں یہ اس فارسی ترجمہ سے لی گئی ہیں جو ۱۸۷۸ عیسوی میں لندن میں مشہور عیسائی علماء کے ذریعہ عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی عالمگیر دعوت

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

کچھ یہودی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کی، اے محمدؐ! کیا تمہی وہ شخص ہو جس نے یہ خیال کیا ہے کہ وہ اللہ کا فرستادہ ہے اور حضرت موسیٰؑ کی طرح تم پر وحی نازل ہوتی ہے؟!

حضرت رسول اللہؐ نے تھوڑا سکوت کیا اس کے بعد فرمایا: ہاں میں ہوں سید اولادِ آدم، لیکن اس پر فخر نہیں کرتا، میں ہی خاتم الانبیاء، امام اتقیاء اور رسولِ پروردگار عالم ہوں۔ انہوں نے پوچھا: تم کس کی طرف بھیجے گئے ہو؟ عرب کی طرف یا عجم کی طرف یا ہماری طرف؟!

ان کے اس سوال کے جواب میں یہ آیہ (مذکورہ بالا) نازل ہوئی جس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آپ کی رسالت تمام جہانوں کے لیے ہے[1]

لیکن اس کے باوجود اس آیت کا ربط گذشتہ آیت سے قابلِ انکار نہیں ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں بھی صفاتِ پیغمبرؐ کا تذکرہ کیا گیا تھا اور اس آیت میں بھی صفاتِ پیغمبرؐ کا ذکر ہے۔

ابتدا میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے: "کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں" (قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا)۔

یہ آیت بھی دیگر بہت سی قرآنی آیات کی طرح اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی رسالت عالمی اور جہانی تھی۔

اسی طرح سورہ سبا کی ۲۸ ویں آیت میں ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ"

ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کی طرف۔

اور سورہ انعام کی ۱۹ ویں آیت میں ہے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔

اس قرآن کی وحی میری طرف اس لیے ہوتی ہے کہ تمہیں اس کے ذریعے ڈراؤں اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن تک اس (قرآن) کی آواز پہنچے۔

---

[1] تفسیر صافی، آیت مذکورہ بالا کے ذیل میں، کتاب مجالس کے حوالے سے۔

اور سورہ فرقان کے شروع میں ہے :

"تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا"

پائندہ و برقرار ہے[1] وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل کیا تاکہ تمام جہانوں کے رہنے والوں کو (ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کے بارے میں) ڈرائے۔

یہ آیتیں نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ کی رسالت جہانی تھی، نیز اس کے بارے میں انشاء اللہ ہم سورۂ شوریٰ کی آیت ۷ کے ذیل میں مزید بحث کریں گے نیز سورۂ انعام کی آیت ۹۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر کافی بحث کر آئے ہیں[2]

اس کے بعد جس خدا کی طرف پیغمبرؐ نے دعوت دی اس کی تین صفتیں بیان ہوتی ہیں :

وہ خدا جس کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمینوں کی حکومت ہے (الذی له ملك السموات والارض)۔

وہ خدا جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ایسا موجود نہیں ہے جو پرستش کے لیے سزاوار ہو (لآ اله الا هو)۔

ایسا خدا جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اور زندگی اور موت کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے (یحیی و یمیت)۔

اس طرح سے یہ آیت ہر اس الوہیت کی نفی کرتی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کی خالق نہ ہو۔ اسی طرح ہر قسم کی بت پرستی، تثلیث مسیحیت کی بھی نفی کرتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی مظہر ہے کہ وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ سارے جہانوں کے لیے کوئی رسول بھیجے اور وہ روزِ قیامت برپا کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔

آخر میں تمام اہلِ جہان کو دعوت دی گئی ہے کہ : ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے اس رسول پر جس نے کسی سے درس نہیں پڑھا اور وہ عام لوگوں کے گروہ میں سے مبعوث ہوا ہے (فآمنوا باللّٰه ورسوله النبی الامی)۔

"ایک ایسا پیغمبر جو صرف دوسرے لوگوں کو ہی ان حقائق کی دعوت نہیں دیتا بلکہ پہلے وہ اپنی بات پر یعنی خدا اور اس کے فرمانوں پر ایمان رکھتا ہے" (الذی یؤمن باللّٰه وکلماته)۔

وہ صرف ان آیات کو قبول نہیں کرتا کہ جو اس کے اوپر نازل ہوئی ہیں بلکہ وہ تمام پچھے گذشتہ نبیوں کو بھی مانتا ہے۔

---

[1] برکتوں والا ہے۔ (مترجم)

[2] تفسیر نمونہ جلد ۵۔

اس کا اپنے آئین پر ایمان لانا اس کے اعمال و کردار سے صاف آشکار ہے جو اس کی حقانیت پر ایک روشن دلیل ہے کیونکہ کسی کہنے والے کا عمل کافی حد تک اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اپنی بات پر خود کتنا ایمان رکھتا ہے۔ اپنی بات پر ایمان رکھنا اس کی صداقت کی دلیلوں میں سے ایک ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ اپنے احکام کی کتنی لاج رکھتے تھے اور آپؐ کو اپنی گفتار پر کس قدر یقین و ایمان تھا۔

ہاں۔ ایسے پیغمبر کی پیروی کرو، تاکہ ہدایت کا نور تمہارے دلوں میں چمک اٹھے اور تم سعادت کے راستے پر چل پڑو" (واتبعوہ لعلکم تھتدون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تنہا ایمان کافی نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت مفید ہے جب عملی پیروی کے ساتھ ساتھ ہو۔ اسی صورت میں یہ ایمان مکمل ہوگا۔

جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ آیت مذکورہ بالا مکہّ میں اس وقت نازل ہوئی جب پیروانِ اسلام نہایت اقلیت میں تھے ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ شاید پیغمبرِ اسلامؐ ایک آنے والے وقت میں مکہّ پر مسلط ہو سکتے ہیں چہ جائیکہ جزیرۃ العرب یا دنیا کا ایک اہم حصہ ان کے زیرِ اقتدار آسکتا ہے۔

لہٰذا جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے پہلے تو صرف مکہّ والوں کے لیے اپنی رسالت کا دعویٰ کیا تھا، پھر جب ان کے مشن نے قوت پکڑی اور لوگ زیادہ سے زیادہ دینِ اسلام اختیار کرنے لگے تو انہیں پورے حجاز پر قبضہ کرنے کی فکر ہوئی پھر اس کے بعد دیگر ممالک کو فتح کرنے کا خیال آیا اور دنیا کے مختلف بادشاہوں کو خط لکھے جانے لگے اور تب انہوں نے اپنے آئین کے عالمی ہونے کا اعلان کیا، ان تمام باتوں کا جواب آیۂ مذکورہ بالا دے رہی ہے جو مکہّ میں نازل ہوئی ہے یہ آیت صاف اعلان کر رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی رسالت کے آغاز ہی میں اس کے جہانی اور عالمی ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

۞

(۱۵۹) وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

(۱۶۰) وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

مَشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۚ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۹) اور قوم موسیٰ میں سے ایک گروہ حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اور اسی حق کے ساتھ عدالت کرتا ہے۔

(۱۶۰) اور ہم نے انہیں بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا جس میں سے ہر ایک گروہ (بنی اسرائیل کے خاندانوں کی) ایک شاخ تھا اور جس وقت موسیٰ نے اپنی قوم (جو بیابان میں تشنہ کام تھی) کے لیے پانی مانگا تو ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، ناگہاں اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اس طرح کہ ہر گروہ اپنے چشمہ کو پہچانتا تھا اور ہم نے بادل کو ان کے اوپر سایہ فگن کیا، اور ہم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو پاکیزہ روزی تمہیں عطا کی ہے اس میں سے کھاؤ (اور اللہ کا شکر بجا لاؤ، لیکن انہوں نے شکر کی بجائے ہماری نافرمانی اور ظلم کیا) لیکن انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی جانوں پر ستم ڈھایا۔

تفسیر

بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتوں کی ایک جھلک

ان آیات میں ایک مرتبہ پھر بنی اسرائیل اور ان کی سرگزشت کا ذکر ہوا ہے۔
پہلی آیت میں ایک ایسی واقعیت کی طرف اشارہ ہے جس کی شبیہ اور مثل ہم قرآن میں دیکھ

چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی واقعیت ہے جو قرآن کریم کی روح حق طلبی کی حکایت کرتی ہے یعنی نیک کردار اقلیتوں کا پاس و لحاظ یعنی : ایسا نہ تھا کہ بنی اسرائیل تمام کے تمام فاسد و مفسد تھے جس کے نتیجے میں یہ قوم ایک سرکش و گمراہ قوم کی حیثیت سے پہچانی جائے، بلکہ ان کی فتنہ انگیز اکثریت کے مقابلے میں ان کی ایک ایسی اقلیت بھی تھی جو صالح تھی اور وہ اکثریت کے مذاق کے برخلاف تھی۔ قرآن اس صالح اقلیت کے لیے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے، وہ کہتا ہے : اور قوم موسیٰ میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کی طرف دعوت دیتا ہے اور حق و عدالت کے ساتھ حاکم ہے (ومن قوم موسیٰ امة یھدون بالحق وبه یعدلون)۔

ممکن ہے اس آیت کے ذریعے ان تھوڑے سے افراد کی طرف اشارہ مقصود ہو جنہوں نے سامری کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا بلکہ وہ ہر حال میں حضرت موسیٰؑ کے پیغام کے حامی و طرفدار تھے، یا اس سے وہ صالح گروہ مراد ہو جو حضرت موسیٰؑ کے بعد بر سرِ عمل آیا۔

لیکن یہ معنیٰ آیت کے ظاہر سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ "یھدون" اور "یعدلون" فعل مضارع کے صیغے ہیں جو کم از کم زمانۂ حال یعنی زمان نزولِ قرآن کی حکایت کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا گروہ اس وقت بھی موجود تھا، الّا یہ کہ یہاں پر ایک لفظ "کان" کو مقدر مانا جائے تاکہ اس آیت کا مطلب حال کے بدلے ماضی میں ہو جائے مگر ہمیں معلوم ہے کہ بغیر کسی قرینہ کے کسی لفظ کو عبارت میں مقدر کرنا خلافِ ظاہر ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس قوم سے مراد زمانۂ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے وہ انصاف پسند یہودی ہوں جنہوں نے آنحضرتؐ کی دعوت پر توجہ دی اور بعد میں وہ آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے گئے، یہ تفسیر اس آیت کے الفاظ کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ بعض شیعہ اور سُنّی روایات میں جو آیا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ چھوٹا سا گروہ ہے جو ماوراء چین میں زندگی بسر کرتا ہے، یہ لوگ عادلانہ، تقویٰ اور خدا شناسی اور خدا پرستی کی زندگی بسر کرتے ہیں، یہ تفسیر علاوہ اس کے کہ ہمارے اس علم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو ہمیں دنیا کے متعلق حاصل ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے، مذکورہ احادیث سند کی رُو سے بھی معتبر نہیں ہیں اس لیے ایسی روایات کا سہارا نہیں لیا جا سکتا۔

٭

اس کے بعد کی آیت میں ان چند نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں : پہلے ارشاد ہوتا ہے : ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گروہوں میں تقسیم کیا (وقطعناھم اثنتی عشرة اسباطاً امماً)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک قوم کی تقسیم بندی انتظامی طور پر کی جائے جس کا ہر حصہ یا ہر گروہ ایک لائق رہبر کے زیر انتظام بھی ہو تو اس قوم کی نگہداشت و تربیت زیادہ آسان ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان عدالت و انصاف کرنا بھی سہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے تمام ممالک اس کوشش میں مصروف ہیں کہ اس قاعدہ کی پیروی کریں۔

کلمہ "اسباط" جمع ہے "سبط" (بروزن "ثبت" اسی طرح بر وزن "سفت") کی جس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو بآسانی وسعت دینا۔ بعد ازاں اس لفظ کو اولادِ انسانی کی ایک خاص قسم یعنی نواسہ کو کہا جانے لگا۔ نیز خاندان کے دوسرے شعبوں کو بھی سبط یا اسباط کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کو ملنے والی دوسری نعمت یہ تھی کہ وہ جس وقت اس تپتے ریگستان میں بیت المقدس کی طرف سفر کر رہے تھے اور انہیں خطرناک اور جان لیوا تشنگی نے آلیا اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے پانی طلب کیا تو "ہم نے موسیٰ کی طرف یہ وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ انہوں نے جب یہ عمل کیا تو ناگہاں اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے" (واوحینآ الی موسیٰٓ اذا ستسقاہ قومہٗٓ ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست منہ اثنتا عشرۃ عینا)۔

اور یہ چشمے اس طرح سے ان کے درمیان تقسیم کر دیئے گئے کہ ان میں سے "ہر ایک بخوبی اپنے چشمے کو جانتا پہچانتا تھا" (قد علم کل اناس مشربھم)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارہ چشمے جو اس عظیم پتھر سے نمودار ہوئے تھے، آپس میں الگ الگ نشانیاں رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے مختلف تھے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے قبائل میں سے ہر ایک اپنے چشمے کو پہچانتا تھا۔ اور یہ بجائے خود اس بات کا سبب تھا کہ بنی اسرائیل آپس میں اختلاف نہ کریں - ان میں آپس کا نظم و انضباط برقرار رہے اور وہ آسانی کے ساتھ سیراب ہو جائیں۔

ایک اور نعمت اللہ کی طرف سے ان کو ملی تھی جبکہ وہ انتہائی گرم اور جھلسانے والے بیابان میں سرگرداں تھے اور ان کے لیے سر چھپانے کی کوئی پناہ گاہ نہ تھی وہ یہ تھی کہ "کہ ہم نے ان کے اوپر بادل سایہ فگن کیا" (وظللنا علیھم الغمام)۔

بالآخر چوتھی نعمت ان کے لیے یہ تھی کہ "من و سلویٰ کو دو لذیذ اور مقوی غذاؤں کے طور پر ان کے لیے بھیجا" (وانزلنا علیھم المنّ والسلوٰی)۔

"من و سلوی" ان دو دل پسند اور مفید غذاؤں، (جو اللہ نے اس بیابان میں بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں) کے بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں بیان کی ہیں جنہیں ہم اسی کتاب کی جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۵۷ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں۔ وہاں ہم نے کہا ہے کہ یہ بات بعید

نہیں کہ "مَن" ایک طرح کا شہد تھا جو اطراف کے پہاڑوں میں پایا جاتا تھا، یا مخصوص درختوں کا شیرہ تھا جو اسی بیابان کے درختوں سے نکلتا تھا اور "سلویٰ" کبوتر کی طرح کا ایک پرندہ تھا۔[1]

اور ہم نے ان سے کہا کہ "جو پاک و پاکیزہ غذائیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ (اور خدا کے فرمان پر چلو) (کلوا من طیبات ما رزقناکم)۔

لیکن انہوں نے کھایا اور ناشکری کی، ان لوگوں نے "ہم پر ستم نہیں کیا بلکہ خود اپنی جانوں پر ستم ڈھایا" (وماظلمونا ولکن کانوآ انفسھم یظلمون)۔

اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اس آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۷ و ۶۰ میں بھی گزر چکا ہے اِلّا یہ کہ وہاں پر بجائے "انبجست" کے "انفجرت" آیا ہے، اور جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ "انفجرت" کے معنی زیادہ پانی کے زور کے ساتھ پھوٹنے کے ہیں، جبکہ "انبجست" کے معنی تھوڑے پانی کے باہر نکلنے کے ہیں، اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ وہ چشمہ یک بیک زور اور کثرت کے ساتھ باہر نہیں نکل پڑا ورنہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا اور لوگ گھبرا جاتے بلکہ وہ پہلے آہستہ آہستہ اور کم مقدار میں نمایاں ہوا، پھر اس کے بعد اس کے زور اور مقدار میں اضافہ ہوا، جبکہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ دونوں کلمے ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

۞

(۱۶۱) وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(۱۶۲) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ○

---

[1] "مَن و سلویٰ" کے بارے میں مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اوّل سورہ بقرہ آیت ۵۷ کے ذیل میں۔

ترجمہ

(۱۶۱) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ان لوگوں سے یہ کہا گیا کہ اس قریہ (بیت المقدس) میں سکونت اختیار کرو اور ہر جگہ سے (اور ہر طرح سے) جیسا چاہو کھاؤ (اور فائدہ حاصل کرو) اور یہ کہو کہ بار الٰہا! ہمارے گناہوں کو گرا دے، اور دروازۂ (بیت المقدس) میں تواضع و فروتنی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، اگر ایسا کرو گے تو مَیں تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا اور نیک کام کرنے والوں کا صلہ زیادہ عطا کروں گا۔

(۱۶۲) لیکن ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے (اپنے اوپر) ظلم وستم کیا تھا، انہوں نے اس بات (اور طے شدہ پروگراموں) کو الٹ پلٹ کر دیا اور جو بات ان سے کہی گئی تھی انہوں نے اس کے خلاف کیا، لہٰذا جو ستم انہوں نے کیا تھا ہم نے اس کی وجہ سے ان پر آسمان سے بلا نازل کی۔

تفسیر

پچھلی آیات کا تسلسل باقی رکھتے ہوئے، ان دو آیتوں میں بھی پروردگارِ عالم نے بنی اسرائیل کے لیے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنی سرکشی اور طغیان کے ذریعے کس طرح اس کا بدلہ دیا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ان لوگوں سے کہا گیا کہ اس سرزمین (بیت المقدس) میں سکونت اختیار کرو اور وہاں کی بکثرت نعمتوں سے، ہر جگہ سے جس طرح چاہو استفادہ کرو (واذ قیل لهم اسکنوا هٰذه القریة وکلوا منها حیث شئتم)۔

اور ہم نے ان سے کہا "خدا سے اپنے گناہوں کے جھڑنے اور اپنی خطاؤں کے بخشے جانے کی درخواست کرو اور بیت المقدس میں بڑی فروتنی کے ساتھ داخل ہو جاؤ (وقولوا حطة وادخلوا الباب سجدًا)۔

پس اگر تم نے اس بات پر عمل کیا تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور تم میں سے جو

نیکوکار ہیں انہیں بہتر بدلہ عطا کریں گے" (نغفرلکم خطیئاتکم سنزید المحسنین)۔

۞

لیکن باوجود یکہ اللہ کی رحمت کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے تھے اور انہیں اس بات کا موقع دیا گیا تھا کہ اگر وہ اس موقع سے استفادہ کریں تو اپنے گذشتہ اور آئندہ اعمال کی اصلاح کرلیں مگر بنی اسرائیل کے ظالموں نے نہ صرف یہ کہ اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ انہوں نے فرمانِ پروردگار کے برعکس عمل کیا (فبدّل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم)۔

"آخرکار ان کی اس نافرمانی اور اپنی جانوں پر ستم کرنے کی وجہ سے ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا" (فارسلنا علیھم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون)۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں آیتوں کا مضمون بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۸ اور ۵۹ میں آ چکا ہے اور اس کی تفسیر بھی ہم شرح و بسط کے ساتھ وہاں بیان کرچکے ہیں [1]

دونوں مقامات پر جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ یہاں آخر میں فرمایا گیا ہے: بما کانوا یظلمون، اور وہاں ارشاد ہوا ہے: بما کانوا یفسقون، اور شاید ان دونوں کا فرق اس وجہ سے ہو کہ گناہوں کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خدا سے ہوتا ہے دوسرا وہ جس کا تعلق خود انسان سے ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت میں لفظ "فسق" استعمال کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے "پروردگارِ عالم کے فرمان سے خروج" جبکہ اِس آیت میں "ظلم" سے تعبیر کر کے دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"حطۃ" کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم ملا تھا کہ جب وہ بیت المقدس میں وارد ہوں تو ایک خالص اور واقعی توبہ کے ذریعہ جو لفظ "حطّہ" کے اندر مضمر ہے' اپنے دل و دماغ کو گناہوں کی آلائش سے دھو ڈالیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں جو بیت المقدس پہنچنے سے پہلے انہوں نے خصوصاً اپنے اس عظیم پیغمبر حضرت موسٰی علیہ السلام کو جو تکلیفیں پہنچائی تھیں ان سب کی خدا سے معافی طلب کریں۔

کلمہ "حطۃ" جو بیت المقدس پہنچنے کے وقت ان لوگوں کا نعرہ تھا" مسئلتنا حطۃ" کا مخفف

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اوّل۔

تھا ، جس کے معنی ہیں ۔ ہم اپنے گناہوں کے جھڑنے کا سوال کرتے ہیں "کیونکہ ، حطۃ ، کے معنی کسی چیز کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے کے ہیں ۔

لیکن اس نعرہ کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ دوسرے نعروں کی طرح یہ بھی صرف زبان پر آکر رہ جائے اور دل کی گہرائیوں میں نہ اترے ۔ نہیں ، بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان کی زبان ان کی روح اور ان کے تمام ذراتِ وجود کی ترجمان ہو لیکن جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے ان میں سے بہتوں نے اس اصلاحی نعرہ کو بھی مسخ کر دیا اور اسے ایک ناشائستہ شکل دے دی اور اسے مذاق اڑانے کا ذریعہ بنا لیا ۔

(۱۶۳) وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

(۱۶۴) وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

(۱۶۵) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

(۱۶۶) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ○

ترجمہ

(۱۶۳) اور ان سے سوال کرو اس شہر کی سرگزشت کے متعلق جو سمندر کے کنارے پر آباد تھا (اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ) وہ ہفتہ کے دن (خدا کے قانون کے خلاف) طغیان و سرکشی کرتے تھے، جس وقت ان کی مچھلیاں ہفتہ کے روز ظاہر ہوتی تھیں (جو ان کی چھٹی کا دن تھا) اس کے علاوہ دوسرے روز وہ ان کے پاس نہیں آتی تھیں، اس طرح ہم نے ان کی آزمائش کی جس کے مقابلے میں وہ نافرمانی کرتے تھے۔

(۱۶۴) (اور اس وقت کو یاد کرو) جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا کہ تم ان گنہگاروں کو کیوں موعظہ کرتے ہو جنہیں خدا آخر کار ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب کرنے والا ہے، شدید عذاب کے ساتھ (ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائیں) انہوں نے کہا کہ یہ نصیحتیں تمہارے پروردگار کے سامنے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے ہیں، علاوہ ازیں شاید وہ ان کی بناء پر (اپنے گناہوں سے باز آ جائیں) اور تقویٰ اختیار کریں۔

(۱۶۵) لیکن جب انہوں نے ان تمام نصیحتوں کو فراموش کر دیا جو انہیں وقتاً فوقتاً دی جاتی رہیں تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو (لوگوں کو برائی سے) منع کرتے رہے تھے اور جن لوگوں نے ستم کیا تھا انہیں ان کی نافرمانی کی وجہ سے شدید عذاب میں مبتلا کر دیا۔

(۱۶۶) جب ان لوگوں نے اس فرمان کے مقابلے میں سرکشی کی جو انہیں دیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ بندروں کی شکل میں ہو کر دُور ہو جاؤ[1]

---

[1] اگرچہ اس آیت میں "دُور ہو جاؤ" کے معنی میں کوئی لفظ نہیں ہے، لیکن مفردات راغب میں ہے "خسأت الکلب
(باقی اگلے صفحہ پر)

تفسیر

ایک عبرت انگیز سرگزشت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی ایک اور پُر حوادث سرگزشت کا ذکر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کی اس جماعت کا تذکرہ ہے جو سمندر کے کنارے رہتی تھی۔ مگر یہ کہ ان آیات میں خطاب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے زمانے کے یہودیوں سے ان لوگوں کے متعلق سوال کرو، مقصد یہ ہے کہ اس واقعے کی یاد ان کے ذہنوں میں سوال کے ذریعے تازہ کرو تاکہ یہ اس سے عبرت حاصل کریں اور طغیان و سرکشی اور اس کے نتیجے میں انہیں جو سزا ملنے والی ہے اس سے اجتناب کریں۔

جیسا کہ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ سرگزشت بظاہر ان یہودیوں کی ہے جو ایک سمندر (بظاہر بحیرۂ احمر جو فلسطین کے پاس ہے) کے کنارے شہر "ایلہ" (جسے آج کل "ایلات" کہتے ہیں) میں رہتے تھے، ان کی آزمائش کے لیے اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار نہ کریں، سارے دنوں میں شکار کریں صرف ایک دن تعطیل کر دیا کریں لیکن ان لوگوں نے اس حکم کی صریحاً مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے جس کی تفصیل ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جو یہودی تمہارے زمانہ میں موجود ہیں ان سے اس شہر کے ماجرے کے متعلق سوال کرو جو سمندر کے کنارے آباد تھا" (واسئلهم عن القرية التي كانت حاضرة البحر)۔

"اور انہیں وہ زمانہ یاد دلاؤ جبکہ وہ ہفتہ کے روز قانونِ الٰہی کی مخالفت کرتے تھے" (اذ يعدون في السبت)۔

کیونکہ ہفتہ کے روز ان کی تعطیل کا دن تھا جس میں ان کو یہ حکم ملا تھا کہ اس روز وہ اپنا کاروبار ترک کر دیں اور عبادتِ خدا میں مشغول ہوں لیکن انہوں نے اس حکم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس کے بعد قرآن کریم اس جملے کی جو اجمالی طور پر پہلے گزر چکا ہے اس طرح شرح کرتا ہے کہ یاد کرو۔ جب ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر ظاہر ہوتی تھیں اور دوسرے دنوں میں وہ کم دکھلائی دیتی تھیں" (اذ تأتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعًا)۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ: فخسأ یعنی زجرته فانزجر۔ میں نے کتے کو ذلت کے ساتھ جھڑکا پس اس نے جھڑکا جانا قبول کیا یعنی بھاگ گیا لہٰذا یہاں پر اُردو میں لازمی معنی یہ ہوں گے کہ: ذلت کی حالت میں بندروں کی شکل میں ہو کر دور ہو جاؤ۔ (مترجم)

" سبت " کے معنی لغت میں استراحت کے لیے تعطیل کرنے کے ہیں اور یہ جو قرآن میں سورہ " سبا " میں ہم پڑھتے ہیں :

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۔

ہم نے تمہاری نیند کو استراحت کا سبب قرار دیا ہے ۔

اس سے بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے ، چونکہ ہفتہ کے روز یہودیوں میں کاروبار بند ہو جاتا تھا اس لیے اس دن کو " سبت " کہا جانے لگا اور یہی نام آج تک باقی رہ گیا ۔

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ سمندر کے کنارے زندگی بسر کرتے تھے ان کی خوراک اور آمدنی کا بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار ہوتا تھا اور چونکہ ہفتہ کے روز مسلسل تعطیل ان کے درمیان رائج رہی تھی لہٰذا اس روز مچھلیاں امن محسوس کرتی تھیں اور وہ گروہ در گروہ پانی کی سطح پر ظاہر ہوتی تھیں لیکن دوسرے دنوں میں چونکہ ان کا شکار کیا جاتا تھا اس لیے وہ گہرے پانی میں بھاگ جاتی تھیں ۔ بہرحال یہ کیفیت چاہے کسی فطری امر کے نتیجہ میں ہو یا کوئی خلافِ معمول الٰہی بات ہو اس سے ان لوگوں کی آزمائش مطلوب تھی جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے :

ہم نے اس طرح ان لوگوں کی آزمائش کی اس چیز کے ذریعے جس کی وہ مخالفت کرتے تھے (کذالک نبلوھم بما کانوا یفسقون) ۔

درحقیقت جملہ " بما کانوا یفسقون " کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی آزمائش اس چیز کے ذریعے کی گئی تھی جو انہیں اپنی طرف جذب کرتی تھی اور انہیں نافرمانی کی طرف دعوت دیتی تھی اور تمام آزمائشیں اسی طرح کی ہوتی ہیں کیونکہ آزمائش کا کام یہ ہے کہ وہ کشش گناہ کے مقابلہ میں لوگوں کی قوت مقابلہ کو معین کرے ، اگر گناہ اپنے میں کوئی کشش نہ رکھے تو آزمائش کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا ۔

⁂

جس وقت بنی اسرائیل اس بڑی آزمائش سے دوچار ہوئے جو ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ تین گروہوں میں بٹ گئے :

اوّل : جن کی اکثریت تھی ، وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فرمانِ الٰہی کی مخالفت پر کمر باندھ لی ۔

دوم : جو حسبِ معمول ایک چھوٹی اقلیت پر مشتمل تھا وہ گروہِ اوّل کے مقابلے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرعی ذمہ داری ادا کرتا تھا ۔

سوم : یہ وہ لوگ تھے جو ساکت اور غیر جانبدار تھے ۔ یہ نہ تو گنہگاروں کے ساتھ تھے اور نہ انہیں گناہوں سے منع کرتے تھے ۔

دوسری زیرِ بحث آیت میں اس گروہ نے دوسرے گروہ سے جو گفتگو کی ہے اسے نقل کیا گیا ہے:

اس وقت کو یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا:

تم ان لوگوں کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو جنہیں آخرکار خدا ہلاک کرنے والا ہے یا دردناک عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے (واذ قالت امة منهم لم تعظون قوما الله مهلكهم او معذبهم عذابا شديدا)[1]

انہوں نے جواب میں کہا: ہم اس لیے برائی سے منع کرتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیں اور وہ اس بارے میں ہم سے کوئی باز پرس نہ کرے۔ علاوہ ازیں شاید ان کے دلوں میں ہماری باتوں کا کوئی اثر بھی ہو جائے اور وہ طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھا لیں (قالوا معذرة الى ربكم ولعلهم يتقون)۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کرنے والے دو اغراض کے ماتحت یہ کام انجام دیتے تھے، ایک تو یہ کہ خدا کے سامنے وہ معذور قرار پا جائیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاید گناہگاروں کے دل میں یہ بات اتر جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر احتمالِ تاثیر نہ بھی ہو تب بھی نصیحت کرنا چاہیئے، جبکہ مشہور یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اوّلین شرط یہ ہے کہ احتمالِ تاثیر ہو۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقائق اور اپنی ذمہ داریوں کا بیان کرنا واجب ہو جاتا ہے چاہے تاثیر کا احتمال نہ بھی ہو۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب حالت یہ ہو کہ اگر حکمِ الٰہی بیان نہ کیا جائے اور گناہ پر تنقید نہ کی جائے تو وہ حکمِ الٰہی نذرِ طاقِ نسیان کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ بدعتیں لے لیں گی اور مُصلحین کے سکوت کو ان کی رضامندی کی دلیل سمجھا جائے گا۔ اس موقع پر ضروری ہے کہ حکمِ خدا کو آشکارا طور پر ہر جگہ بیان کیا جائے چاہے گنہگاروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نہی کرنے والے یہ کہتے تھے: ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے پروردگار کی بارگاہ میں ہم معذور سمجھے جائیں، اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تم بھی خدا کے سامنے مسئولیت رکھتے ہو یہ صرف ہماری شرعی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تمہاری ذمہ داری بھی ہے۔

---

[1] ان لوگوں کو "امة منهم" سے جو تعبیر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گروہِ دوم گروہِ اوّل سے تعداد میں کم تھا کیونکہ پہلے گروہ کے لیے "قوما" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے (بغیر کلمہ "منهم" کے)۔ بعض روایات میں ہمیں اس طرح ملتا ہے کہ اس شہر کی تعداد اسی ہزار سے زیادہ تھی جس میں سے ستر ہزار نے گناہ کا ارتکاب کیا تھا (تفسیر برہان جلد ٢ صفحہ ٤٢)۔

اس کے بعد والی آیت کہتی ہے کہ: آخرکار دنیا پرستی نے ان پر غلبہ کیا۔ اور انہوں نے خدا کے فرمان کو فراموش کر دیا، اس وقت ہم نے ان لوگوں کو جو لوگوں کو گناہ سے منع کرتے تھے، نجات دی لیکن گناہگاروں کو ان کے گناہ کے سبب سخت عذاب میں مبتلا کر دیا (فلما نسوا ما ذکروا بہٖ انجینا الذین ینھون عن السوٓء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون)[1]

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ "فراموشی" ایسی حقیقی فراموشی نہ تھی جو موجب عذر ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے خدائی فرمان سے اس طرح بے اعتنائی برتی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اسے بالکل فراموش کر دیا ہے۔

*

اس کے بعد انہیں سزا دیئے جانے کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: انہوں نے اس بات کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا (لہٰذا) ہم نے ان سے کہا دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں ہو جاؤ (فلما عتوا عما نھوا عنہ قلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین)[2]

ظاہر ہے کہ امر "کونوا" (ہو جاؤ) یہاں پر ایک فرمان تکوینی ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـــًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ (یٰسین - ۸۲)

چند قابلِ توجہ باتیں

۱۔ بنی اسرائیل نے کس طرح گناہ کیا تھا؟: اس امر میں کہ بنی اسرائیل نے کس وقت قانون شکنی کی، مفسّرین کے درمیان بحث ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایک حیلہ اختیار کیا، انہوں نے سمندر کے کنارے بہت سے حوض بنا لیے تھے اور انہیں نہروں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا تھا۔ ہفتہ کے روز ان حوضوں کے راستے کھول دیتے تھے پانی کے ساتھ مچھلیاں ان حوضوں کے اندر آجاتی تھیں، غروب کے وقت جب واپس جانا چاہتی تھیں تو واپسی کا راستہ بند کر دیتے تھے، جب اتوار کا دن ہوتا تھا تو پھر ان کا شکار کر لیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم نے ہفتہ کے روز شکار تھوڑی کیا ہے بلکہ ہم نے تو صرف انہیں حوضوں میں محصور کر لیا تھا اصل شکار تو اتوار کے

---

[1] لفظ "بئیس" کی اصل "بأس" ہے جس کے معنی "شدید" ہیں۔

[2] لفظ "عتوا" کی اصل "عتو" (بروزن غلو) ہے جس کے معنی ہیں "نافرمانی"۔ جن مفسّرین نے اس کے معنی "رکنے" کے کیے ہیں وہ اہل لغت کے اقوال کے خلاف ہے۔

روز ہوا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ وہ لوگ ہفتہ کے روز مچھلی پکڑنے کے کانٹوں کو دریا میں ڈال دیتے تھے اس کے بعد جب اس میں مچھلیاں پھنس جاتی تھیں تو دوسرے روز انہیں نکال لیتے تھے اور اس حیلہ سے ان کا شکار کرتے تھے۔

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بغیر کسی حیلہ کے بروز شنبہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شکار میں مشغول ہوتے تھے۔

ممکن ہے کہ یہ تمام روایات صحیح ہوں اس طرح کہ ابتداً میں حوضوں یا قلابوں کے ذریعے حیلے سے شکار کرتے ہوں، جب اس طرح سے ان کی نظر میں گناہ کی اہمیت کم ہوگئی ہو تو پھر انہوں نے اعلانیہ گناہ کرنا شروع کر دیا ہو اور ہفتہ کے دن کی حرمت کو ضائع کرکے مچھلی کی تجارت سے مالدار ہو گئے ہوں۔

۲۔ کن لوگوں کو عذاب سے نجات ملی؟: مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تین گروہ تھے۔

۱۔ افراد گناہ گار۔
۲۔ سکوت کرنے والے۔
۳۔ نصیحت کرنے والے۔

ان میں سے تیسرے گروہ کو عذاب الٰہی سے رہائی نصیب ہوئی اور جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور برابر گناہ میں مشغول ہیں تو انہیں دکھ ہوا اور انہوں نے کہا اب ہم شہر سے باہر چلے جاتے ہیں اب ہم تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہیں گے چنانچہ وہ لوگ رات کے وقت شہر سے باہر جنگل میں چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد عذابِ خدا نازل ہوگیا جس نے باقی دونوں گروہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بعض مفسرین نے جو یہ خیال کیا ہے کہ یہ عذاب صرف گناہگار افراد پر نازل ہوا تھا اور جو لوگ خاموش تھے وہ بھی محفوظ بچ گئے تھے، بظاہر مذکورہ بالا آیات سے موافقت نہیں رکھتا۔

۳۔ کیا دونوں گروہوں کو ایک ہی طرح کی سزا ملی تھی؟: مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ مسخ ہونے کی سزا گنہگاروں کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: **فلما عتوا عما نھو عنه** ... (جب انہوں نے اس چیز کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا...) لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب سے نجات

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۲ ، یہ بات ابن عباس سے تفسیر مجمع البیان میں بھی اسی آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔

پانے والے صرف وہ لوگ تھے جو بدکاروں کو برائی سے روکتے تھے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے :

انجینا الذین ینھون عن السوٓء ۔

ہم نے ان لوگوں کو عذاب سے نجات دی جو برائی سے منع کرتے تھے ۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سزا تو دونوں گروہوں کو ملی تھی لیکن مسخ کیے جانے کی سزا صرف گنہگاروں کو ملی تھی ۔ جبکہ دوسرے لوگوں کی سزا احتمال کے طور پر صرف ان کی ہلاکت تھی اگرچہ گنہگار افراد بھی مسخ ہونے کے چند روز بعد مرگئے تھے [1]

۴۔ یہ مسخ جسمانی تھا یا روحانی ؟ : "مسخ" یا دوسرے لفظوں میں۔ انسانی شکل کا کسی حیوان کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ مسلمہ طور پر ایک خلافِ معمول اور خلافِ طبیعت بات ہے۔ اگرچہ میوٹیشن (MUTATION) بعض حیوانات کا دوسرے حیوانات کی شکل اختیار کر لینا نادر طور پر دیکھا گیا ہے اور سائنس میں تکامل حیات کی بنیاد بھی اسی بات پر رکھی گئی ہے، لیکن میوٹیشن (MUTATION) جہاں دیکھا گیا ہے وہ بہت نادر الوقوع موارد ہیں، وہ بھی حیوانات کی جزوی صفات میں پایا جاتا ہے نہ کہ ان کی کلی صفات میں، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ میوٹیشن (MUTATION) کی وجہ سے ایک حیوان اپنی نوع مثلاً بندر سے بکری بن گیا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی حیوان کی خصوصیات دگرگوں ہو جائیں، پھر یہ کہ یہ تبدیلی اس کی نسل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ جو حیوان پیدا ہو گیا ہے اس کی شکل یک بیک بدل گئی ہو، بنا بریں کسی انسان یا حیوان کی شکل کا بدل کر دوسری نوع اختیار کر لینا ایک خلافِ معمول بات ہے ۔

ہم نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو طبیعت اور عادت کے برخلاف واقع ہوتے ہیں جو کبھی تو پیغمبروں کے معجزوں کی صورت میں اور کبھی بعض خارق العادت کاموں کی صورت میں بعض انسانوں سے ظاہر ہوتے ہیں چاہے وہ انسان پیغمبر نہ بھی ہوں (ایسے افعال میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے) لہٰذا جب خارق العادت امور اور معجزات کے وقوع کو قبول کر لیا جائے تو مسخ ہو جانا یا ایک انسان کا دوسرے انسان کی صورت اختیار کر لینا کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے ۔

جیسا کہ ہم نے اعجاز انبیاء کی بحث میں بیان کیا ہے کہ اس طرح کا خارق العادت واقعہ رونما ہونا نہ تو قانون علل و اسباب میں کوئی استثناء ہے اور نہ ہی عقل و خرد کے برخلاف، بلکہ اس میں صرف ایک "عادی" وطبیعی کلیہ کی شکست ہے جس کی نظیر ہم نے بعض استثنائی

---

[1] اگر بعض روایات سے اس کے برخلاف کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ جہاں آیت مذکورہ کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے قابل اعتماد نہیں ہو سکتا وہاں سند کے لحاظ سے بھی اس کی تضعیف کی گئی ہے اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے راوی سے غلطی ہوگئی ہو ۔

انسانوں میں بارہا دیکھی ہے [1]

بنا بریں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کلمہ "مسخ" کا جو ظاہری مفہوم ہے اسی کو مانا جائے جو اس آیت میں بھی آیا ہے اور دیگر آیات میں بھی آیا ہے نیز دیگر مفسرین نے بھی زیادہ تر یہی معنی مراد لیے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین جو اقلیت میں ہیں ان کا خیال ہے کہ مسخ سے "مسخ روحانی" اور صفاتِ اخلاقی کی تبدیلی مراد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سرکش لوگوں میں بندر یا خنزیر کی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً اندھی تقلید کرنا، شکم پرستی اور شہوت رانی جو ان جانوروں کی نمایاں صفتیں ہیں وہ ان میں نمایاں ہو گئی تھیں۔ مذکورہ احتمال ایک قدیمی مفسر "مجاہد" سے نقل کیا گیا ہے۔

بعض افراد نے یہ کہا ہے کہ "مسخ" ہونا قانونِ تکامل کے خلاف اور خلقتِ تدریجی سے پیچھے ہٹنا ہے، یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ "قانونِ تکامل" ان افراد سے مخصوص ہے جو راہِ تکامل پر گامزن ہوں، نہ ان مخلوقات کے لیے جو اس جادہ سے منحرف ہو گئی ہوں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک سالم و تندرست انسان اپنے بچپن میں برابر نشوونما کرتا ہے، لیکن اگر اس کے بدن میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو ممکن ہے کہ نہ صرف اس کی نشوونما رک جائے بلکہ وہ عقب کی طرف پلٹ جائے اور اس کی ذہنی اور جسمانی ترقی تدریجاً ضائع ہو جائے۔

لیکن ہر حال میں یہ ملحوظِ نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ مسخ ہونا ہو یا جسمانی تغیّر، یہ ان اعمال کی مناسبت سے ہو گا جنہیں یہ شخص گنہگار بجا لاتا رہا ہے، یعنی چونکہ گنہگاروں میں کچھ افراد نے نفس پرستی اور شہوت رانی کے جذبہ سے متاثر ہو کر خدا کی نافرمانی کی، جبکہ دوسرے افراد وہ تھے جنہوں نے اندھی تقلید کی عادت کی بنا پر گناہ کیا لہٰذا مسخ کیے جانے کے وقت ہر گروہ اپنے اعمال کی مناسب شکل میں ظاہر ہوا۔

اگرچہ زیرِ بحث آیات میں صرف "قردة" (بندروں) کا ذکر آیا ہے اور "خنازیر" (سُوروں) کا تذکرہ نہیں ہے لیکن سورہ مائدہ کی آیت ۶۰ میں کچھ ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ ہے، جن کی صورت مسخ کے وقت مذکورہ بالا دونوں جانوروں (بندر اور سُور) کی ہو گئی تھی۔ بعض مفسرین مثلاً ابنِ عباس

---

[1] بعض معاصر اہلِ قلم نے مدارک اور حوالوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ایسے استثنائی انسانوں یا حیوانوں کے حالات پر کتاب لکھی ہے جو بہت دلچسپ ہے، ان میں سے ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو اپنی انگلیوں کے ذریعے تحریر کو پڑھ سکتے ہیں! یا ایک عورت جس نے ۲ مہینوں کے فاصلہ سے دوبارہ بچہ پیدا کیا اور ہر دفعہ دو جڑواں بچے پیدا ہوئے یا ایک ایسا بچہ متولد ہوا جس کا دل قفسِ سینہ کے اوپر تھا، یا ایک ایسی عورت جسے بچہ پیدا ہونے تک اپنے حاملہ ہونے کی کوئی اطلاع نہ تھی، اسی طرح کے دیگر خارقِ عادت واقعات مذکورہ بالا امور کے حوالوں کے لیے ملاحظہ کریں کتاب - آیا مسخ نزدیک نیست - صفحہ ۸۳ تا صفحہ ۸۶۔

کے قول کے مطابق یہ آیت بھی انہی اصحاب سبت کے بارے میں نازل ہوئی ہے یعنی شکم پرست اور بوالہوس بوڑھے خنزیر کی شکل میں اور اندھی تقلید کرنے والے جوان بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے تھے ۔

لیکن اس امر کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسخ ہونے والے انسان صرف چند روز زندہ رہ کر مر گئے تھے اور ان کی نسل بھی دنیا میں باقی نہیں رہی تھی ۔

۵۔ شریعت کی آڑ میں الٰہی فرمان کی خلاف ورزی : اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں اصحابِ سبت کی حیلہ گری کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سابقاً اشارہ کیا کہ بہت سے مفسّرین نے ان آیات کی شرح میں چھوٹے چھوٹے حوض بنانے یا ہفتہ کے دن دریا میں کانٹے ڈالنے کی داستان بیان کی ہے ۔ نیز روایاتِ اسلامی میں بھی یہ امر دکھلائی دیتا ہے ۔ بنا بریں سزا اور کیفر جو اس شدت کے ساتھ ان لوگوں کو ملی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیلہ گری اور شریعت کی آڑ لینے کی وجہ سے حقیقتِ گناہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے گناہ بہر حال گناہ ہے چاہے وہ اعلانیہ طور پر کیا جائے یا شریعت کی آڑ لے کر کیا جائے ۔

لہٰذا وہ لوگ جو اس خام خیال میں بتلا ہیں کہ گناہ اور حرام فعل کو توڑ موڑ کر شریعت کی آڑ میں جائز کیا جا سکتا ہے وہ درحقیقت خود فریبی کے مرض میں بتلا ہیں ۔ بدبختی سے یہ حرکت بعض ایسے نادانوں میں دیکھی گئی ہے جو اپنے کو دین کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں ، اور یہی بات ہے جس کی وجہ سے دین و مذہب کا چہرہ دور سے دیکھنے والوں کی نگاہ میں سخت بدنما معلوم ہوتا ہے ۔

اس عمل میں ایک بہت بُرائی مذہب کے چہرہ کو بدنما کرنے کے علاوہ جو ہے وہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کی نظر میں گناہ حقیر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے دیگر افراد میں بھی اسے کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے ۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے :

> ایک روز ایسا بھی آئے گا جبکہ لوگوں کی آزمائش ان کے مالوں کے ذریعے سے کی جائے گی ، یہ خدا پر احسان جتاتے ہیں کہ دیندار ہیں اور اس عالم میں وہ خدا کی رحمت کے امیدوار بھی ہیں اور اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہیں ۔
>
> یستحلون حرامہٗ بالشبہات الکاذبۃ والاھوآء الساھیۃ فیستحلون الخمر بالنبیذ والسحت بالھدیۃ والربا بالبیع ۔
>
> یہ حرامِ خدا کو جھوٹے شبہات اور واہیات افکار کے ذریعے حلال سمجھتے ہیں

شراب پر "نبیذ"[1]، رشوت پر "ہدیہ" اور ربا پر "بیع" کا لیبل لگا کر اپنے اوپر حلال کر لیتے ہیں۔

(نہج البلاغہ ۱۵۶ ویں خطبہ کا آخری حصّہ)

اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی حیلہ گریوں کا باعث یا تو یہ تھا کہ وہ اپنے باطنی چہرہ کو افکارِ عمومی سے چھپانا چاہتے تھے یا وہ اس سے خود اپنے کو دھوکا دیتے تھے۔

۶- **آزمائش الٰہی کی مختلف شکلیں:** یہ بات درست ہے کہ دریا کے ساحل پر رہنے والوں کے لیے مچھلی کا شکار کرنا کوئی بُرا کام نہیں ہے لیکن یہ بات ممکن ہے کہ کبھی خدا آزمائش کے طور پر کچھ لوگوں کو اس عمل سے منع کر دے تاکہ ان کی فداکاری کا حال معلوم ہو جائے، یہ خدائی امتحان و آزمائش کی ایک شکل ہے۔ علاوہ ازیں روز شنبہ یہودیوں کے دین میں ایک مقدس دن تھا۔ اس دن شکار سے منع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اس دن دنیاوی کاموں کی تعطیل کر کے پوری طرح سے خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اللہ کی عبادت کریں، لیکن شہر "ایلہ" کے ساحل نشینوں نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا اور کھلے دل کے ساتھ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی جس کی وجہ سے انہیں ایسی سخت سزا ملی جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے درسِ عبرت بن گئی۔

٭

(۱۶۷) وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۱۶۸) وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

---

[1] "نبیذ" کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑا خرما یا کشمش کسی برتن میں پانی کے ساتھ بھگو دیتے تھے، اسے چند روز گزر جاتے تھے، اس کے بعد وہ پانی صاف کر کے پیتے تھے، اس کو اگرچہ شراب تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن موسم کی گرمی کے اثر سے اس میں جو میٹھا مادّہ تھا وہ ایک ہلکے "الکحل" کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

ترجمہ

(۱۶۷) اور (اس وقت کو بھی یاد کر) جب تیرے پروردگار نے یہ خبر دی کہ وہ قیامت تک کے لیے ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو انہیں ہمیشہ سخت عذاب دیں گے ، بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور (توبہ کرنے والوں کے لیے) بڑا بخشنے والا اور مہربان (بھی) ہے ۔

(۱۶۸) اور ہم نے انہیں زمین پر مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ، ان میں کچھ گروہ نیکوکار اور کچھ اس کے علاوہ ہیں ، اور ہم نے ان کی آزمائش کی نیکیوں اور بدیوں کے ذریعے کہ شاید وہ (ہماری طرف) پلٹیں ۔

تفسیر

یہودیوں کا پراگندہ ہونا

درحقیقت ان آیات میں قوم یہود کی ان دنیوی سزاؤں کا ایک حصّہ بیان کیا گیا ہے جو انہیں اس وجہ سے دی گئیں کہ انہوں نے فرمانِ الٰہی کا مقابلہ اپنی نافرمانی اور سرکشی سے کیا ، اور حق و عدالت کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا

سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے : وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے یہ خبر دی تھی کہ اس گنہگار قوم پر کچھ ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو قیامت تک کے لیے انہیں عذاب دیتے رہیں (واذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الیٰ یوم القیامۃ من یسومھم سوٓء العذاب) ۔

" تاذن " اور " اذن " دونوں کے معنی اطلاع اور خبر دینے کے ہیں ، نیز اس کے معنی قسم کھانے کے بھی ہیں اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے یہ قسم کھائی ہے کہ وہ ان لوگوں پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو قیامت تک کے لیے ان کو تکلیف و عذاب دیتے رہیں گے ۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سرکش گروہ قیامت تک راحت و آرام نہ پائے گا چاہے اپنے لیے ایک حکومت وسلطنت بنالے ، اس کے باوجود ہمیشہ اغیار کے دباؤ اور رنج و الم میں مبتلا رہے

گا الآیہ کہ یہ قوم واقعاً اپنا طریقۂ کار بدلے اور ظلم و فساد سے اپنا ہاتھ روک لے۔

آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار ایسا ہے کہ مستحقین عذاب کے لیے اس کی سزا میں بھی جلدی ہے، اور توبہ کرنے والوں کے لیے اس کی بخشش و مہربانی بھی (ان ربک لسریع العقاب وانہ لغفور رحیم)۔

اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ خداوندکریم نے ان کے لیے واپسی کا راستہ کھلا رکھا ہے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ قسمت کے لکھے کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی کہ وہ بدبخت ہوکر الٰہی سزا کے مستوجب بنے۔

٭

اس کے بعد کی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہودی سارے جہاں میں کس طرح تتر بتر ہو گئے: ہم نے انہیں زمین میں تتر بتر کر دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے ان میں سے بعض صالح و نیکوکار تھے اسی بناء پر جب انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ حق کو سنا تو وہ فوراً ایمان لے آئے اور بعض دیگر افراد ایسے (حق پرست) نہ تھے چنانچہ انہوں نے حق کی دعوت کو پس پشت ڈال دیا اور اپنی مادّی زندگی کو اچھا بنانے کے لیے کسی عمل سے دریغ نہیں کیا (وقطعناھم فی الارض امما منھم الصالحون و منھم دون ذالک)۔

اس آیت میں یہ حقیقت دوبارہ ظہور پذیر ہو رہی ہے کہ اسلام کو نسلِ یہود سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی اسلام انہیں ایک خاص مذہب یا خاص مکتبِ فکر رکھنے کی وجہ سے بُرا سمجھتا ہے بلکہ ان کی قدر وقیمت ان کے اعمال کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے مختلف ذریعوں سے نیکیوں اور برائیوں کے ذریعے ان کا امتحان لیا کہ شاید وہ پلٹیں (وبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلھم یرجعون)۔

کبھی ہم نے انہیں شوق دلایا اور انہیں خوشحالی اور نعمت میں رکھا تاکہ ان میں شکرگزاری کا احساس بیدار ہو اور وہ حق کی طرف پلٹ کر آجائیں، اور کبھی اس کے برخلاف انہیں سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ غرور و تکبّر کی سواری سے اتر آئیں اور اپنی کمزوری و ناتوانی کا احساس کریں اور بیدار ہوں اور خدا کی طرف پلٹیں، ان دونوں طریقوں کے استعمال کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ ان کی اخلاقی تربیّت ہو اور وہ حق کی جانب پلٹ کر آئیں۔

لہٰذا لفظ "حسنات" ہر طرح کی نعمت، خوش حالی، آسائش اور آرام اپنے مفہوم میں لیے ہوئے ہے جبکہ لفظ "سیئات" ہر طرح کی تکلیف اور سختی کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان دونوں لفظوں

کے معنی کو اچھائیوں اور برائیوں میں محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔

(۱۶۹) فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۗ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۗ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(۱۷۰) وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۗ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۶۹) ان کے بعد ان کے وہ فرزند ان کے جانشین ہوئے جو (آسمانی) کتاب (توریت) کے وارث بنے (لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ) وہ اس دنیائے دنی کے مال و متاع کو اختیار کرتے ہیں (اور اسے الٰہی احکام پر ترجیح دیتے ہیں) اور یہ کہتے ہیں کہ (اگر ہم گنہگار ہیں تو) خدا ہمیں جلد ہی بخش دے گا (ہم اپنے کیے پر پشیمان ہیں) لیکن اگر اس کے بعد پہلے متاع کی مثل ان کے پاس آتا ہے تو اسے پھر لے لیتے ہیں (اور دوبارہ حکمِ خدا کو پس پشت ڈال دیتے ہیں) کیا ان سے (خدا کی) کتاب کا یہ پیمان نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کی طرف کسی جھوٹ کو نسبت نہ دیں اور

سوائے حق کے کوئی بات نہ کہیں اور انہوں نے بارہا اسے پڑھا ہے اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا آخرت کا گھر بہتر ہے۔

(۱۷۰) اور وہ لوگ جو کتاب (خدا) سے تمسک اختیار کریں اور نماز پڑھیں (انہیں بڑا انعام ملے گا کیونکہ) ہم اصلاح کرنے والوں کی جزا ضائع نہیں کرتے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ان کے بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن مذکورہ بالا آیت میں ان کے فرزندوں اور ذریّت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پہلے اس بات کی یاددہانی کروائی گئی ہے کہ - ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی جنہوں نے اپنے اجداد سے کتاب توریت کی میراث پائی لیکن اس کے باوجود وہ اس دنیائے فرومایہ کے زیب و زین پر فریفتہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے مادّی فائدوں کے بدلے حق و ہدایت کو فروخت کرڈالا" (فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب یأخذون عرض ھٰذا الادنیٰ)۔

"خلف" (بروزنِ حرف) بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ لفظ غیر صالح اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ "خلف" (بروزنِ شرف) کے معنی صالح و نیک اولاد کے ہیں[1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے کہ وہ لوگ جس وقت اس کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایک طرف انہیں وجدان منع کرتا ہے اور دوسری طرف ان کے مادّی منافع برائی کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس وقت وہ جھوٹی امیدوں کا سہارا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: اس وقت تو ہم اس منفعت کو جائز یا ناجائز جس طرح بھی ہو حاصل کرلیں، خدائے رحیم و مہربان ہمیں بخش دے گا (ویقولون سیغفر لنا)۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے کام کرنے کے بعد زود گزر پشیمانی اور جھوٹی توبہ کی حالت میں مبتلا ہوتے تھے لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ان کی یہ ندامت و پشیمانی ناپائیدار ہوتی تھی، اسی بنا بر- اگر اسی طرح کا فائدہ انہیں دوبارہ ملتا تھا تو اسے وہ حاصل کرلیتے تھے" (وان یأتہم عرض مثلہٗ یأخذوہ)۔

---

[1] مجمع البیان و تفسیر ابوالفتوح رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

" عرض " بروزن (غرض) کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو عارضی ، کم دوام اور ناپائیدار ہو۔ اسی وجہ سے یہ لفظ دنیائے مادّی کی چیزوں پر بولا جاتا ہے کیونکہ یہ چیزیں ناپائیدار ہوتی ہیں حالانکہ ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ ان کا حساب ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ روز انسان کے اختیار سے اس طرح دور ہو جائے گا کہ اس کے ذرا سے حصّہ کے انتظار میں وہ ٹھنڈی آہ بھرے گا، اس کے علاوہ اس دنیا میں تمام نعمتیں ناپائیدار اور زوال پذیر ہیں۔

بہر حال اس جملے میں یہودیوں کی جماعت کی رشوت ستانی اور اس کی خاطر تحریف آیاتِ آسمانی اور جو احکام ان کے مفادات سے مطابقت نہ رکھتے ان کی فراموشی کی طرف اشارہ ہے۔ اس بنا پر اس کے بعد ہی فرمایا گیا ہے : کیا ان لوگوں نے اپنی آسمانی کتاب توریت کے ذریعہ یہ عہد نہیں کیا تھا کہ خدا کی طرف جھوٹی بات کی نسبت نہیں دیں گے اور حق کے سوا کوئی بات نہیں کہیں گے (الم یؤخذ علیھم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : اگر انہیں آیاتِ الٰہی کا علم نہ ہوتا اور لاعلمی کی حالت میں حکم الٰہی کے خلاف یہ کام بجا لاتے تو ممکن تھا کہ ان کے لیے عذر تراشی کی مجال ہوتی، لیکن قابلِ اشکال بات یہ ہے کہ - ان لوگوں نے بارہا توریت کے مطالب کو دیکھا اور سمجھا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے انہیں ضائع کر دیا اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال دیا (و درسوا ما فیہ)۔

" درس " کے لغوی معنی کسی چیز کی تکرار کرنے کے ہیں، اسی لیے جو مطالب کسی استاد کے ذریعے حاصل کیے جائیں اور بار بار ان کی تکرار کی جائے انہیں " درس " کہا جاتا ہے۔ مکانات وغیرہ کی کہنگی اور فرسودگی کو بھی جو " درس یا اندراس " کہتے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہواؤں اور بارشوں اور دیگر حوادث کے بار بار آنے کی وجہ سے عمارتیں کہنہ اور فرسودہ ہو جاتی ہیں۔

آخر کار فرمایا گیا ہے : یہ لوگ غلطی پر ہیں، یہ اعمال اور مال و متاع انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے بلکہ " آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے" (والدار الاٰخرۃ خیر للذین یتقون)۔ آیا تم اتنے واضح حقائق کو بھی نہیں سمجھتے" (افلا تعقلون)۔

※

اس کے بعد قرآن مذکورہ بالا گروہ کے برخلاف ایک دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ لوگ نہ صرف ہر قسم کی تحریف اور کتمانِ آیات سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ تمسک کرتے ہیں، اور ان پر حرف بحرف عمل بھی کرتے ہیں، قرآن نے اس گروہ کا نام " مصلحانِ جہان " رکھا ہے،

لہ اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ " عرض " (بروزن غرض) اور " عرض " (بروزن فرض) دو مختلف الفاظ ہیں جن کے معنی بھی مختلف ہیں کیونکہ پہلے لفظ کے معنی مادّی دنیا کے ہر طرح کے سرمائے کے ہیں جبکہ دوسرے لفظ کے معنی نقد پیسہ کے ہیں۔

اور ان کے لیے اہم جزا کا وعدہ کیا ہے ان کے متعلق اس طرح فرماتا ہے : جو لوگ کتاب پروردگار سے تمسک اختیار کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں، ان کے لیے بڑی جزا ہے، کیونکہ ہم اصلاح کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کریں گے (والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوٰۃ انا لا نضیع اجرالمصلحین)۔

اس کتاب سے توریت مراد ہے یا قرآن کریم ؟ مفسرین نے دونوں طرح کی تفسیریں کی ہیں لیکن اگر گذشتہ آیات کی جانب توجہ کی جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جنہوں نے اپنا حساب گمراہ لوگوں سے الگ کر لیا تھا، اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ توریت و انجیل سے تمسک کرنا، ان بشارتوں کو دیکھتے ہوئے جو ان دونوں کتابوں میں پیغمبر اسلامؑ کے متعلق موجود ہیں، اس پیغمبر پر ایمان سے جدا نہ ہوگا۔

کلمہ " یمسکون " جس کے معنی تمسک کرنے کے ہیں اپنے دامن میں ایک جاذب نظر نکتہ لیے ہوئے ہے، کیونکہ " تمسک " کے معنی کسی چیز کو لینے اور اس کی حفاظت کی خاطر اس کے ساتھ چمٹ جانے کے ہیں۔ یہ اس کی حسی صورت ہے اور اس کی معنوی صورت یہ ہے کہ انسان اپنی پوری کوشش کے ساتھ کسی عقیدے یا نظام کا پابند ہو جائے اور اس کی بقا و حفاظت کے لیے اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دے۔ اس بنا پر کتاب الٰہی سے تمسک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان قرآن یا توریت یا کسی دوسری کتاب کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ تھام لے اور اس کے صفحات یا اس کی جلد کی حفاظت میں اپنی پوری کوشش صرف کردے، بلکہ حقیقی تمسک یہ ہے کہ اپنے نفس کو اس بات کی قطعی اجازت نہ دے کہ کسی پہلو سے اس کتاب کے فرامین کی مخالفت کی جائے بلکہ اس کے مفاہیم و احکام کے تحقق پانے اور عملی صورت اختیار کرنے میں اپنی جان و دل کے ساتھ کوشش کرے۔

❖

مذکورہ بالا آیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ روئے زمین پر اصلاح واقعی کتاب آسمانی سے تمسک کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تعبیر ایک مرتبہ اور اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ دین و مذہب ایک ایسا نظام العمل نہیں ہے جس کا تعلق محض آخرت یا عالم ماوراء الطبیعت سے ہو، بلکہ یہ ایک ایسا آئین ہے جس کا تعلق تمام نوع بشر کی زندگیوں سے ہے کیونکہ یہ مذہب ہی ہے جس کی وجہ سے تمام افرادِ انسانی میں عدالت، صلح، رفاہیت، آسائش اور آرام کے اصول رائج ہوتے ہیں بلکہ " اصلاح " کے تمام مفہوم میں جتنی چیزیں آسکتی ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

ہاں ! یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے تمام فرمانوں میں سے یہاں نماز ہی کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس

وجہ سے ہے کہ ایک حقیقی نماز انسان کا اس کے رب سے رشتہ اس قدر مضبوط کر دیتی ہے کہ بندہ اپنے ہر کام کے وقت اپنے خدا کو ہمیشہ حاضر و ناظر اور اپنے اعمال کا نگران پاتا ہے' یہ نماز ہی کی صفت ہے جس کا ذکر دیگر آیات میں آیا ہے کہ نماز نہی عن المنکر کرتی ہے اس موضوع کا انسانی سوسائٹی اور اس کی اصلاح کے ساتھ جو ربط خاص ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔

٭

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہُوا کہ یہ نظام العمل صرف قوم یہود کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا قانون ہے جو تمام امتوں اور ملتوں میں کار فرما ہے ، اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ جو لوگ حقائق کو چھپاتے ہیں اور ان میں تحریف اور تبدیلی کر کے اپنے لیے متاع ناپائیدار اور زود گزر منافع فراہم کرتے ہیں ، اور جب اس عمل کے بُرے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہ اپنے میں ایک جھوٹی توبہ کی حالت پیدا کرتے ہیں ایسی توبہ جو ذرا سی مادّی منفعت کی چمک دمک سے یوں بہ جاتی ہے جس طرح گرمی کے سورج کے سامنے تھوڑی سی برف بہہ جاتی ہے ، ایسے لوگ درحقیقت معاشرے کی اصلاح کے مخالف ہیں ، یہ اپنے ذاتی منافع پر اجتماعی منافع کو قربان کر دیتے ہیں ، یہ عمل چاہے کسی یہودی سے سرزد ہو یا کسی مسیحی سے یا کسی مسلمان سے !

٭

(۱۷۱) وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۟ ع ۲۱

ترجمہ

(۱۷۱) اور (اس بات کو بھی یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ایک سائبان کی طرح ان کے اوپر اس طرح سایہ فگن کیا کہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ عنقریب ان کے اوپر آپڑے گا (اور اس حال میں ہم نے ان سے عہد لیا اور کہا) جو کچھ تمہیں (احکام و فرامین) کی صورت میں دیا گیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو

(اور اس پر عمل کرو) تاکہ پرہیزگار بن جاؤ۔

تفسیر

قوم یہود کے بارے میں آخری بات

"نتقنا" کی اصل "نتق" (بروزن "قلع") ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ سے اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ پھینک دینے کے ہیں۔ جن عورتوں کے ہاں زیادہ بچے ہوتے ہیں انہیں بھی "ناتق" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بچے کو اپنے رحم سے آسانی کے ساتھ جدا کر کے باہر ڈال دیتی ہے۔

یہودیوں کی سرگزشت جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہے یہ آیت اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس میں یہودیوں کی ایک اور سرگزشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سرگزشت ہے جس میں ایک درسِ عبرت ہے اور ایک عہد و پیمان کا ذکر بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو ان کے سر کے اوپر قرار دیا اس طرح جیسے ایک سائبان سایہ فگن ہو (واذ نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ)۔

"اور اس طرح کہ انہیں لگتا تھا جیسے وہ ان کے سر پر گر پڑے گا" وہ یہ دیکھ کر سراسیمہ اور پریشان ہو گئے اور گڑگڑانے لگے (وظنوا انہ واقع بھم)۔

اس حال میں ہم نے ان سے کہا، "ہم نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھام لو" (خذوا ما آتیناکم بقوۃ)۔

"اور جو کچھ ان احکام میں آیا ہے اسے ذہن نشین کر لو تاکہ پرہیزگار ہو جاؤ" خدا کی سزا سے ڈرو اور اس (کتاب) میں ہم نے تم سے جو عہد و پیمان لیے ہیں ان پر عمل کرو (واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون)۔

یہ آیت، نیز سورہ بقرہ کی آیت ۶۳ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جسے مشہور مفسر علامہ طبرسی نے اپنی کتاب "مجمع البیان" میں ابن زید کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت موسیٰ کوہِ طور سے پلٹ رہے تھے اور توریت کے احکام ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جب اپنی قوم کو ان کی ذمہ داریوں اور حلال و حرام کے قوانین سے آگاہ کیا تو ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ان تمام احکام پر عمل کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اس موقع پر ایک پہاڑ سے ایک بہت بڑی چٹان الگ ہو کر ہوا میں بلند ہوئی اور ان کے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اس وقت وہ لوگ اتنے خوفزدہ

ہو گئے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے اسی حال میں فرمایا: اگر تم ان احکام پر عمل کرنے کا عہد کر لو تو یہ خطرہ تم سے دُور ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے قبول کر لیا اور سجدے میں گر پڑے اور وہ بلا ان سے دُور ہو گئی۔

٭

یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، یہاں پر ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا سوال: کیا اس طرح کسی سے عہد لینا درست ہے؟ کیا اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں جبر کا پہلو ضرور ہے لیکن یہ بات بھی مسلّم ہے کہ جب ان سے خطرہ دور ہو گیا تو اختیار پلٹ آیا یعنی وہ باقی راستہ اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ طے کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ عقائد کے معاملے میں جبر و اکراہ لایعنی چیز ہے لیکن جو امور انسان کے فعل و عمل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں نوعِ بشر کی خیر و سعادت ہے ان میں جبر و اکراہ کرنے میں کیا حرج ہے، اگر کسی کو نشہ پینے سے جبراً روکا جائے یا اسے کسی خطرناک راستے پر چلنے سے جبراً روک دیا جائے تو کیا یہ کوئی بُری بات ہے؟

دوسرا سوال: پہاڑ ان کے سروں پر کس طرح ٹھہرا رہا؟

جواب یہ ہے کہ بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ حکمِ خدا کی وجہ سے کوہِ طور اپنی جگہ سے جدا ہو کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح سایہ فگن ہو گیا تھا۔

بعض کا کہنا ہے کہ ایک شدید زلزلے کی وجہ سے پہاڑ اس طرح ہلا اور ٹیڑھا ہو گیا کہ جو لوگ اس پہاڑ کے دامن میں تھے ان کے سروں پر پہاڑ کی چوٹی کا سایہ پڑنے لگا۔

یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ اس پہاڑ سے ایک بہت بڑا پتھر الگ ہو کر ذرا سی دیر کے لیے ان کے سروں پر ٹھہرا اور اس کے بعد وہ وہاں سے گذر گیا اور ایک طرف گر گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خارقِ عادت اور غیر معمولی بات تھی، طبیعت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

ایک دوسری بات جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے یہ نہیں کہا کہ وہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان بن گیا بلکہ یہ فرمایا کہ: گویا سائبان بن گیا (کانہٗ ظلۃ)۔

یہ تعبیر یا تو اس وجہ سے ہے کہ اگر کسی کے اوپر سائبان بنایا جاتا ہے تو وہ اس کی حفاظت کیلئے بر بنائے محبت بنایا جاتا ہے، جبکہ یہ سائبان بعنوان تہدید و خوف بنایا گیا تھا اور یا اس وجہ سے یہ

اشاریہ

تفسیر نمونہ (اُردو ترجمہ)

(جلد ششم)

ترتیب و تدوین سیّد شکیل حسین موسوی

موضوعات

اصول و عقائد

توحید

عدل

نبوت

امامت

قیامت

اقوامِ گزشتہ

شخصیات

علماء و دانش ور

کتب آسمانی

کتب سیر، تاریخ اور تفسیر

لغاتِ قرآن

بقیہ لغاتِ قرآن

صدف : مادہ "صَدَف" (بروزن حَذف) کسی چیز سے
بغیر غور و خوض کے رُوگردانی ۴۹

صفادع : ضفدع کی جمع ۔ مینڈک ۲۷۸

طوفان : مادہ "طوف" (بروزن خوف) گھومنے اور
طواف کرنے والی شے ۲۷۷

عادی : مادہ "عدی" ۔ دشمنی ۔ تجاوز ۲۶

عاکف : "عکوف" احترام کے ساتھ متوجہ ہونا ۲۸۸

عفوا : مادہ "عفو" کثرت ۔ زیادتی ۔ ترک کرنا
رُوگردانی کرنا ۔ افزائش نابودی ۲۲۸

عَرَض : بروزن فرض ۔ نقد پیسہ ۲۷۱

عَرَضْ : بروزن غرض ۔ مادی دنیا کے ہر طرح کے سرمائے ۲۷۱

عزروہُ : مادہ "تعزیر" حمایت کرنا ، مدد کرنا ، روکنا ، منع کرنا ۳۴۰

عسٰی : شاید ۲۷۰

عتوا : مادہ "عتو" (بروزن غلو) نافرمانی ۳۶۱

عمین : عمیٰ کی جمع (بروزن دلو) جس کی بصیرت ، چشم باطن
ختم ہوگئی ہو۔ ۱۹۵

غِلّ : کوئی چیز کسی چیز میں مخفی طور پر اُتر جائے ۔ حسد ، کینہ ۱۵۷

غواش : اصل میں غواشی تھا جمع غاشیہ ۔ ہر طرح کی پوشش ، خیمہ ۱۵۴

فحشاء : مادہ فاحشۃ ۔ عمل قبیح ۱۲۹، ۱۳۰

فرعون : شاہانِ مصر کا لقب ۲۴۱

فلنقصّن : مادہ قصّہ ۔ ایک دوسرے کے پیچھے قطار لگا کر
کھڑے ہونا ۔ مرتبہ تعزیرات جرائم کو قصاص کہتے ہیں ۸۷

فواحش : فاحشہ کی جمع ۔ انتہائی بُرا کام ۔ نفرت آمیز گناہ ۱۴۰، ۴۱

قائلون : مادہ "قیلولہ" دوپہر کی نیند ، استراحت ، راحت ۸۳

قریہ : مادہ "قری" (بروزن نحی) اکٹھا ہونا ۔ گاؤں شہر آبادی ۸۳

قمل : ایک نباتاتی آفت ۲۷۸

قیما : سچائی اور استقامت ، مضبوطی ، ہمیشگی اور دینی و دنیاوی کفالت ۶۳

کذب : جھٹلانا ۔ جھوٹ بولنا ۳۳

لباس التقوٰی : حیا ۔ لباس عبادت ، لباس جنگ زرہ خود ۱۲۲

لَعلّ : شاید ۴۸

متبّر : مادہ "تبار" ہلاکت ۲۹۰

مدحور : مادہ دحر (بروزن دھر) ذلت و خواری کیساتھ باہر نکالنا ۱۰۲

مذؤم : مادہ "ذعم" (بروزن طعم) عیب شدید ۱۰۲

مسلم : وہ شخص جو فرمانِ الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ ۶۵

مکرالٰہی : خوش حالی اور عیش و آرام کی زندگی سے روکنا ۲۳۶

ملاء : اپنے وجود میں ظاہری طور پر مہذب ۔ باطن میں گندہ ۱۹۲

مہاد : جمع مہد کی معنی بستر ۱۵۴

میقات : وقت ۔ وہ وقت جو کسی کام کے لیے طے شدہ ہو ۲۹۳
وقت کے علاوہ مقام کے معنی بھی ہیں جیسے میقات حج

ناقہ : ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو خدمت کے لیے آمادہ ہو ،
مطیع ہو ۔ نر کے نسبتاً مادہ اونٹنی سواری کے لیے
زیادہ موزوں ہے لہذا ناقہ کہتے ہیں۔ ۲۰۶

(بقیہ لغات کتب سیر و تاریخ کے ساتھ)

متفرق موضوعات

زمین پر انسانی خلافت

شجر ممنوعہ

شیطان کی موجودگی کے اوقات

صراط مستقیم

طبقاتی تفاوت

ظلم اور ظالم

عالمی رسالت

عمل صالح

فال نیک و بد

قرآن و توریت

گواہ

مقامات

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ساغر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم